

زبان اور قواعد

رشید حسن خاں

پیش کش: مجلس اعلیٰ تعلیم، لاہور

زبان اور قواعد

رشید حسن خاں



پنجابی زبان اور قواعد

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوٹنل امریا، جسرولہ نئی دہلی۔ 110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت : 1976

پانچویں طباعت : 2014

تعداد : 550

قیمت : 166/- روپے

سلسلہ مطبوعات : 299

Zaban Aur Qawaid

by

Rashood Hasan Khan

ISBN: 978-81-7587-377-3

ناشر: ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوٹل ایریا،

جسول، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099

شعبہ فروخت: پوسٹ بلاک-8 آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

فون نمبر: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: لاہوتی پرنٹ اینڈرز، جامع مسجد دہلی۔ 110 006

اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM، TNPL Maplitho کا نفاذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

ہندوستان میں اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اردو کے لیے کام کرنے والا یہ ملک کا سب سے بڑا ادارہ ہے جو پچھلے کئی دہائیوں سے مسلسل مختلف جہات میں اپنے خاص خاص منصوبوں کے ذریعہ سرگرم عمل ہے۔ اس ادارہ سے مختلف جدید اور مشرقی علوم پر مشتمل کتابیں خاصی تعداد میں سماجی ترقی، معاشی حصول، عصری تعلیمی اور معاشرہ کی دوسری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے شائع کی گئی ہیں جن میں اردو کے کئی ادبی شاہکار، بنیادی متن، قلمی اور مطبوعہ کتابوں کی وضاحتی فہرستی، تکنیکی اور سائنسی علوم کی کتابیں، جغرافیہ، تاریخ، سماجیات، سیاسیات، تجارت، زراعت، لسانیات، قانون، طب اور علوم کے کئی دوسرے شعبوں سے متعلق کتابیں شامل ہیں۔ کونسل کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع ہونے والی کتابوں کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ مختصر عرصہ میں بعض کتابوں کے دوسرے تیسرے ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ قومی اردو کونسل نے اپنے منصوبوں میں کتابوں کی اشاعت کو خاص اہمیت دی ہے کیونکہ کتابیں علم کا سرچشمہ رہی ہیں اور بغیر علم کے انسانی تہذیب کے ارتقا کی تاریخ مکمل نہیں تصور کی جاتی۔ جدید معاشرے میں کتابوں کی اہمیت مسلم ہے۔ کونسل کے اشاعتی منصوبہ میں اردو انسائیکلو پیڈیا، ذہنی اور اردو۔ اردو لغات بھی شامل ہیں۔

ہمارے قارئین کا خیال ہے کہ کونسل کی کتابوں کا معیار اعلیٰ پائے کا ہوتا ہے اور وہ ان کی ضرورتوں کو کامیابی کے ساتھ پورا کر رہی ہیں۔ قارئین کی سہولتوں کا مزید خیال کرتے ہوئے کتابوں کی قیمت بہت کم رکھی جاتی ہے تاکہ کتاب زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچے اور وہ اس بیش بہا علمی خزانہ سے زیادہ سے زیادہ مستفید اور مستفیض ہو سکیں۔

اہل علم سے گزارش ہے کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نام درست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ وہ غامی اگلی اشاعت میں دور کی جاسکے۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

ڈائریکٹر

فہرست

9	حرف آغاز
11	صحت الفاظ
156	مشترک الفاظ
188	لفظ اور استعمال عام
226	ملائی — بالائی
241	ترکیب مہند
271	سقوط حروف علت
286	اطلاہ نون
305	مختارات امیر مینائی
427	بحر البیان

حرف آغاز

برادرِ مکرم

جناب سید ابراہیم حسن رسا بریلوی
کے نام

حرفِ آغاز

اس مجموعے میں شامل مضامین، مختلف ادقات میں لکھے گئے تھے، اب ان پر نظر ثانی کی گئی ہے اور بعض کو از سر نو لکھا گیا ہے۔

تلفظ کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ عربی و فارسی کے بہت سے لفظوں کے تلفظ میں تغیرات رونما ہوئے ہیں، اور اکثر تبدیلیاں، یہاں کے لہجے کے تقاضوں کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ ان تبدیلیوں سے اس بات کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ دنیا کی دوسری خود مختار زبانوں کی طرح، اردو نے بھی لفظوں کو اپنے سانچے میں ڈھالا ہے؛ تلفظ کے لحاظ سے بھی اور بناوٹ کے اعتبار سے بھی۔

اس سلسلے میں یہ بات ضرور پیش نظر رہنا چاہیے کہ تلفظ کی تبدیلیاں پہلے بول چال کی نقلی سطح پر اپنے آپ کو ظاہر کیا کرتی ہیں اور یہ قدرتی عمل ہے۔ یہ تغیرات جب ایک خاص مدت تک کار فرما رہتے ہیں اور زبان کی دوسری سطح پر بھی اپنے اثرات کو ثبت کر لیا کرتے ہیں، تب وہ گفت کے لیے قابل قبول ہو پاتے ہیں۔ یعنی جو تغیرات اس درمیانی وقفے میں اپنے آپ کو محفوظ رکھتے ہیں، وہی استعمالِ عام کے دائرے میں شامل کیے جانے کے حق دار ہو کرتے ہیں، اور اسی نسبت کے ساتھ

لغت میں شامل ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ عربی و فارسی الفاظ کا تلفظ اس اسی طرح صحیح ہے جس طرح ان زبانوں کے لغات میں محفوظ ہے؛ تو یہ سمجھا جائے گا یا سمجھا جانا چاہیے کہ یہ شخص اردو کو کوئی مستقل زبان نہیں سمجھتا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تلفظ کے وہ سارے تغیرات لازماً قابل قبول ہیں جو کسی بھی شخص کی گفتگو میں نمایاں ہوئے ہیں؛ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اُس شخص کو زبان کے اعتبار اور لغت کے استناد کے مسائل سے دل چسپی نہیں۔

تلفظ کی طرح، فظوں کی بناوٹ میں بھی رنگارنگی پائی جاتی ہے۔ عربی و فارسی الفاظ کے انداز پر بہت سے نئے لفظ بن گئے ہیں اور بہت سے فظوں کو معمولی یا غیر معمولی تبدیلیوں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ یہ اردو کا قابل قدر سرمایہ ہے۔ ایسے مستقل الفاظ کو غیر معتبر سمجھنا، غیر صحت منظر ز عمل کے مرادف ہوگا۔

اسی طرح زبان اور قواعد کے اور بہت سے اہم موضوعات کی بحثیں بھی خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ان سے متعلق اکثر مباحث، مختلف کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اساتذہ کے مکاتیب میں اور فن اصلاح پر لکھی گئی کتابوں میں بھی بہت کچھ محفوظ ہے۔ اور ایسے موضوعات پر لکھے گئے رسائل بھی بہت سے اہم مباحث کا گنجینہ ہیں۔ زبان و ادب کے اچھے طالب علموں کے لیے اس ضروری ہے کہ ان کو ایسی تفصیلات کا علم ہو۔ اس علم کے بغیر بہت سے اہم مسائل کو صحیح طور پر نہیں سمجھا جاسکتا۔

اس کے علاوہ، اب اگر اردو کا کوئی بڑا لغت مرتب کیا جائے، اُس وقت ان سارے مسائل کی اہمیت کا اور زیادہ احساس ہوگا۔ اس مجموعے میں شامل مضامین، ایسے چند اہم مباحث پر روشنی ڈالتے ہیں۔ توقع کی جاتی ہے کہ ان سے بعض مسائل کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

رشید حسن خاں

صحّت الفاظ

اردو میں چھوٹی بڑی کئی کئی صحّت الفاظ کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ ان کتابوں کے مؤلفین نے عموماً ایسے لفظوں کی فہرستیں مرتب کی ہیں جو حرکات یا بناوٹ کے لحاظ سے اصل سے مختلف ہیں اور ان کے خیال کے مطابق "فَلْطُ الْعَوَام" کے ذیل میں آتے ہیں۔ مؤلفین نے عام طور پر یہ رائے ظاہر کی ہے کہ عربی و فارسی الفاظ کو، جہاں تک ہو سکے، اُسی طرح استعمال کرنا چاہیے جس طرح وہ ان زبانوں کے لفاظ میں محفوظ ہیں۔

فارسی اور عربی کے جن لفظوں میں حرکات کی تبدیلی ہوئی ہے یا ان کی صورت بدل گئی ہے یا قیاس کے واسطے سے کچھ نئی صورتیں معرض وجود میں آئی ہیں؛ تو یہ ساری تبدیلیاں، اردو کے مزاج اور ہندوستانی لہجے کے اقتضا سے، خود بہ خود عمل میں آئی ہیں۔ یہ عمل، زبان کی حقیقی صلاحیت کا مظہر ہوتا ہے اور اس کا ثبوت کہ وہ زبان زندہ ہے اور متحرک ہے جس زبان میں یہ صلاحیت باقی نہیں رہتی، وہ ترقی کے امکانات سے محروم ہو جاتی ہے، بلکہ یوں کہیے کہ وہ زبان اس طرح جامد ہو جاتی ہے کہ مرحوم زبانوں کے دائرے میں شامل کچے جانے کی حق داریں جاتی ہے۔ کسی زبان کی وسعت صلاحیت اور طاقت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ دوسری زبانوں سے وارد ہونے والے لفظوں کو وہ کس طرح اور کس حد تک اپنے سانچوں میں ڈھال سکتی ہے۔ یہ قول پڑھنا ضروری ہے

دیکھا جائے کہ ان کی پیدائش کہاں کی ہے، اور یہ پہلے کس کی رعایا تھے؟
(تقوٰی سلیمانی ص ۲۲۲)

لفظ "مشکر" کے ذیل میں لکھا ہے :

• عربی میں "مشکور" اُس کو کہتے ہیں جس کا شکر یہ ادا کیا جائے، مگر ہماری زبان میں اُس کو کہتے ہیں جو کسی کا شکر یہ ادا کرے۔ اس نے "مشکور" کی جگہ، یعنی عربی کی قابلیت جتانے والے اس کو غلط سمجھ کر صحیح لفظ "شاکر" یا "مشکر" ٹولنا چاہتے ہیں؛ مگر اُن کی یہ اصلاح شکر یہ کے ساتھ واپس کرنا چاہیے۔
(ایضاً ص ۹۸)

مولانا حالی نے وضاحت کے ساتھ لکھا ہے :

• لکھنؤ میں ایک صاحب نے ۱۸۹۰ء میں ایک رسالہ شعر و سخن کے متعلق لکھا ہے، اُس میں کچھ اور یہ پاس لفظ ایسے لکھے ہیں جن کو خود صاحب رسالہ اور اہل لکھنؤ واجب الشکر خیال کرتے ہیں..... اس رسالے میں بعض ایسے الفاظ کو واجب الشکر قرار دیا ہے جو اصل زبان کی گہری تھیں لغوی کے خلاف برتے اور بولے جاتے ہیں، جیسے: موسم بہ فوج سپہیں، یا میشت بہ فتح یا، یا نشا بروزن وفا؛ کہ عربی گہری لغت کے موافق موسم بروزن مسجد، اور میشت بہ کسرؤ یا، اور نشاۃ بروزن وحدت ہے۔

لیکن فی الحقیقت یہ ایک غلطی ہے جو اکثر ہمارے عربی دانوں کو علم لسان کی ناواقفیت سے پیش آتی ہے۔ اُن کو یہ معلوم نہیں ہے کہ ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں منتقل ہو کر، کبھی اپنی اصلی صورت پر قائم نہیں رہ سکتے، لہٰذا ما شاہد۔ ہماری اردو ہی میں ہزاروں لفظ سنسکرت، پراکرت اور بھاشا کے داخل ہیں، باوجود اس کے، شاذ و نادر ہی ایسے لفظ

سید انشا نے بہت پہلے یہ بات کہی تھی :

”جانتا چاہیے کہ جو لفظ اردو میں آیا، وہ اردو ہو گیا، خواہ وہ لفظ عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوربی، اصل کی رُو سے غلط ہو یا صحیح؛ وہ لفظ، اردو کا لفظ ہے۔ اگر اصل کے موافق مستعمل ہے تو بھی صحیح اور اگر اصل کے خلاف ہے تو بھی صحیح۔ اُس کی صحت اور غلطی، اس کے اردو میں رواج پھیلنے پر منحصر ہے۔ کیوں کہ جو چیز اردو کے خلاف ہے، وہ غلط ہے، گواہ اصل میں صحیح ہو۔ اور جو اردو کے موافق ہے، وہی صحیح ہے، خواہ اصل میں صحیح نہ بھی ہو۔“ (ترجمہ دریائے لطافت ص ۲۵۲)

بابا اردو مولوی عبدالحی صاحب نے، انشا کے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :
 ”.... یا وہ غدرہ کو برفچ وال، اردو کا صحیح لفظ خیال کرتے ہیں، اگرچہ اصل میں یہ کونہ وال ہے۔ یہ سن کر، بعض اصحاب جنہیں صحت لغات کا اکی قدر خیال رہتا ہے۔ جیسے ایک مومن متقی کو اداے ارکانِ صلات کا، اور خصوصاً ثقاتِ لکھنؤ، بہت جزبہ ہوں گے؛ لیکن جو لوگ اصولِ لسان سے واقف ہیں، وہ سید انشا کی وسعتِ نظر اور اصابتِ رائے کی داد دیں گے۔ فرق یہ ہے کہ سید انشا، اردو کو ایک جدا زبان خیال کرتے ہیں اور غیر زبان کے جن الفاظ نے منہ منہ کر لیا گھس پس کر لیا اختلافِ لہجہ یا دوسرے اسباب سے ایک خاص صورت اختیار کر لی ہے، وہ اب اردو کے لفظ ہو گئے ہیں، انہیں اصل زبان سے کچھ تعلق نہیں رہا۔ مگر جو حضرات ابھی تک ان عربی و فارسی الفاظ کو، جو اردو میں مستعمل ہیں، اصلی صورت میں لکھنا اور بولنا صحیح اور فصیح سمجھتے ہیں، اور اُس کے خلاف غلط اور غیر فصیح؛ تو گویا وہ ابھی اردو زبان کو زبانِ بی نہیں سمجھتے۔“

اسی اصول کو اگر مد نظر رکھا جائے اور ہر اردو لفظ کو اُس کی اصلی صورت میں (یعنی جس زبان سے وہ آیا ہے) لکھنا اور لکھنا شروع کریں تو اردو زبان کوئی زبان ہی نہ رہے گی، اور موجودہ تحریر و تقریر کے سادے الفاظ، بہ استثنائے چند، غلط ٹھہریں گے؛ کیوں کہ اس میں جس قدر الفاظ ہیں، وہ یا تو سنسکرت اور ہندی زبانوں کے ہیں یا عربی فارسی ترکی یا بعض یورپی السنہ کے۔ اردو زبان مستقل زبان اُنسی وقت ہوگی جب وہ ان زبانوں کے لفظ لے کر انھیں اپنا کر لے۔ اور جہاں وہ اپنے ہوئے، اُن کی شکل و صورت، وضع قطع، رنگ و رنگ میں ضرور فرق آئے گا۔ مگر ہم میں سے بعض نازک داغ، دقیق نظر حضرات کو اُن غیر ملکبوں کی یہ بے تکلفی ہرگز نہیں بھاتی، وہ انھیں اپنا بنانا نہیں چاہتے، بل کہ انھیں ڈھکیل ڈھکیل کر اپنے حدود سے باہر نکالنا چاہتے ہیں:

(مقدمہ ترجمہ دریائے لطافت، ص ۷۰)

دس بارہ سال پہلے کی بات ہے کہ ایک صاحب نے لفظ "عادی" کو غلط بتایا تھا اور اس کے استعمال کرنے والے پر نکتہ چینی کی تھی؛ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا:

"عربی میں جو لفظ فارسی سے یا سریانی سے، عبرانی سے، ہندی سے آئے ہیں؛ اُن کے تلفظ اور معنی، دونوں کے تعین کا حق اب اہل عرب کو حاصل ہو گیا ہے، یا وہ الفاظ بہ دستور انہی دوسری زبانوں کے قاعدوں کے ایسر رہے ہیں۔۔۔۔۔ انگریزی میں سیکڑوں ہزاروں لفظ لاطینی سے، یونانی سے، سنسکرت سے، عربی سے آئے ہیں؛ سب لفظوں کے تلفظ و معنی میں تعارف کا پورا حق انگریزوں کو حاصل ہو گیا ہے یا نہیں؟

یہ نظم آخر اردو مرکب تک جاری رہے گا کہ جس لفظ کو وہ چاہے جتنا
 اپنلے، لیکن اُسے بولتے ہوئے، وہ پابند دوسری زبانوں کی رہے گی،
 اور اُس کی تذکرہ و تائید میں، اُس کے اعراب میں، اُس کی جمع بنانے
 میں، اُسے حالتِ ترکیب میں لانے میں، اردو والے بے بسی سے منہ دوسرے
 ہی کا دیکھتے رہیں گے! اور کسی دوسری زبان والے کے سامنے یہ اصول
 بیان کر کے تو دیکھیے کہ لفظ آپ کا؛ لیکن اُس کا املاء اُس کا نقطہ، اُس کی گرامر
 سب دوسروں کی! (ماہنامہ تحریک (دہلی، جولائی ۱۹۹۳ء)

جس طرح اربابِ نظر ایسے الفاظ کے متعلق صحیح طرزِ عمل کی طرف توجہ دلاتے رہے
 ہیں، اُسی طرح یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ہر زمانے میں ایسے الفاظ مستعمل رہے ہیں اور
 یہ استعمال کرنے والے بھی اہلِ زبان تھے اور اُن میں سے اکثر کو استادِی کا منصب بھی
 حاصل تھا۔ یہ صورت اکثر و بیش تر الفاظ کی ہے۔ اساتذہ کے کلامِ نظم و نثر کا مطالعہ کیا جائے
 تو معلوم ہوگا کہ ایسے بیش تر لفظوں کو بے کلفنی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ بس بات
 یہ ہے کہ اس طرح کی تفصیلات یک جا نہیں ہو سکیں، اس لیے کبھی کبھی دہن جھٹکتا ہے۔

جن لفظوں کو بعض صحت پسند حضرات اور بعض اربابِ لغت نے غلط قرار دیا ہے،
 اُن کی صورت یہ ہے کہ عربی کے بہت سے لفظ تو خود فارسی میں تغیر سے دوچار ہو چکے تھے،
 اور وہیں سے صورت بدل کر یہاں آئے ہیں، اور کچھ لفظوں میں یہاں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔
 چون کہ الفاظ کا اس نقطہ نظر سے معقول جائزہ نہیں لیا گیا ہے؛ اس لیے ایسی تفصیلات
 بہت سی نگاہوں سے اوجھل ہیں اور یوں غلط فہمی کے لیے گنجائش نکل آتی ہے۔

اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، اُن میں سب سے مشہور کتاب تاحوسن الاغلام
 ہے جس کو دو فاضل حضرات: مولانا سید مختار احمد صاحب اور مولانا ذہین صاحب نے
 مرتب کیا ہے۔ یہ سلسلہ میں حیدرآباد سے شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کو بعض وجوہ سے

زیادہ شہرت ملی۔ اپنے اپنے لوگ اس کے مندرجات کو صحیح سمجھ کر اس کے حوالے دیتے رہے ہیں یا حوالے کے بغیر اس کے مندرجات کی روشنی میں فیصلے کرتے رہے ہیں۔ اس کتاب کی دو خامیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں: ایک تو یہ کہ عربی کے جن الفاظ میں فارسی میں تصرف ہو چکا ہے؛ اُن کو بھی غلط الفاظ کی فہرست میں شامل کر لیا گیا؛ حالانکہ اساتذہ اردو کا یہ سطر اصول ہے کہ جو لفظ مغربس ہو کر ہم تک پہنچا ہے، وہ بالکل صحیح ہے۔ یہ دراصل نگاہ تحقیق کا تصور ہے کہ تصرفات تک نہیں پہنچ سکی۔ اور جیسا کہ لکھا جا چکا ہے؛ ایسے بیش تر تصرفات کسی ایک جگہ مرتب صورت میں ملتے بھی نہیں۔ اسی طرح جو لفظ فارسی و عربی الفاظ، یا ان زبانوں کے قواعد کے قیاس پر بن گئے ہیں اور مستعمل ہیں؛ وہ اب بالکل صحیح ہیں، اور یہ علم لسان کے مسلمات میں سے ہے، مگر مؤلفین قاموس نے (بعض اور حضرات کی طرح) ایسے بیش تر الفاظ سے زبان و قلم کو آلودہ نہ کرنے کی ہدایت کی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عربی و فارسی کے جو لفظ اب اردو میں اختلاف حرکات کے ساتھ مستعمل ہیں؛ مؤلفین نے ایسے بیش تر الفاظ کو اصل حرکات کے موافق بولنے کی تاکید کی ہے۔ حالانکہ یہ ایسے لفظ ہیں کہ اگر ان کو اصل زبانوں کے مطابق استعمال کیا جائے تو اوجہیت کا شدید احساس ہوگا، بل کر یہ محسوس ہوگا کہ بولنے والا تانہ وار رہے۔

اس کا اظہار ضروری ہے کہ یہ عیب قاموس الفاظ یا الہی ہی اور تالیفات تک محدود نہیں، لغات میں بھی یہ غامی پائی جاتی ہے۔ اس مشکل میں مزید اضافوں ہوتا ہے کہ لغت کی کتابوں میں باہم اختلاف بھی ملتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ایک لغت نے بعض الفاظ میں اختلاف حرکت کو صحیح مان لیا، بعض میں نہیں۔ یا یہ کہ ایک لغت نو بیس نے ایک لفظ میں بول چال کے تصرف کو مان لیا، اور دوسرا فرہنگ نگار اُس سے منکر ہے، یا وہ سرے سے اُس کا ذکر ہی نہیں کرتا۔ یہ بہت پریشان کن صورت ہے یہ پریشان کن صورت حال اس کو بھی ظاہر کرتی ہے کہ ہمارے اہم لغات میں اتمامیوں کا اور انتشار و اختلاف

کا کیا عالم ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ لغات میں خامیاں کس انداز کی ہیں، مگر سب سے اہم بات یہ سامنے آتی ہے کہ اب ایک مکمل لغت کو کس انداز سے مرتب ہونا چاہیے اور اُس میں کن کن باتوں کو نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ فصاحت اور معیار کے غیر منطقی تصورات نے کس قدر انتشار پھیلایا ہے اور اب ایسے اندراجات کے متعلق ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے۔ اس ضرورت کا سبھی کو احساس ہے کہ اردو میں ایک اچھے لغت کی کمی ہے، اور اُس کی تدوین ضروری ہے؛ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ ہمارے موجودہ لغات میں کیا کیا ہیں اور کیا خامیاں ہیں۔ اس علم کے بغیر، اُن خامیوں کو دور نہیں کیا جاسکتا۔ اس مضمون کے سلسلے میں، یہ پہلو خاص طور پر پیش نظر رہا ہے اور اسی لیے نور اللغات اور فرہنگ آصفیہ کے اندراجات کو قریب قریب ہر الفاظ کے ذیل میں بطور خاص پیش نظر رکھا گیا ہے، اور اُن کے حوالے دیے گئے ہیں۔ اگر اس مضمون سے اس معلومات کے حصول میں مدد ملے گی تو میں بھروسہ اصل مقصد پورا ہو گیا۔ قاموس الاغلاط کی خامیاں گنا نا اصل مقصد نہیں؛ اصل مقصد یہ ہے کہ اُس کو موضوع بنا کر، اردو میں لغت نگاری کے احوال و انداز کا اور غلطی و صحت اور فصیح و غیر فصیح کے ٹھکانے ہوئے تصورات کا کچھ بیان کیا جائے۔

اس مضمون میں قاموس الاغلاط کے کچھ مندرجات پر گفتگو کی گئی ہے۔ یہ کوشش کی گئی ہے کہ جن غلطیوں کو مولفین قاموس الاغلاط نے غلط بتایا ہے، یا جن کی متعل حركات کو غلط لکھا ہے؛ ایسے الفاظ کے متعلق فارسی تصرّفات کو یا اساتذہ اردو کے تفسیرات کو پیش کیا جائے، تاکہ اندازہ ہو سکے کہ ایسی تاالیفات کے اکثر مندرجات، مفردات پر مبنی ہیں اور ایسی کتابوں کے مولفین نے زبان کے اصول ارتقا اور اُس کے ناگزیر تقاضوں سے کم سے کم سروکار رکھا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُن الفاظ پر بحث کرتے ہوئے اردو کے اہم لغات، خاص طور پر فرہنگ آصفیہ و نور اللغات کے متعلقہ اندراجات

کا بھی جائزہ لیا جائے، جس سے یہ معلوم ہو کہ اردو کے اہم لغات کی کیا صورت ہے۔

قاموس الاغلاط میں ایسے بہت لفظ ہیں جن پر گفتگو کی جاسکتی ہے، میں نے کچھ الفاظ پر بحث کی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ سب لفظوں پر بحث کرنا کسی ایک مضمون میں ممکن نہیں۔ دوسرے یہ کہ اصل مقصد یہ ہے کہ ایک غلط اندازِ نظر کی نشان دہی کی جائے۔ ایسی تعلقات کی عدم افادیت کو نمایاں کیا جائے اور اس بات کو واضح کیا جائے کہ ہمارے لغت کس قدر نامحرمی کے امین ہیں؛ اور اس کے لیے یہ طورِ مثال کچھ الفاظ پر بحث کرنا کافی ہے۔

اس تحریر سے اس کا بھی بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اب ایک مفصل اور مکمل لغت کو مرتب کرنے کے لیے نظم و نثر کی کتابوں کو، اساتذہ کے مکاتیب کو اور مختلف رسائل کو کھنگالنا کس قدر ضروری ہے۔ اور یہ کہ بناوٹ اور تلفظ کے سلسلے میں غلط و صحیح کے اُس غیر علمی انداز کو بدلنا لازم ہے۔ یہی اس مضمون کا مقصد ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے قاموس الاغلاط کو مثال کے طور پر موضوع بنایا گیا ہے۔ قاموس الاغلاط کے لیے عموماً لفظ ”قاموس“ استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح قرآنِ مجید اور نور اللغات کے لیے ”آصفیہ“ اور ”نور“ کے معنی استعمال کیے گئے ہیں اور جلال کے لغت ”سرائے زبانِ اردو“ کے لیے ”سرائے“ بھی لکھا گیا ہے۔ بعض مستشرقین جیسے فیلیں، بیٹس، فوربس، اسٹیکس، شکسپیر وغیرہ کے لغات کے حوالے بھی جاریہ جامعہ ضرور آگئے ہیں۔

مندرجہ ذیل الفاظ اس تحریر میں زیرِ بحث آئے ہیں :

لفظ	صفحہ	لفظ	صفحہ	لفظ	صفحہ	لفظ	صفحہ
آب و دلنے	۲۵	آزادگی	۹۱	ادانگی	۹۰	اشرنی	۲۷
آدمیت	۸۹	آزردگی	۸۶	ارنی	۱۰۰	اصطبل	۹۷

۱۳۸	زره	۱۳۹	غلبان	۱۱۷	براحت	۲۵	الجوه
۳۳	زرد	۲۲	خود رفت	۱۰۹	بریان	۹۹	اعراف
۱۳۷	زیبایش		در سنجی	۱۳۰	جمعه	۲۹	اگری
۱۱۶	سرایت	۹۲					
۱۱۶	سرشت	۱۱۹	درود	۱۲۰	مجهور	۹۹	الایچی
۱۶۶	سفل	۱۱۹	دروغ	۹۳	جواهرات	۸۵	انمازا
۱۵۲	سنفی خیز	۱۱۹	درینج	۱۰۷	جہالت	۸۸	انسانیت
۱۵۳	سوال	۱۳۶	دشمن	۳۳	جید	۸۳	انکساری
۱۲۱	سیند	۱۵۳	دن به دن	۱۲۳	چند	۳۷	ایزو
۹۳	شبه	۱۳۳	فرد معنی	۱۱۸	چنگیز	۱۰۱	بابر
۹۲	شجاعت	۱۳۳	فرد معنیین	۱۲۷	عیشی	۶۹	بادشاهت
۱۳۱	شکره	۹۹	فدانت	۱۳۵	حسین	۱۱۷	بہشت
۱۳۹	فکیلی	۶۶	راشی	۱۰۷	حقارت	۱۰۲	بے وقوف
۵۸	صفر	۶۷	رؤی	۱۰۷	حماقت	۸۰	پابوسی
۱۲۳	طرفین	۱۰۹	رعایا	۸۷	خاصیت	۱۳۸	پیدایش
۱۵۳	طمانیت	۱۲	رعونت	۹۵	خرابچ	۶۰	سایه دار تابعداری
۱۵۳	طیبت	۱۰۷	رفاقت	۹۵	خرچ	۱۰۲	جایم
۳۳	عادی	۱۰۷	رقابت	۱۰۹	خزاں	۷۷	تبدیلی
۵۰	عصمت	۷۳	رقعه	۱۱۸	خرانه	۱۰۳	ترجمه
۱۱۵	عفو	۱۰۸	رداچ	۱۳۶	خسرو	۷۵	تعیینات
۱۳۷	عماد	۱۰۹	ردا	۱۲۹	خفگی	۷۵	تعییناتی
۱۱۵	حقا	۱۳۵	رہایش	۷۹	خلاصی	۱۰۵	تتازع
							تتقیه
							توان

۹۱	ناراضگی	۱۳۲	مرغن	۸۳	تدبیری	۱۱۵	عیادت
۹۶	ناراضقی	۱۲۱	مروت	۱۳۲	قران	۱۱۴	عیال
۱۱۰	نشر	۱۳۱	مشکور	۷۳	قلند	۱۱۴	عیان
۱۳۳	نقص	۷۲	مصانہ	۷۳	قلعی	۱۲۸	ضبن
۱۲۵	نقی	۷۲	مطالعہ	۹۲	کرختگی	۱۲۹	غلطی
۱۱۰	نقاب	۵۷	معقوب	۱۱۱	کلید	۱۵۲	غمی
۱۳۳	نقص		"مُفَاعَلَتُ"	۱۱۱	کلیسا	۱۱۲	قرار
۱۲۷	نمکین		کیمونک اتفاقا	۱۳۸	گشت	۱۱۳	فرستادہ
۱۲۲	نمود	۷۰	(۵۸ نفقا)	۱۳۸	چکر بایش	۱۱۲	فرشتہ
۸۵	نموتاً	۱۳۲	مفرور	۱۳۸	چکر دود	۱۱۳	فردخت
۱۲۲	نمود	۳۹	مقصود	۱۵۱	گوارا	۱۱۲	فریب
۳۲	نیر	۱۳۲	مطلب	۱۳۹	گھاس	۱۱۳	فریفتہ
۱۳۱	ہنگ	۳۹	ملزم	۱۳۸	لینق	۱۵۲	فضا
۱۵۳	یکسانیت	۹۰	ملکیت	۹۷	مانند	۱۳۱	فوق العرک
۱۵۳	یگا گنت	۳۰	منصب	۳۷	متلاشی	۱۳۹	فہمائش
		۱۳۲	مہوس	۳۶	متونی	۱۳۲	فی زمانہ
		۳۱	میت	۸۹	موت	۸۱	قدم ہوی

"از خود رفته" - ف۔ بے خود۔ اس کی جگہ "خود رفته" کہا غلط ہے۔ "تاموس" مولف نور بھی مؤلفین تاموس کے ہم نوا ہیں؛ انہوں نے "از خود رفته" کے ذیل میں لکھا ہے: "اس جگہ خود رفته بولنا غلط ہے؛ آصفیہ میں بھی یہ صراحت کی گئی ہے کہ

سج الفاظ ”اذخوردفتہ“ اور ”اذخوردنگلی“ ہیں۔ (جلد دوم)۔ یہی اسے اثر کھنوسی (مروجہ) کی تھی؛
 انھوں نے ایک مضمون میں لکھا تھا: ”اذخوردفتہ“ اس کی جگہ ”خوردفتہ“ ہونا غلط اور قابل
 ترک ہے۔ ”دارفتہ“ کہہ سکتے ہیں۔ (رسالہ التحریر، شمارہ جنوری ۱۹۵۳ء)۔

شوق نیروی نے رسالہ اصلاح میں لکھا ہے: ”چوں کہ یہ فارسی محاورہ ہے اور فارسی
 میں ”از“ کے ساتھ متعل ہے؛ اکثر فصحاء محل بے ”از“ کے استعمال نہیں کرتے“ (ص ۱۳) اور
 اس کے حاشیے میں لکھا ہے: ”اور متروک کو اردو میں ”اذخوردفتہ“ اچھا نہیں معلوم ہوتا اور بہ وجہ
 ترک کرنے محققین کے صرف ”خوردفتہ“ کے استعمال سے احتیاط کرنا چاہیے؛ لہذا اس لفظ کی
 ترک کر کے اس کے عوض ”دارفتہ“ استعمال کیا کرتا ہے۔“

یہ خیال کہ ”خوردفتہ“ غلط ہے، قطعاً صحیح نہیں۔ نہ یہ خیال درست ہے کہ سارے
 اساتذہ اس کو متروک قرار دے چکے ہیں۔ اس کے برعکس، بہت سے اساتذہ کے یہاں
 ”خوردفتہ“ اور ”خوردنگلی“ موجود ہیں۔ درج ذیل مثالوں سے اس کے صحیح اور متعل ہونے
 کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

ہوں وہ خور دفتہ کہ جوں عمر تلف کر دہ مجھے

حشر تک ڈھونڈتے ہیں تو ممکن نہیں ہاتھ آئے نفل

ذوق (قصائد ذوق، مرتبہ مرزا شاہ سلیمان، ص ۸۰)

یا کو کمال میں بھی خور دنگلی اپنی نہ جگنی جوش دشت سے میں پابند سلاسل نہ ہوا

سوتن (دیوانی مومن، مرتبہ مولانا ضیاء احمد بدایونی، طبع دوم، ص ۲۹)

یہ ضعف ہے تو دم سے بھی کب تک چلا گیا خور دنگلی کے صدمے سے مجھ کو غش آگیا

(ایضاً ص ۳۸)

گھر میں خور دنگلی سے دھوم مچی کیوں کے ہو اس تک مرا جانا

(ایضاً ص ۳۸)

خیابانِ زلف میں خود رنگی نے قہر کیا امید تھی مجھے کیا کیا بلا کے آنے کی

(ایضاً ص ۲۹)

فناں ہے دھچ پر دازِ حواس لے رشتگانِ غول میں بنا ہوں قمریِ خود رفتہ اک شمشادِ وقامت کا

رشتگانِ لکھنوی (مجموعہ دواوین ص ۵۸)

جو کامِ عشق میں ترے خود رفتہ کر گئے وہ مست سے ہوا، نہ وہ ہشیار سے ہوا

(ایضاً ص ۶۸)

خود رنگی ہے خیمِ حقیقت جو دا ہوئی دروازہ کھل گیا تو میں گھر سے نکل گیا

مبا لکھنوی (چتر آئندہ ص ۱۵)

کوچہ گردی سے کیا بچانوں نے آگاہ رفتہ رفتہ ہوا خود رفتہ مرا غیرتِ ماہ

امانت لکھنوی (داسوخت بندہ ص ۳)

خیالِ یار کا، خود رنگی نتیجہ ہے جو یار آگئی اس کی، تو خود کو بھول چلے

زند لکھنوی (نگیناتِ دلین دوم ص ۱۱)

ہوئے خود رفتہ ایسے سو سے زیادہ دہری دن میں بھلا دی میری یاد

قالب مرزا شوق لکھنوی (دشوی نہرِ عشق، مرتبہ جنوں گورکھ پوری ص ۳۳)

ہاے وہ خود رنگی، اچھے ہوئے سب سر کے بال

وہ کسی میں اب کہاں، جو تیرے دیوانے میں تھا

شاعرِ عظیم آبادی دے خانہ اہام ص ۴۸

غمِ خود رنگی نے جب ستایا اسی کوچے میں خزلِ ہوش آیا

امیر اللہ قیوم (رسائلِ صلاح)

مدت ہوئی ہے یار کا دیکھے ہوئے جاں لیکن گئی نہیں مری خود رنگی ہنوز

نعمتِ دہلوی (گلزارِ خود ص ۱۹)

مولانا نظم طباطبائی نے ایک استفسار کے جواب میں لکھا تھا: ”صحیح لفظ ”خود رفتگی“ ہے، لیکن اساتذہ اگر ”خود رفتگی“ کو نظم کر چکے ہیں تو ان کی سند کافی ہو جائے گی۔“ دکتوب بہ نام صفحہ مرزا پوری، مرتبہ ادب، جلد دوم، ص ۳۰۲۔ مندرجہ بالا اسناد ثبوت کے لیے کافی ہیں۔
 یہی صورت لفظ ”سرگزشت“ کی ہے جو اصلاً ”از سرگزشت“ ہے لیکن ”سرگزشت“ مستقل عام و خاص ہے، اور اس پر کوئی شخص اعتراض نہیں کرتا۔ پنڈت قاتر کی گئی نے اپنے انداز میں لکھا ہے: ”کہا جاتا ہے کہ اردو میں ”خود رفتہ“ نہیں، بل کہ ”از خود رفتہ“ استعمال کرنا لازم ہے۔ جواب دیا گیا کہ ”سرگزشت“ کی ”سرگزشت تو ذرا بیان فرمائیے؟“
 (منقولات ص ۲۶)

اتمام سخن کے طور پر، دو شائیں اس زمانے کے دو شاعروں کے یہاں سے بھی پیش کی جاتی ہیں، ان سے معلوم ہو گا کہ آج کل بھی یہ لفظ بہ دستور مستعمل ہے:
 خود رفتہ و خود بین و خود افروز و خود آزاری ژولیدہ گماں، زود غضب، ویریشیاں
 جوش طبع آبادی و نظم جوانی دہری“ جوش نیر ماہ نامہ انکار گلابی ص ۱۱
 مگر برق و آتش کے سایہ میں لے ل یہ صدیوں کے خود رفتہ ناشاد طائر
 جذبی و سخن مختصر ص ۶

انجوبہ کے ذیل میں لکھا گیا ہے: ”عوام مجرب“ کہتے ہیں، جو غلط محض ہے۔ ”انجوبہ“ مولفین کا یہ خیال صحیح نہیں کہ ”مجرب“ عوام کا گڑھا ہوا ہے۔ یہ لفظ (ہر مذکر الف) مفرق ہو کر ہم تک پہنچا ہے:

”مجرب“ چیزیکہ مردم ماہر و شگفت انداز و دایں معنی آ ”مجرب“ است۔ حسن تیرہ
 اسے شیخ شہر باک تو اس میں ”مجرب“ گفت: ”ہے پر وہ گشت خیر نہاں از دوا ی تو کہ بار خیر
 یہ غلطی اصل میں مولف علیٹ الفات کی پھیلائی ہوئی ہے، انھوں نے لکھا ہے:

”اعجوبہ: بہ خیم ہمزہ، یہ سنی عجیب و غریب مروجہ اور تعجب انگیز و نہ بغیر ہمزہ و انحراف لفظ“
 عربی کا اصل لفظ ”أَعْجَبْتُ“ تھا، فارسی میں یہ تصرف ہوا کہ بہ حذف الف ”عجوبہ“ بھی
 استعمال کیا گیا۔ اردو میں بھی، فارسی کی طرح، اس لفظ کی دونوں صورتیں مستعمل ہیں۔ موقوف
 نور نے اس سلسلے میں یہ غلطی کی ہے کہ ”عجوبہ“ کو عربی لکھا ہے، حالانکہ یہ ہمزہ صورت
 ہے۔ عبدالواسع ہنسوی نے رسالہ عبدالواسع میں ”اعجوبہ“ کو ”عجوبہ“ کا مزید فیہ لکھا ہے۔ اُن کی
 رائے میں عربی کے اصل لفظ ”عجوبہ“ میں فارسی واووں نے الف کا اضافہ کیا ہے۔ حالانکہ
 صورت، حال برعکس ہے کہ عربی کا اصل لفظ ”اعجوبہ“ ہے اور اس کو بہ حذف الف استعمال
 کیا گیا ہے۔

سلیمان حسیم نے اپنے فارسی انگریزی لغت میں ”عجوبہ“ (بہ حذف الف) کو بہ فتح
 اول اور بہ خیم اول، دونوں طرح لکھا ہے۔ یہی صورت اردو میں ہے کہ یہ لفظ سننے میں
 دونوں طرح آتا ہے۔ ”عجوبہ“ کی طرح ”اعجوبہ“ بھی اردو میں بہ خیم اول اور بہ فتح اول،
 دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ آصفیہ میں الف پر زبر لگا ہوا ہے، ”اعجوبہ“ اور نور میں
 اس کو بہ خیم اول ”اعجوبہ“ لکھا گیا ہے، اور اس لحاظ سے اب اس لفظ کے بھی دونوں
 تلفظ قابلِ تسلیم ہیں۔ یہ ہمیشہ تر فارسی ترکیب کے ساتھ آتا ہے، جیسے: ”اعجوبہ روزگار“
 ”اعجوبہ عالم“۔

ہوں جو بے چین اُس اعجوبہ عالم کے لیے

حالِ من و من کے مرا، لوگ عجب کرتے ہیں

تیسرے کلیات مرثیہ آتھی، ص ۳۲۲

”آشنائی اور آشنا پرستی میں اعجوبہ روزگار تھے“

محمد حسین آزاد (دردِ اکبری، ج ۱، صفحہ ۱۵۷)

مفرد بھی استعمال ہوتا ہے، لیکن نسبتاً کم۔ مثلاً،

کیسا اجمو بہ نیا پہنچا ہے یاں چو پچ ہو، تو ہوشتر مرغ کلاں

میر دکیات، مرتبہ آتسی ہاں (۳۲۱)

”میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس اجمو جے کا ردِ عمل کہاں کہاں کس طرح ہوتا تھا۔“

رشید احمد صدیقی (نقدِ غالب، ص ۳۱۳)

اصل معنی کے لحاظ سے اجمو بہ ”پنچ اول اور بہ ضمیمہ اول دونوں طرح سے آتا ہے،

ابتداءً پنچ اول (اجمو بہ) کا چلن زیادہ ہے، لیکن ایک خاص بودے کے لیے، جس کے پتے

دوا کے طور پر استعمال میں آتے ہیں، یہ بھرت بہ پنچ اول بولا جاتا ہے (جمو جے کو پتا، اس

معنی میں یہ اردو شرا د ہے۔ فارسی یا عربی میں یہ معنی نہیں۔

مفرد اسمِ لفظ کے لیے اگرچہ اصولاً کسی سند کی ضرورت نہیں، مگر محض یہ طور احتیاط، ایک

سند پیش کی جاتی ہے۔ اس کی ضرورت اس لیے بھی سمجھی گئی ہے کہ نور یا آصفیہ میں اس کی سند

موجود نہیں۔ اش کا شعر ہے (کلامِ اش، ص ۲۲۲) :

ایچہ نیچے کے ترے نقشے پہ بوے ہیں یہی گر سنے کوئی جمو بہ یہ جن حق سانپ کی

فردس، رچہ دوسن اور شکسپیر نے جمو بہ کو عربی لکھا ہے۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، یہ

مفرد صورت ہے۔ عربی کا اصل لفظ ”اجمو بہ“ ہے۔ فردس نے اس کو بہ ضمیمہ اول لکھ کر مزید

لکھا ہے کہ پنچ اول حایانہ تلفظ ہے مگر اب اس سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔

آشرفی، پنچ شین کہنا غلط ہے۔ (ناموس)

فردس میں یہ تو نہیں لکھا ہے کہ پنچ شین غلط ہے، مگر اُس میں صرف پنچ اول و سکون

دوم و پنچ سوم لکھا ہوا ہے؛ مطلب اس سے بھی یہی نکلتا ہے۔ آصفیہ میں بھی اس کے مطابق

”آشرفی“ لکھا ہوا ہے۔ اور امیر اللغات میں حرکات کی صراحت نہیں۔ اس میں شک نہیں

کہ فارسی میں شش ”ساکن ہے اور ”ر“ مفتوح ہے، مگر اردو میں یہ لفظ بہ پنچ شین بھی استعمال

کیا گیا ہے، یعنی، اشعری۔ یہ اردو کا تصرف ہے۔ بول چال میں تو اب یہ لفظ عام طور پر فصحی
 قہین ہی آتا ہے، نظم میں دونوں طرح استعمال کیا گیا ہے۔

دوں پر غرض کو قیمت شراب کی ہاتھ آئے اشعری جو گل آداب کی
 آئبر

مانی ہوں نہیں بھی سو کر ڈھمب کی دھورو رو پے اشعری نذیری شائستگی

کلام انشا : ۱۸۱

اس لفظ کے دونوں تلفظ صحیح مانے جائیں گے، البتہ اردو کی خشوں میں جہاں بھی یہ لفظ آئے گا
 ہر طور واحد آئے یا ہر طور جمع، ہر فتح شین بولا جائے گا، جیسے، گھر میں کوڑی نہیں نام اشعری لال۔
 یا ایک اور مثل ہے، اشعریاں گئیں، کوٹلوں پر مہر۔

”اشعری ہوئی“ (وہ بوٹیاں جو ذریعت اور کم خواب پر ہوتی ہیں) میں بھی شش
 مفتوح رہے گا، ورد لفظ ہی بگڑ جائے گا۔ ”گل اشعری“ دونوں طرح مستقل ہے، اور
 ”اشعری کا پھول“ عموماً پہنچ شین بولا جاتا ہے۔ اردو شعرا نے ”گل اشعری“ اور ”اشعری
 کا پھول“ دونوں ترکیبات میں، فارسی تلفظ کی رعایت سے اس کو ہسکوئی شین نظم کیا ہے،
 مثلاً :

ہوا سے اشعری کے پھول بزم پر گرے جس دم عروس باغ نے اڑھا دوہا کا سدائی کا
 امانت لکھنوی (دیوان امانت ص ۳۶)

تو سے کی زرو زرو پھلیاں ہیں یا گل اشعری کی کلیاں ہیں

انشا (کلام انشا ص ۳۶)

لیکن بول چال میں اس تلفظ نے بار نہیں پایا۔ بول چال میں پہنچ قہین ہی آتا ہے۔ قہین
 نے صحیح طریقہ اختیار کیا ہے، اُس نے ”اشعری“ کو ہسکوئی شین اور پہنچ شین دونوں طرح لکھا
 ہے۔ اردو ایک مثل، ”گھر میں کوڑی نہیں نام اشعری لال“ لکھ کر اس کے شش کو مفتوح لکھا

ہے ؛ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ امثال میں محض مفتوح رہے گا۔

اشرفی کی جمع اشرفیاں ، بول پال میں عام طور پر فیضِ شین متصل ہے۔ نظم میں اس کو دونوں طرح لایا گیا ہے مثلاً

کب مجھے رکتے غل مغلس ہمتِ مشاہدِ جنوں
دولت ان داغوں کی ، اشرفیاں ، روپے ہو جائے گی

(رنگ) (دیباچہ نفس الکافیہ ، ص ۱۳)

چوری کا ڈر نہیں ہے ، دیے شوق سے لگا ڈیمروں روپے اشرفیاں رکتی ہیں جا بہ جا
جانِ صاحب (سندس ہنسیتِ شین بے نظیر ص ۱۰)
لیکن چکوں شین کو بول پال سے مطلق علاقہ نہیں ، یہ نظم تک محدود ہے۔

اسٹیکاس نے اشرفی " (بہ الفِ ممدودہ و رائے ساکن) بھی لکھا ہے چمک نہیں۔
الفِ ممدودہ نہ فارسی میں ہے نہ اردو میں۔

"اگری ۱۔ بعض شعرا نے اگری" کہا ہے۔ رند :

اگری کا ہے گناں ، شک ہے ملاگیری کا رنگ لایا ہے دوپٹا ترا میلا ہو کر
در اصل "اگر" سے "اگری" صحیح ہے۔ "اگر" "اگرہ" سے منسوب ہوتا تو "اگری" ہوتا ۔ (قاموس)

مورقین قاموس کے علاوہ اور لوگوں نے بھی رند کے اس شعر کو "اگری" کی سند میں پیش کیا ہے ، مثلاً مورقین آصفیہ نے لکھا ہے :

"بعض مال کے صاحبان گشتو اس لفظ پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ "اگری"
اجنبی کے وزن پر غلط ہے..... مگر ہمیں اس اعتراض سے اتفاق نہیں ہے ؛
کیونکہ اول تو شعرا نے اس کو برابر اجنبی کے وزن پر باندھا ہے ، چنانچہ

زند لکھنوی ہی کا شعر موجود ہے ۔ اگرئی کا ہے گماں، شک ہے
 وجاہت بھجوانوی نے بھی اسی شعر کو "اگرئی" کی سند میں لکھا ہے (اختلاف
 اللسان ص ۴)۔ جناب آثر لکھنوی نے لکھا ہے :

"یہ فرمانا کہ دہلی کا لفظ "اگرئی" لکھنویں "اگری" بولا جاتا ہے ؛ پاسا پیری
 ہے ۔ زند لکھنوی کا مشہور شعر ہے :

اگرئی کا ہے گماں شک سے باگری کا رنگ لایا ہے دوپٹا ترا میلا ہو کر
 (چھان بین ص ۲۰۵)

"اگرئی" کی سند میں عام طور پر زند کے اسی ایک شعر کو پیش کیا گیا ہے ، مگر حتی طور پر یہ ثابت
 نہیں کیا جاسکتا کہ اس شعر میں "اگرئی" قلم ہوا ہے ، بل کہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس شعر میں
 دراصل "اگری" ہے ، جس کو "اگرئی" فرض کر لیا گیا ہے ، اور اس بنا پر اس شعر سے
 فائدہ استناد حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

زند کی یہ غزل بحر زل میں ہے ۔ اس میں پہلا رکن سالم (فاعلاتن) بھی آسکتا
 ہے ، اور مخبون (فَعْلَاتن) بھی ۔ یعنی مصرعِ اول کا پہلا رکن "فَعْلَاتن" بھی ہو سکتا ہے ،
 اور اس صورت میں "اگری" پڑھا جائے گا ۔ اور ایسا کوئی ثبوت یا قرینہ موجود نہیں
 جس سے یہ ثابت کیا جاسکے کہ اس مصرعے کا پہلا رکن "اگرئی" بروزن "فاعلاتن" ہے ۔
 ہاں اس کا قرینہ موجود ہے کہ اس رکن کو "اگری" بروزن "فَعْلَاتن" پڑھنا چاہیے ،
 اور وہ قرینہ یہ ہے کہ زند کے کلام میں "اگرئی" کہیں نہیں آیا ہے ، البتہ "اگری" آیا
 ہے ۔ دوسرے یہ کہ اس شعر کے علاوہ کسی اور مستند شاعر کے یہاں سے "اگرئی" کی کوئی
 اور مثال نہیں پیش کی جاسکی ہے ، بل کہ زند کے اسی ایک شعر پر سند کی بنیاد رکھی
 گئی ہے ۔ تیسرے یہ کہ جلال نے سوائے زبانِ اردو میں ، امیرِ ہینائی نے امیرِ اللغات
 میں ، اور مولف نور اللغات نے زند کے اسی شعر کو "اگری" کی سند میں پیش کیا ہے

اور اس کا واضح طور پر مطلب یہ ہے کہ ان حضرات کی نظر اس عروضی نکتے پر تھی۔ یہ قرائن اس تعین کے لیے کافی ہیں کہ رند کے اس شعر میں ”اگری“ ہی نظم ہوا ہے۔ اور یہ کہ جن لوگوں نے اس شعر میں ”اگری“ کو ”اگری“ پڑھا ہے، انہوں نے غلطی کی ہے۔ اس مصرعے کی قطعاً اس طرح ہوگی :

اگری کا	ہگما شک	، ملاگ	ری کا
فعلان	فعلان	فعلان	فعلان

رند کے دیوان میں ایک جگہ یہ لفظ اس طرح آیا ہے کہ اُس کو قطعیت کے ساتھ ”اگری“ کے ثبوت میں پیش کیا جاسکتا ہے :

رو بہ رو دل تری تصویر دھری بہنے لے آپ میں اس کو اگر بے خبری رہنے دے

زعفرانی کوئی جوڑا پہن آیا ہے بسنت دست بچے میں لباس اگری رہنے دے

اب جب تک کوئی مثال اس کے خلاف پیش کی جاسکے، اُس وقت تک یہ نہیں کہا جاسکتا کہ رند نے اُس شعر میں ”اگری“ نظم کیا ہے، بل کہ لازمی طور پر یہ ماننا پڑے گا کہ اُس شعر میں ”اگری“ نظم ہوا ہے۔ اس میں اس کا اور اضافہ کر لیا جائے کہ کئی مستند لغت نویسوں نے ”اگری“ کو غلط بتایا ہے۔ جلال نے سوائے زبان اردو میں لکھا ہے :

”جو لوگ ”اگری“ برو دین سفری کو ”اگری“ برو دین اجنبی بولتے ہیں غلط

بولتے ہیں۔ کس واسطے کہ لفظ ”اگر“ ہے ”اگرہ“ نہیں۔ پھر جزہ قبل تحتانی

کے کس حرف کے عوض میں آگیا جو ”اگری“ سرسئی اور نقرئی کے قیاس پر بولا

جاتا ہے ؟ (سوائے زبان اردو)

امیر غنیائی نے ”اگر“ کے ذیل میں لکھا ہے :

”بعض لوگ اس کو غلطی سے ”اگری“ سمجھیں گے وزن پر بولتے ہیں ۔“

(امیر اللغات)

صاحب نور اللغات نے لکھا ہے :

”یہ لفظ ”اگرئی“ بروزِ بھنبی نہیں ہے ، بروزِ بھنبی بولنا غلط ہے کہ اس واسطے
کو لفظ ”اگر“ پہنچے اول و دوم تھا ، اُس میں یاے نسبت اضافہ کی تو ”اگرئی“ ہوا
سرئی اور نقرئی پر اس کا قیاس صحیح نہیں ہے ۔“

فیلن اور پٹیش کے لغات میں ”اگرئی“ موجود ہے ، اور خیال یہ ہے کہ صاحب فرنگیہ مصفی
نے فیلن کی تقلید میں ”اگرئی“ کو درج لغت کیا ہے اور اس کو صحیح بتایا ہے اور سندیں دند
کے زیر بحث شعر کو لکھا ہے ۔

حاصل بحث یہ نکلا کہ دند کے زیر بحث شعر کو ”اگرئی“ کی سندیں پیش نہیں کیا جاسکتا ،
اور اس شعر کے علاوہ اس لفظ کی کوئی اور سند پیش نہیں کی جاسکتی ۔ نیز سارے قرائی اس کی
دلائل کرتے ہیں کہ دند کے شعر میں ”اگرئی“ بڑھا جائے ۔

اس بحث سے قطع نظر کر کے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اب اس جیسے لفظ ”اگرئی“ کو
بھی صحیح مان لینا چاہیے ۔ ایک لفظ کا اضافہ نہیں ۔ غلاب قیاس یا غلاب قاعدہ بنے ہوئے
بہت سے لفظ اردو میں مستعمل ہیں ، اس لفظ کا شمار بھی اُس فہرست میں کیا جائے گا ۔
اگر لکھنوی مرحوم نے اسے نظم بھی کیا ہے ،

کسے دے ترنج کس پہ کوئی ، کبھی ہے آنکھوں میں جامہ زیبی
کسی کا ملبوس ہے شہانی ، کسی کی پوشاک اگرئی ہے

(عروضِ غزلت (مجموعہ منظومات اثر) ص ۹۳)

جوش ملیح آبادی نے بھی اس کو نظم کیا ہے ،

گردوں (دھڑلانی تو) مست نقرئی
اک گوشہ کشی ہے تو اک گوشہ بستئی
یہ پارہ سرودی ہے تو وہ پارہ سُرمئی
مغرب جو اگرئی ہے تو مشرق ہے چمپئی
(ملوچ فکر)

کے مطابق بے تکلف استعمال کیا جائے گا۔

میر حسن نے مثنوی بحر البیان میں ایک جگہ ”اگری“ کو ہسکونی گانف نظم کیا ہے ،
وہ پشواز اگری ، وہ فرگس کا بار وہ کم خواب کے بند ، روی ازار

(بحر البیان ، شائع کردہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ ص ۹۱)

امیر مینائی نے اس شعر کو امیر اللغات میں لکھ کر ، اس کے متعلق لکھا ہے : ”اب یہ زبان نہیں ہے ۔ لیکن گفتگو میں یہ لفظ ہسکونی گانف بھی آئے گا ، اور فصیح گانف بھی ؛ مناسب یہ ہوگا کہ ہسکونی گانف کو بھی صحیح مان لیا جائے ۔ یہ فیصلہ ملل استعمال کے لحاظ سے کیا جائے گا کہ کہاں پر اس لفظ کی کون سی صوت اچھی معلوم ہوتی ہے ۔

لفظ ”اگر“ کے ہندی یا فارسی ہونے کے متعلق لغت نویسوں میں اختلاف ہے ۔ فرنگیج جہانگیری و بہائی قاطع میں اس کو فارسی لکھا گیا ہے ۔ لیکن ”اگری“ کے متعلق ان لغات میں کوئی مراحمت نہیں ملتی ۔ البتہ رحج نے نفس اللغات میں ”اگری“ کو فارسی لکھا ہے ۔ اگر لفظ ”اگر“ فارسی ہے تو پھر ”اگری“ بہ لحاظ قاعدہ بھی درست ہوگا ۔ غالباً اسی لیے اردو میں اساتذہ نے اس لفظ (اگری) کو بہ اضافت فارسی بھی نظم کیا ہے ،

کیوں کر ذمے داغوں سے بولائے اگر کی میں سوختہ ہوں اس کے لباس اگری کا

مستغنی (انتخاب صحفی مرتبہ حضرت مولانی ص ۲۱)

زعفرانی کوئی جوڑا پہن آیا ہے بسنت دست بچے میں لباس اگری پہنے ہے

رند (کلیات رند ص ۹۲)

ہاں ، امیر مینائی نے امیر اللغات میں ”اگردان“ کے ذیل میں لکھا ہے : ”ضمناً ”اگر سوز“ زیادہ بولتے ہیں ۔ یہی جملہ نور اللغات میں بھی نقل کیا گیا ہے ۔ یہ احتیاط کہ ”اگردان“ کی جگہ ”اگر سوز“ بولنا انسب ہے ، اگر اس خیال سے کی گئی کہ لفظ ”اگر“ فارسی نہیں ؛ تو درست نہیں ۔ اردو کے لحاظ سے ”اگردان“ زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے ۔

کیونکہ اس وزن کے کئی مرکبات اردو میں مستعمل ہیں۔ لیکن یہ احتیاط اگر معنوی مناسبت کی بنا پر کی گئی، یعنی ”اگردان“ کے مقابلے میں ”اگر سوز“ میں استعمال کے لحاظ سے زیادہ مناسبت پائی جاتی ہے؛ تب ٹھیک ہے، مگر جیسا کہ لکھا گیا ہے، اردو میں اس طرح کے مرکبات میں عموماً ”وان“ کا لاحقہ پایا جاتا ہے اور اس اعتبار سے ”اگردان“ انسب قرار پائے گا۔ صفت اور وضاحت کے لحاظ سے دونوں لفظ معیاری ہیں۔

آب و دانے کی فکر، ”آب و دانہ کی ترکیب فارسی ہے.... عطفی ترکیب میں حرفِ عواجل کی وجہ جہاں اے عطفی، یاے حتمانی سے بدل جاتی ہے، وہاں واو عطف کو حذف کرنا مناسب ہے، ورنہ تہنید کی صورت میں فارسی ترکیب غلط ہو جاتی ہے“ (قاموس) میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے، شاید عظیم آبادی کی ایک کتاب سے ایک اقتباس پیش کرنے پر اکتفا کروں گا جس میں اس خاص ترکیب کا بھی ذکر آگیا ہے،

”کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی ہندی یا اور کسی زبان کا لفظ، کسی فارسی یا عربی کے لفظ سے بطور قواعد فارسی ہم بغل ہو تو غلط ہے۔ جب کہ ضمماً برابر استعمال کرتے آئے ہیں اور کرتے رہے ہیں، تو سبب اس خاص فارسی ترکیب کے غلط ہونے کا کیا ہے؟ تو ہرگز اس کے کوئی جواب نہیں ہے کہ ہماری تجویز۔ ملاحظہ ہو، چوک دار، بی دار، سمجھ دار، سوئے بردار، جھنڈی بردار، وغیرہ صفاتی اسماء کیوں زبان سے سطرود کیے جاتے ہیں؟.... اسی طرح گاڑی بان، پان دان، سنگار دان وغیرہ غیر محدود مستعمل الفاظ ہیں جن کو غلط بتایا جاتا ہے۔ معلوم نہیں ”کوچ بان“ کو بھی نکال دیا گیا ہے یا انگریزی لفظ (کوچ) کے سبب سے ابھی تک براجمان ہے۔ ایک صاحب بڑے شد و مد سے تحریر فرماتے ہیں کہ لفظ ”ٹھانی گیر“

بہی غلط ہے، کیوں کہ "اشٹانی" ہندی ہے اور "گیرا" فارسی ہے۔ کہیں بھی
اس تنگ خیالی کا جواب ہے !

ایک دوسرے صاحب ڈانٹ بتاتے ہیں کہ "آب دوانے" کا لفظ نہ
بازر؛ کیوں کہ بچہ میں داؤ عاقلہ فارسی ہے۔ اور لفظ "دان" ہے ذکر "دانے"
— اگر ایسے زبان زد مقبول فصحاء کی فہرست دی جائے، تو میرا قیاس
یوں ہے کہ غالباً ہزاروں اچھے فاضل لفظوں کی گردن پر چھری چل جائے گی
جن کے قائم مقام الفاظ ڈھونڈے نہیں ملتے، مثلاً، کچھڑی فروش، دودھ دان،
چمن دان، مکھن دان، عرق کیوڑا، شربت کیوڑا، پاجی پرست
(تکریم ص ۶۳)

مؤلفین قانوس نے "آب دوانے" کے غلط استعمال کی مثال میں میراجیس کی یہ
یہ رُباعی لکھی ہے :

اب گرم خبر موت کے آنے کی ہے ناداں ! تجھے فکر آب دوانے کی ہے
ہستی کے لیے ضرور اک دن ہے فنا آنا تیرا، وسیل جانے کی ہے
حالانکہ اس رُباعی کو، اس مرکب کے مستعمل فصحاء ہونے کی سند کے طور پر پیش کرنا چاہیے تھا۔
"آب دوانے کی فکر"، "آب دوانے کو" وغیرہ کی مثالیں مستندین کے یہاں بہ کثرت
پائی جاتی ہیں۔ میں صرف قور و آصفیہ سے چند اشعار نقل کیے دیتا ہوں :

کہاں ہم، کہاں تم، ہوا یہ جو ساتھ یہ تمہی بات سب آب دوانے کے ساتھ

میر حسن

ذرا تو اپنے اسیروں کی لے خبر صیاد قفس میں کیسے ترستے ہیں آب دوانے کو

جبرأت

دکھا بابائے قفس مجھ کو آب دوانے نے دگر دام کہاں، میں کہاں، کہاں صیاد

اگر مولفین قاموس کی تجویز کے مطابق ایسے مرکبات میں واو عطف حذف کر دیا جائے، یعنی ”آب ودانے“ کو ”آب دانے“ لکھا جائے تو یہ صورت مرتباً استعمالِ فصحا کے خلاف ہوگی، یہی نہیں، اس مرکب کی صورت بھی ایسی بگڑ جائے گی کہ پہچاننا مشکل ہوگا۔ ”آب ودانے“ بالکل صحیح اور فصیح مرکب ہے اور فصحا اس کو شروع سے آج تک سلسلہ و متواتر استعمال کرتے رہے ہیں۔ قواعد کے پھر میں اگر ایک اچھے بھلے مرکب کی صورت بگاڑنا، کچھ معقول بات نہیں۔ اور پھر کچھ ایک ہی مرکب تو انہیں ”ایسے بہت سے مرکبات ہیں، جیسے مقدمے بازی میں“ لب و لہجے میں وغیرہ وغیرہ۔ مولانا احسن مارہروی نے اس بات کو وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔ سن ۱۹۰۵ء کے رسالہ ”فصیح الملک“ میں مولانا نے اسلئے متعلق کچھ لکھا تھا؛ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے ایک مضمون میں مولانا کی ان اصلاحات اور تجاویز کو بیان کیا ہے۔ اس طرح کے مرکبات سے متعلق مولانا احسن کی تجویز یہ تھی،

”جس لفظ کے آخر میں ء آئے تو فاعلیت، مفعولیت اور اضافت کی حالت میں اُسے تے سے لکھا جائے جیسے، کسی زمانے میں۔ اسی طرح حالتِ ترکیب میں اضافت و عطف میں بھی عربی فارسی الفاظ اُسی طرح لکھے جائیں جس طرح بولے جاتے ہیں، مثلاً، لب و لہجے میں، مقدمے بازی میں وغیرہ۔“ (علی نقوش ص ۱۲۳)

ایزد : لفظ ایزد کو قاموس میں پسر سوم ”ایزد“ لکھا گیا ہے اور اُس کے ذیل میں مزید لکھا گیا ہے کہ، ”قبول ہے کہ انجمن آراءے نامری میں ”میریزد“ کے وزن پر لکھ دیا ہے؟“ (قاموس)۔

اگر مولف فرہنگ انجمن آراءے نامری نے ”ایزد“ کو پسر سوم ہی لکھا ہے تو غلط نہیں لکھا۔ فارسی میں یہ پسر سوم بھی آیا ہے۔ فرہنگ انجمن آراءے نامری کا مولف

خود بھی اہل زبان ہے، ہمارے لیے تو اُس کا لکھنا بھی کافی ہوتا۔ شوق نیروی نے اِزاحۃ
الفاظ میں لکھا ہے،

”از اہل زبان تحقیق پرست کہ ایں لفظ در پارس پہنچ ثالث و کسیر آں
بر ہر دو طور است۔ نظامی فرماید،

زہر کہ ایزد پرست، ایزد پرستد چو خود را قبلہ سازد، خود پرستد۔

(میں اس وقت یہ نہیں کہہ سکتا کہ نظامی کا شعر کہاں سے ماخوذ ہے) مرزا غالب ایسے معاملات
میں سختی کے ساتھ اہل زبان کی تقلید کے قائل تھے، انھوں نے بھی پہنچ ثالث لکھ لیا ہے،

در احمد الف، نام ایزد بود (زمیم آحکا را محمد بود

اُکلیاتِ غالب، (دکنور پریس، طبع دوم ص ۱۵۱)

محمد علی جبریزی نے فرہنگِ ذہب میں اس کو دونوں طرح لکھا ہے، ایزد (چو زیرک
یا بیدل) نام نامی خدای تعالیٰ۔۔۔ اردو میں یہ لفظ صرف پہنچ سوم بولا جاتا ہے۔
پکسر سوم کو فارسی سے مخصوص سمجھنا چاہیے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ امیر اللغات و
نور اللغات میں اس کو صرف پکسر سوم لکھا گیا ہے۔ آخر لکھنؤی مرحوم نے ایک مضمون میں
لکھا تھا، ”ایزو، فارسی میں پکسر سوم ہے۔ اردو میں پہنچ سوم ہوتے ہیں“ (رسالہ الملاحہ جلد ۱ ص ۱۹۵۲)

عربی کے ایسے متعدد لفظ ہیں جن کا دوسرا یا تیسرا حرف کمزور ہے، لیکن اردو میں یہ
لفظ ذہر کے ساتھ مستقل ہیں۔ اُن میں سے اکثر لفظ فارسی میں بھی ذہر کے ساتھ استعمال کیے
گئے ہیں، اور اس طرح ایسے لفظ مفہوم ہو کر اردو تک پہنچے ہیں اور اپنی طرح کے دوسرے
لفظوں میں اس تصرف کی گنجائش کی گواہی دیتے ہیں۔ اور اردو میں حرکت کی یہ تبدیلی ہوتی
ہے۔ اس پہنچ کہ یہاں کے لپے کے لحاظ سے یہ تبدیلی ضروری تھی اور قدرتی تھی۔ ایسے چند
الفاظ کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے،

(۱) مقصد، عربی میں یہ کسبہ صَاد ہے (المجد)۔ فارسی میں اس کو پرستش صَادِ نَظْم کیا گیا ہے۔

صفا از عقده و لہاست آن زلف مقدرا
بسکن بستر لای پہلوی گرمش سرد ناگشتہ

بحالانہ کر بیستہ با مطلق مقید را
کند طے بر براق معرفت اقصای مقصد را

(فکیری)

آصفیہ میں اس کو مرثیہ کہہ کر ماد لکھا گیا ہے۔ مولف نے پنتچ ماد کو غلط بتایا ہے، اردو میں پنتچ ماد ہند غلط مستقل ہے۔ اس کے مقابلے میں صاحب تور اللغات نے صحیح طریقہ اختیار کیا ہے انہوں نے لکھا ہے، "یہ لفظ عربی میں کہہ کر ماد ہے، یہ معنی جائے مقصد۔ اردو میں بالفتح و پنتچ سوم زبانوں پر ہے۔ سند میں آئیر و حسن کا ایک ایک شعر بھی لکھا ہے۔ اردو کے اساتذہ نے اس لفظ کو پنتچ ماد عام طور پر نظم کیا ہے۔ جیسا حسن کا کوروی کے معروف نعتیہ تصدیق میں، جس کے توانی مسند، زبرد وغیرہ میں، یہ لفظ کئی جگہ آیا

ملاؤ جن و انساں مریجہ تدویاں کہیے
ہدف ہو ہو گیا زور یکاں و اربوت سے
ہے اگھوری الفقر لغزی، کی ملائی اُس نے
کہیں ہے قبلہ حاجت کا کہیں ہے کعبہ مقصد کا
مقام تاب تو سین اکثر ادنیٰ حیر مقصد کا
لڑا ہے جامِ حے منان مقصد اُس کے مقصد کا
(کلیدِ فتح حسن کا کوئی)

اس زمین میں آئبریناں کا بھی ایک نعتیہ قصیدہ ہے، اس میں بھی یہ لفظ کئی جگہ آیا ہے :

سوا حجت کے کیا ہے فکرِ کتبہ حقیقت میں
یہ وہ گھر ہے کہ جس میں بند ہے دروازہ مقصد کا
حباب آسا ہیں آنکھیں بند تیری، دردِ ظاہر ہے
کہ ہر موجد ہے اس دریا میں، چادہ راہ مقصد کا

کہیں ایتوب کے شانی، کہیں یعقوب کے مای
 بھراؤ رعایت سے زدامن کس کے مقصد کا
 (حماد غلام البنین)

یہ عربی اوسط رنگ کا مطلع ہے :

آرزو مند ہوں بخیر و مقصد مل جائے کہ چتا منزل مقصود کا شاید مل جائے

(مجموعہ دواوین رنگ ص ۳۲۵)

اردو میں اب یہ لفظ صرف پرستج ماد مستعمل ہے۔ کسرِ ماد کو عربی سے مخصوص سمجھنا

چاہیے۔

(۲) منصب : یہ لفظ بھی عربی میں کسرِ ماد ہے۔ فارسی میں اس کو پرستج ماد

استعمال کیا گیا ہے۔ صاحب بہار گیسم نے لفظ غلط کے ذیل میں لکھا ہے :

”از افضل المتأخرین شیخ عبدالعزیز فطرت بروایت شیخ رسیدہ کہ غلط بر

وگوڑا است : غلط عام و غلط عوام۔ اول : چنان کہ لفظ منصب کہ

بکھری آید و بفتح شہرت دارد۔ و شعرا باب و تب و غضب قافیہ

کر وہ اند۔

مقصود کی طرح یہ لفظ بھی اردو بول چال میں صرف پرستج ماد آتا ہے۔ اس طرح

نظم بھی کیا گیا ہے :

سافر صاف ہے حُت علی شرب ہے مردِ مومن ہوں میں، اثنا عشری مذہب ہے

تو امیرائے بُتِ سرکش، تو رہ عاجز ہے فقیر حسن جاگیر تری، عشق مرا منصب ہے

آتش اگلیات آتش، طبعِ دوم ص ۱۹۹

آصفیہ میں ”منصب“ کے ماد پر زیر لگا ہوا ہے اور توہین میں لکھا گیا ہے کہ غلط عام

پرستج ماد ہوا۔ قیمت ہے کہ مولف نے اس کو ”غلط عوام“ نہیں لکھا۔ نور میں

ذرا مختلف صورت ہے، مولف نے لکھا ہے،

”منصب۔ ع۔ بالفتح وفتح سوم۔ مصدر یہی ہے، پتہ سوم پسنی مرتبہ
ورفت۔ باب مَرْبَ یَفْرِبُ سے مصدر یہی ہے پتہ صین کلمہ بھی آتا ہے۔

فارسیوں نے لب، تب کے قافیے میں استعمال کیا ہے۔۔۔۔“

معلوم نہیں مولف نے عربی کے کس لغت میں ”منصب“ کو پتہ سوم دیکھا۔ عربی میں یہ
صرف کسبر سوم ہے (المنہد)۔ پتہ سوم فارسی والوں کا تقرر ہے، اور اردو میں یہ
صرف پتہ سوم مستعمل ہے۔

(۲) میت : یہ لفظ بھی عربی میں کسبر یا سے مشدود ہے۔ فارسی لغات میں اس
لفظ میں کسی طرح کے تقرر کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ مولانا نظم طباطبائی نے سید، جید،
میت کو پتہ سوم یا لٹنے سے منع کیا ہے اور عربی کے مطابق کسبر یا بولنے کی تاکید کی ہے،
”اس قسم کے الفاظ کا صحیح طور سے استعمال کرنا لازم ہے“ (معانی سخن ص ۲۶) تیر کے
یہاں یہ لفظ پتہ سوم آیا ہے،

بے دل ہوئے، بے دیں ہوئے، بے دق رہم ات گت ہوئے
بے کس ہوئے، بے بس ہوئے، بے گل ہوئے، بے گت ہوئے
ہم مشق میں کیا کیا ہوئے، اب آخر آخر ہو چکے
بے مت ہوئے، بے ست ہوئے، بے خود ہوئے ہیت ہوئے

(کلیات تیر ص ۵۱۶)

مرتب کلیات مولانا عبدالباری آس نے اس پر یہ حاشیہ لکھا ہے،
”میت، کسبر دوم مسیم ہے، اور اس کا قافیہ ”ات گت“ کے ساتھ
اب ذکرنا چاہیے۔ تیر کے زمانے میں اس طرح قافیہ کرنا جائز سمجھتے
ہوں گے“

داغ بھی اس لفظ کو پرستج یا سہ شدہ غلط سمجھتے تھے۔ انھوں نے احسن اور ہری کو ایک خط میں لکھا تھا،

”ایک اشتہار اس گل دستے میں آپ چھاپ دیجیے، اکثر استاد کے شاگرد بہاے خود استادین کر، اپنی غزلیں بے اصلاحی چھپوا دیتے ہیں، اُس میں غلطیاں رہ جاتی ہیں.... کسی صاحبِ لفظ ”میت“ جو کہسریاے عثمانی ہے، اُس کو پرستج یا باندھا“ (افشاے داغ ص ۱۳۳)

مولفِ نور اللغات نے ”بالفتح و تشدید یا سہ کسور“ لکھ کر لکھا ہے،
”اردو میں زبانوں پر پرستج یا سہ شدہ ہے، لیکن نصابِ حال اس طرح کے استعمال سے احتیاط کرتے اور کہسریاے شدہ استعمال کرتے ہیں۔
یہی بات مولفِ رسالہ اصلاح نے لکھی ہے:

”میت، پرستج یا سہ شدہ استعمالِ صحیح ہے، نظمِ اردو میں کئی جگہ قربت و رفہ کے قافیوں میں آگیا ہے۔ چون کہ قاعدے کی رو سے کسور ہونا چاہیے،
نصابِ حال احتیاط رکھتے ہیں“ (ص ۱۷)

نصابِ مرحوم نے کچھ ہی کہا ہو، گفتگو میں یہ لفظ پرستج یا سہ شدہ آتا ہے اور اب یہی صحیح، بل کہ فصیح ہے۔ مولفِ آصفیہ نے دوسرے لوگوں کے برخلاف صحیح طریقہ اختیار کیا ہے۔ انھوں نے اصل حرکات لکھ کر مزید لکھا ہے، ”اردو والے پرستج یا بولتے ہیں اور یہی فصیح ہے۔“ مولانا حالی کے یہاں سے پرستج یا ک مثال بھی پیش کی جاتی ہے،

ہو اس طرح انھوں میں اُس کے رعیت کہ قبضے میں خستال کے جیسے میت
(سندس مالی تاج کہن لاہور ص ۱۱۵)

(۳) تیر، عربی میں کہسریاے شدہ ہے (النہد) فارسی میں اس کو پرستج ورم

بھی استعمال کیا گیا ہے۔ صرف غالب کے یہاں سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں :

داد کو، تا ستم بر اندازد طسرح پڑچرخ دیگر اندازد

نگہر خشمگینش از تیزی نور از روی نیر اندازد

(کلیات غالب، نول کشور پریس، طبع دہم، ص ۲۴۶)

باز بہ اطراف باخ آتش گل ہر گرفت مرغ برسم مفاں زعفران از گرفت

نامر بنارو بہ خویش کز اثر فیض مدح نقط زبس روشنی تابش نیز گرفت

(۰ ۰ ۰ ص ۲۶۸)

چہ گوہرم کہ محیط از صفای گوہر من بہای لغز نیار و گد شستن از سر من

صد آفتاب تو اں ساخن بہا ز بہہ ز ذرہ ایکہ بود در ہوا ی نیز من

(۰ ۰ ۰ ص ۲۴۲)

جم حشم شاہزادہ فتح الملک مرحبا طالع مظفر تو

آفتاب تو شیر مرکب سمت آسماخ و جہبہ نیز تو

(۰ ۰ ۰ ص ۲۳)

آصفیہ میں اس لفظ کو عربی لغات کی تقلید میں، صرف کسریاے مشدد لکھا گیا

ہے، "خیر"۔ تو میں اصل حرکات کے ساتھ ساتھ اس کی بھی مراحت کی گئی ہے کہ

اردو میں پہنچے دوم مستعمل ہے، اور یہی صحیح بات ہے۔ اردو میں اس لفظ کا فصیح تلفظ

پہنچے دوم (خیر) مانا جائے گا۔ اسی طرح استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ اور "خیر" کو عربی

سے مخصوص سمجھا جائے گا۔۔

(۵) سید، جید، طیب، عربی میں یہ تینوں لفظ کسریاے مشدد ہیں۔ اردو

میں یہ تینوں لفظ بھی پہنچے یاے مشدد استعمال کیے جاتے ہیں، یعنی، سید، جید، طیب۔

اور اب اردو میں یہ اسی طرح فصیح مانے جائیں گے۔ مولفین قاموس لورڈولانا نظم بلابلانی

نے ان لفظوں کو کسر یا بولنے کی تاکید کی ہے، لیکن اس حکم کو ماننا نہیں جاسکتا۔ ان بزرگوں میں سے کسی نے یہ نہیں بتایا کہ ”سید“ کی تانیث ”سیندانی“ صحیح ہے یا یہ بھی غلط ہے، اور اس کو بھی ”سیندانی“ کہنا چاہیے!

تو میں ان تینوں لفظوں کو صرف کسر یا بولنے سے مشدّد لکھا گیا ہے۔ یہ نری عربی کی تقلید ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ موثق نے استعمال عام پر لغت کو ترجیح دی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی مراحت کر دی جائے کہ ”طیب“ کی جمع ”طیبات“ کسر یا بولنے سے مشدّد رہے گی۔ اسی طرح ”جید“ کے ایک مرکب ”جید الکبوس“ میں بھی اصل حرکت باقی رہے گی، مگر مفرد الفاظ کو پہنچے یا بولنے سے مشدّد کرنا ناجائز ہے۔

مندرجہ بالا الفاظ سے اس کا بغوی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ لسانی رجحان ہے کہ اس قبیل کے الفاظ اردو میں پہنچے حرف ثانی یا پہنچے حرف ثالث استعمال میں آئیں۔ لسانی رجحان کو لغت کے اندراجات یا قواعد صرف و نحو سے روکا نہیں جاسکتا، دیکھو کہ اس کو دبا جاسکتا ہے۔ لسانی رجحان کو لغت اور قواعد سب پر افضلیت حاصل ہوتی ہے۔ مختلف لفظوں میں اردو کے تلفظ نے اپنے انداز کو نمایاں کیا ہے۔ مثلاً ایک لفظ ہے ”مروت“ لغات میں اس کو ہزیم اول و دوم لکھا گیا ہے۔ موثق غیاث اللغات نے تو غامض طور پر مراحت کی ہے کہ اس لفظ کو پہنچے ثانی استعمال کرنا صحیح نہیں، ”مروت، ہنستین و تشدید واد و مفتوحہ...“ و ہزیم اول و پہنچے ثانی خطاست۔ آصفیہ و نور میں بھی اصل کی رعایت سے اس کو صرف ہزیم اول و ثانی لکھا گیا ہے۔ بول چال میں یہ لفظ پہنچے حرف ثانی آتا ہے اور اردو کے لحاظ سے یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

زمرہ: اس لفظ پہنچے اول و ثانی و ثالث ہے، یعنی، زمرہ (المند)

فارسی میں اس کو ہزیم اول و ہزیم دوم کے قافیہ میں بھی لایا گیا ہے، لیکن فارسی میں

حرفِ اولِ دثانی مضموم ہی رہا ہے۔ اردو میں مزید تصرف یہ ہوا ہے کہ پہلا اور تیسرا حرف دونوں مفتوح رہیں۔ بول چال میں یہ اسی طرح آتا ہے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود ہے، مگر حرکات کی مراحات نہیں کی گئی ہے، البتہ نور میں یہ ضرور لکھا گیا ہے کہ، "اردو میں بفتح اول و ضم دوم و شد یہ سوم مفتوح مستقل ہے۔" اور یہی صحیح ہے، غمن کا کوروی اور امیر مینائی کے معروف نعتیہ قصائد میں یہ لفظ کن جگہ آیا ہے،

مٹا نا لوجِ دل نئے نقشِ ناموسِ اب و جد کا
دبستانِ مہبت میں سبق تھا مجھ کو اجداد کا
کہاں ہے آتشِ یا قوتِ لب میں رہ بھرکِ باقی
کہ خطِ سبز نے چھینا دیا آپ زمرہ کا
عجب کیا ہے کہ خوابِ ناز میں سوتی ہے ناگن
نہ کھولے آنکھ، اگر چھینا نہ دیں آپ زمرہ کا
عیان ہے کہکشاں، یا نقشِ مرآپِ منقش ہے
فلک ہے، یا کلس رکھا ہے چھوٹا سا زمرہ کا

غمن کا کوروی (کلیاتِ غنیمت غمن کا کوروی)

تفکرِ امتیازِ جان و جاناں میں کیا حد کا
عروضِ اب تک نہ آیا ہاتھ اس بیتِ مُعقَّد کا
نہ کہ تاجِ حکیمِ سر پہ تیرے حق میں سم ہوگا
فرانی ہے اسی میں، ہے جو آدیزہ زمرہ کا
دہی تو چسرخِ اخضر ہے، جو روزِ خلقتِ آدم
گرا تھا تاجِ نورانی سے آدیزہ زمرہ کا

امیر مینائی (معاذِ خاتم النبیین ص ۶۵)

ایک اور لفظ ہے ، مُلْزَم۔ اس کے متعلق مولفین تاسوس نے لکھا ہے :
 "مُلْزَم ، الزام لگایا گیا ، قصور وار۔ بجائے مُلْزَم ، مُلْزِم کہنا غلط
 ہے ، کیوں کہ ملْزِم ، الزام کا اسم فاعل ہے ، جس کے معنی ہیں ، کسی کے
 ذمے کوئی کام کر دینے والا۔ لازم و واجب کر دینے والا۔ الزام لگانے
 والا۔"

مقصود یہ ہے کہ عربی کے لفاظ سے صحیح لفظ "مُلْزَم" ہے نہ کہ زبر کے ساتھ اور اردو
 میں بھی اسی طرح استعمال کرنا چاہیے۔ اردو میں عربی کے ایسے نہ معلوم کتنے لفظ ہیں
 جن کی حرکات بدل گئی ہیں۔ عربی میں یہ اسم فاعل تھے یا اسم مفعول ، اب ہیں اس
 سے مطلق بحث نہیں۔ اردو میں یہ مفرد الفاظ کی حیثیت سے دیکھے جاتے ہیں۔ اس
 لحاظ سے ان کی وہی حرکات صحیح ہیں جو عام زبانوں پر ہیں۔ کوئی صاحب لغت کے احترام
 کی خاطر یا اپنی واقفیت کے اعلان کے لیے کسی محفل میں "مُلْزَم" (برنج سوم) بولیں
 تو یہ سمجھا جائے گا کہ موصوف تازہ وارد ہیں۔ اردو میں یہ لفظ صرف یکسر سوم صحیح
 ہے اور برنج سوم ناقابل قبول ہے۔

اردو لغات میں سے توڑ میں اس کو یکسر سوم لکھا گیا ہے اور آصفیہ میں زبر پر زبر
 لگا ہوا ہے۔ توڑ میں یہ صراحت نہیں کی گئی ہے کہ یکسر سوم اردو کا تعریف ہے اور اس
 سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ عربی میں بھی یہ لفظ اس معنی میں یکسر سوم ہے۔ یہ صراحت
 ضروری تھی کہ زکا زبر ، اردو کا تعریف ہے۔ اس کے برخلاف ، آصفیہ میں سرے سے
 تعریف کا ذکر ہی نہیں۔ مولف نے دخول لغات کی پیروی کی ہے اور اردو بول چال کو
 نظر انداز کر دیا ہے۔

اسی قماش کا ایک لفظ ہے ، تَزَن۔ یہ بھی اردو میں اصل کے خلاف استعمال
 میں دوام ہے۔ عربی لیرہ "تَزَن" بروزن منسخری اسم فاعل ہو گا نہ کہ تَزَن

ہوتے، وفات دینے والا، مارنے والا۔ اور مرنا ہوا کے مفہوم میں اسم مفعول ”متوفی“ آئے گا۔ اردو میں ”لجزم“ کی طرح اس کو بھی ”متوفی“ کہتے ہیں اور وفات پایا ہوا کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ مولفین قاموس نے اس سے بھی زبانِ دِلم کو آلودہ نہ کرنے کی ہدایت فرمائی ہے،

”متوفی“ کی جگہ ”متوفی“ کہنا سنتِ فطری ہے کیوں کہ ”متوفی“ کے معنی ہیں

وفات دینے والا، مارنے والا۔ قَالَ اللَّهُ، مُتَوَفًّى وَآلَعَبْدٌ مُتَوَفًّى (قاموس)

ہم بھی جب عربی لکھیں گے یا بولیں گے تو مولفین کے اس قول کا پوری طرح احترام کریں گے، لیکن اردو بولنے اور لکھنے میں، اردو میں چلن کا لحاظ کریں گے۔ جس طرح اردو والے ”مرتش“ کے معنوں میں ”راشی“ اور ”معتاد“ کے معنی میں ”عادی“ استعمال کرتے ہیں اور ان لفظوں کو بالکل صحیح سمجھتے ہیں؛ اُس طرح ”متوفی“ کی جگہ ”متوفی“ کہتے ہیں اور اس کو بھی صحیح سمجھتے ہیں۔ ہاں، یہ لکھ دیا جائے کہ آصفیہ اور نور دونوں میں اس لفظ کو عربی کے مطابق ”متوفی“ لکھا گیا ہے۔ دونوں لغات کے مولفین نے اردو کے تصرف سے سروکار نہیں رکھا۔

متلاشی : اردو میں یہ لفظ بطور اسمِ فاعل تلاش کرنے والا کے معنی میں مستعمل ہے۔ اصل کے لحاظ سے یا یوں کہیے کہ لغت کے لحاظ سے یہ بھی غلط ہے۔ مولفین قاموس نے اس کے متعلق لکھا ہے،

”تلاش“ ترکی لفظ ہے، جو فارسی و اردو میں مستعمل ہے، اس سے الہِ اُردو

نے بطورِ عربی ”متلاشی“ (پہ معنی تلاش کنندہ) اسمِ فاعل بنالیا ہے، جو

غلطِ معنی ہے۔“

صاحبِ آصفیہ کی بھی یہی رائے ہے، ”یہ لفظ، ترکی ”تلاش“ سے، اُن لوگوں نے جن کو

عرب و ترک کی تمیز نہیں، بنایا ہے جو محض غلط ہے۔ مولانا عبدالباری آسی نے بھی ایک جگہ یہی رائے ظاہر کی ہے: ”اور جو تلاش کے معنی پر حلاشی استعمال کرتے ہیں، وہ غلط ہے۔“
(حاشیہ کلیات میر ص ۱۸۱)

فارسی میں ”مُتَلَّاش“ پریشان و خراب و معدوم کے معنی میں استعمال ہوا ہے (غیاث اللغات) سلیمان مجیم نے اپنے لغت میں یہ مثال یہ فقرہ لکھا ہے: ”جسد در چند روز متلاشی شد“ اردو میں بھی یہ اس معنی میں استعمال کیا گیا ہے، مثلاً:
ہوا میں بھیجے دُھواں دم میں ہوئے ہے ناہنجز

ہوں اس طرح متلاشی سپہر کے اجسام قائم چاند پوری
(دیوان قائم عکس غلط آندیا آفس لاہور بریلی لندن ص ۱۳۰)
لیکن اب اس معنی میں استعمال نہیں کیا جاتا۔ فارسی میں ”مُتَلَّاش“ تلاش کرنے والے کے معنی میں نہیں آیا ہے۔ وہاں اس معنی میں تلاش ہے (سہارنم) مگر اردو میں حلاشی تلاش کرنے والے کے معنی میں بالعموم استعمال کیا گیا ہے، اور اب بھی استعمال کیا جاتا ہے، اور یہ معنی اردو کا اضافہ ہیں۔ چند مثالیں بھی پیش کی جاتی ہیں،

نے فکر ہے دنیا کی زندگیوں کا متلاشی

اسی سنی موہوم میں کس کام کہوں ہیں

سودا (کلیات نول کشور پریس ص ۱۱۰)

دل سے وہ آشنا ہیں کھانے کے

متلاشی ہیں آب و دانے کے

نفاں (دیوان نفاں مرتبہ سراج الدین عبدالرحمان ص ۱۰۱)

کوہ دُراگستان زین پُر اکرتا ہے

متلاشی ترا وہ آب رواں ہے کہ جو تھا

آتش (کلیات نول کشور پریس ص ۱۱۰)

محب کرنیال رہتا ہے اک درخشاں حرکا

ظلمت میں دل مرا متلاشی ہے نور کا

آتش (کلیات نول کشور پریس ص ۵)

تلاشی ترے نالاک کے مہارے ہیں جو ثابت تھے وہ اب چرخ پر تارے ہیں

(رند دیوان دوم، نول کشور پریس، ص ۲۴)

”تلاشی“ کو تو کسی طرح غلط نہیں کہا جاسکتا۔ یہ لفظ بھی اردو والوں کا گڑھا ہوا نہیں۔

فارسی میں یہ لفظ موجود تھا، معدوم کے معنی میں؛ اردو میں اس کو اس معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے (اگرچہ اب متروک ہے)، اور ایک نئے معنی کا اضافہ کر لیا گیا ہے، اس معنی میں یہ مہتہ ہے اور بالکل صحیح ہے۔

”تلاش“ کو ترکی زبان کا لفظ بتایا گیا ہے اسی ترکی لفظ سے ”تلاشی“ بنا لیا گیا، اسم فاعل کے معنی میں اور یہ فارسی میں مستعمل ہے (بہارِ نجم)۔ اردو میں یہ لفظ فارسی کے مطابق بہ طور اسم فاعل (تلاش کرنے والا کے معنی میں) بھی استعمال کیا گیا اور تلاشی کی طرح اس میں بھی ایک نئے معنی کا اضافہ کر لیا گیا، یعنی اس کو حاصل مصدر کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا۔ دونوں کی مثالیں درج کی جاتی ہیں:

ساکن دیر در دم دونوں تلاشی ہیں ترے تو خدا جانے کہاں ہے کیونکے تجھ کو بایں

میر (کلیات مرتبہ آئسی ص ۲۵۱)

جلوت میں یوں ہے وہ کہ تلاشی ہے چشم شوق خلوت میں اس طرح ہے کہ خلوت گزیں نہیں

داغ (مہتاب داغ، ص ۱۳۰)

اعمال بدو نیک سے جا خالی ہاتھ سامان اگر ہوا، تلاشی ہوگی

جنگ کھنڈی (مجموعہ خط و کتابت ص ۳۹۳)

مے کشو! حضرت زاہد کی تلاشی لینا کہ چھپائے ہوئے وہ جام لے جاتے ہیں

داغ (مہتاب داغ، ص ۱۱۷)

نکلے تلاشی سے فقط اک در دم داغ یاروں کو مرے دل پہ ہزاروں کا عہرم تھا

داغ (مہتاب داغ ص ۵۷)

آتش نے "مضمون تلاشیاں" بھی نظم کیا ہے :
 ذہن پر شعر ہے، نہ وہ مضمون تلاشیاں آتش سے تو نہیں کہیں خواہ لڑے مجھے
 (کلیات ص ۴۰۰)

اس طرح "تلاشی" اور "تلاشی" دونوں لفظ مستعمل فقہار ہیں اور ہیں اور بالکل صحیح ہیں۔ شوقِ نیوی نے لکھا ہے :

"تلاشی" بمعنی تلاش کنندہ، مرقن بمعنی روغن دار، یا اس قسم کے دوسرے الفاظ، جن کا مادہ عمل نہیں مگر ان کا اشتقاق بطورِ عملی ہوا ہے اور عام طور پر بولے جاتے ہیں، ان کا استعمال میرے نزدیک کچھ مضائقہ نہیں۔"
 (رسالہ اصلاح ص ۳۰)

سادگی : "تلاشی" کی طرح اس لفظ کو بھی شک کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے :
 "عادی، عمل میں نہیں آیا ہے۔ بعض نصاب میں خوگر کے معنی میں پایا گیا ہے۔
 ادنیٰ یہ ہے کہ اس کی جگہ "مقتاد" کہا جائے۔" (قاموس)
 کلبِ حسین خاں ناؤر (تلمیذِ ناتج) نے لکھا ہے :

"لفظ عادی کا، بمعنی خوگر، زباں زورِ عام ہے مگر لغت میں معنی اُس کے دشمن و بیداد کنندہ کے آئے ہیں۔ اور جس چیز کی عادت ہو جائے، اُس کو بھی کہتے ہیں۔ یہ جو عادت کنندہ اور خوگر کے عمل پر بولتے ہیں غلط ہے۔" (تلمیذِ معلیٰ ص ۱۲۲)

کچھ لوگ اس کو مبتدیانہ ہیں اور خوگر کے معنی میں اس کے استعمال کو غلط نہیں سمجھتے۔ مولفینِ آصفیہ و نور اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ شوقِ نیوی نے وضاحت کے ساتھ لکھا ہے :

”حادی، عادت گیرندہ کے معنی میں استعمال کی جاتی ہے۔۔۔۔۔ مگر چونکہ لغت اس کے کچھ اور معنی ہیں، اس وجہ سے خواص امتیاز رکھتے ہیں۔ (اصلاح ص ۱۴)۔
پھر اس پر یہ حاشیہ لکھا:

”مگر میرے نزدیک اردو میں جہاں ترکیب فارسی نہ ہو، حادی پر معنی عادت گیرندہ، کچھ مناسقت نہیں۔ کیوں کہ سیکڑوں الفاظ عربیہ و فارسیہ کے معنوں میں اہل زبان ہند نے تصرف کیا ہے تو اس میں بھی تصرف روا رکھا جائے تو کیا نقصان ہے۔“

غرض جن لوگوں نے اس لفظ کے استعمال کو غلط نہیں کہا، وہ بھی اس پر شفق ہیں کہ ہند ہونے کے سبب اس لفظ کو ترکیب فارسی استعمال کیا جائے۔ خوشی قدرائی نے ایک خط میں لکھا ہے،

”اس قسم کے بہت سے الفاظ ہیں جو اردو میں دوسرے معنی پر بولے جاتے ہیں مگر فارسی ہونے کا دھوکا دیتے ہیں۔ مثلاً حادی، یہ عام (بان پر عادت رکھنے والے کے معنی میں ہے، لیکن اس معنی میں ہندی ہے۔) (مشرق ادب ص ۱۸)

”حادی“ عربی کا لفظ ہے۔ عربی میں اس کے وہ معنی ہیں جن کی نشان دہی صاحب نے عربی نے کی ہے۔ فارسی میں یہ لفظ ”وہ شے جس کی عادت ہو“ کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے، ”ہر چیز کو عادت خود“ (غیاث اللغات) اور اب بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً،

”اینگود اختلاف وزن نزد شمرای عراق امری حادی بود، و خطا شمر وہ نمیشد۔“ (تحقیق اشتقاقی در عروض پارسی ص ۳۱)

”و بعضی زعافات غیر حادی در آنہا یافتہ و شاعران ملی را بنظر منسوب داشتہ۔“

(ایضاً ص ۳۱)

عام طور پر یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ حادی پر معنی خوگر، فارسی میں استعمال نہیں کیا گیا ہے

لیکن اس کی ایک مثال میرے سامنے موجود ہے۔ محمد علی جمال زاہد نے تنکا بنی کی کتاب قصص العلماء کا انتخاب قصۂ قصۂ ہائے نام سے مرتب کیا تھا، اس میں ایک جگہ یہ لفظ اسی معنی میں ملتا ہے،

”تینکا بنی نویسد کہ شیخ لسانی عادی، بخود ہی کندر بود، لذا قوۃ ملاحظہ برتر
ای بود کہ سرگرداہی زباں بود“ (قصۂ قصۂ ہا، ص ۲۸)۔

اس کے علاوہ سلیمان حسیم نے بھی اپنے لغت میں اس لفظ کو یہ معنی نوکر لکھا ہے۔

اب بھی بعض ضرورت سے زیادہ محتاط حضرات اس لفظ کو خوگر کے معنی میں غیر معتبر سمجھتے ہیں اور ان کا خیال یہ ہے کہ نصحائے اردو نے اس لفظ کو اس معنی میں استعمال نہیں کیا ہے۔ اس غلط فہمی کے ازالے کے لیے ذیل میں ”نصحائے اردو“ کے یہاں سے کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ ان مثالوں سے معلوم ہو گا کہ اس لفظ کو زیر بحث معنی میں اسانہ نے بے تحکف استعمال کیا ہے:

ہمیں بار بار زلف کے کاٹنے سے کیا ہوسے کہ ہم ایک عمر سے عادی ہیں غالب کی انہوں کے

انہام لاشنناں یقین (دیوان یقین ص ۵۳)

کیوں کہ عادی ہیں ترے دھڑ میں سب اہل دول کہ جسے دیکھیں فلاکت سے گرفتار عن

(انتقا، کلام انشا، ص ۳۳۰)

عشقی افغی نے کیا ہے زہر سے عادی مجھے

آتش (کلیات نول کشور پریس ص ۲۶۶)

ہاتھ پھیلائے کا بندہ نہیں عادی ملتی

زند (دیوان نول کشور پریس ص ۲۰۱)

ہم جو عادی ہو گئے دشنام کے

داغ (انتخاب داغ، ص ۱۵۳)

مخلع کا، شہد ہے سواے زلفِ یار میں

تیرا جی چاہے تو پلوادے کوئی جامِ شراب

اب اتر آئے ہیں وہ تعریف پر

شکرِ نعمت ذکر میں آپ کے مہاں کیوں کر دی وہی چیز کہ جس چیز کا جو عادی ہے
 قناتِ عظیم آبادی (مخاضِ الہام ص ۳۲۱)

عادی ہیں مہر و شکر کی، اس گھر کی پیکیاں نکدہ دروہو ہزار، پر کرتی نہیں فغاں
 (مرآئی شاد، اول ص ۵۱)

ذکرِ ابرو کی زباں عادی ہوتی بات سیدی بھی جو کی، میڑھی ہوتی
 خواجہ دذیر (دفترِ فصاحت ص ۲۳۹)

مہاڑی شق بھی اک شے ہے، لیکن ہم اس نعمت کے منکر ہیں نہ عادی
 حسرتِ ہوائی اکلیات طبعی لاہور ص ۷۷

”یہ اس کی عادی ہوتی ہیں کہ لوگ جھوٹی خوشامد کریں۔“ مرزا رسوا (امروا جان ادا، نیا اعداد لاہور ص ۳۵)
 فارسی میں لفظ ”عادی“ جس طرح ”وہ شے جس کی عادت ہو“ کے معنی میں استعمال

کیا گیا ہے، اُسی طرح اردو میں بھی کہیں کہیں اس کی مثال لی جاتی ہے جیسے،

”ریبا پر پورے ذوق سے بن اڈو، (نی آرزو پر رضا۔ آپ کی عادی ہم گیری“

بیان کی پاکیزگی لفظ لفظ سے عیاں ہے۔“ حبیب الرحمن خاں شروانی۔

(انقوش، مکاتیبِ خیر، ص ۲۸۳)

یا معمولی اور مقصد کے مفہوم میں، جیسے،

”میں چٹے چٹے کی عادی رخصت پر روانہ ہوں گا۔“ (ایضاً ص ۲۶۷)

سگر ایسی مثالوں کو اب از قلم شواذ سمجھنا چاہیے۔ ہاں ”عادی چور“ اور ”عادی بھرم“
 جیسے مرکبات ضرور مستعمل ہیں۔

”عادی“ کی جگہ ”معتاد“ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ از روئے قاعدہ یہ لفظ اس معنی

شاید بالکل صحیح ہے، جیسے،

”شاعری ہماری دو معجزوں پر موقوف ہے۔ اگر ان میں مناسبت معمولی

ہوتے اور بعض وہ مصنفین جو دائم الوقت ہیں، شعریں پائی گئیں، تو گویا ہم نے شاعری کا حق ادا کر دیا۔ جس طرح ہمارے مضمون منوعی ہیں، اُسی طرح ہماری طبیعت بھی اس کی معتاد ہو گئی ہے۔

مرزا رسوا (مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلات ص ۴)

یہ استعمال بہ لحاظ قواعد اور بہ لحاظ لغت بالکل صحیح ہونے کے باوجود قبول عام کا درجہ حاصل نہیں کر سکا اور "معتاد" کی جگہ، خوگر کے معنی میں "عادی" ہی نے قبول عام پایا۔ دوا کی مقررہ خوراک، مقررہ رقم، وظیفہ وغیرہ کے لیے (اور کہیں عادت کے مفہوم میں) بھی "معتاد" کا لفظ استعمال میں آتا رہا ہے۔ پرانے طبیبوں کی زبان سے اب بھی کہیں کہیں یہ لفظ سُنتے میں آتا ہے۔ قدیم اساتذہ کے یہاں اس کی انہی خاص مثالیں ملیں گی۔ مثلاً،

میں نفر سے کہا، جو ہے معتاد دے وہی چار پیسے، کم نہ زیاد

تاتم چاند پوری اثنوی دراجو عبام

ایسا وہ شوخ ہے کہ اٹھنے صبح جانا سو جاوے، اُس کی ہے معتاد

میر (اکیات مرثیہ آئیں ص ۶۴)

"حکیم صاحب نے گئی معتاد سے زیادہ کھانے کو منع فرمایا ہے" حالی

(مکاتیب حالی، دوم، ص ۴)

مختصر یہ کہ "عادی" استعمال بالکل صحیح لفظ ہے اور اساتذہ نے اس کو بالعموم استعمال کیا ہے۔ لغت کے لحاظ سے صحیح لفظ "معتاد" ہے، اُس کو مختلف معانی میں استعمال بھی کیا گیا ہے، مگر اب اُس کا چلن اُٹھ گیا ہے۔

مشکور، جس طرح "عادت گیرندہ" کے معنی میں "عادی" کو غیر صحیح کہا گیا تھا،

اور اُس کی جگہ "مقتاد" بدلنے کی فرمائش کی گئی تھی؛ اُسی طرح یہ بھی کہا گیا کہ "مشکور" صحیح لفظ نہیں؛ اس کے بجائے "مشکر" یا "شاکر" کہنا چاہیے۔ مولفین قارئین کو دکھائے کہ "مشکور" پر معنی منون صحیح نہیں۔ اور اس پر اظہارِ تہنیت کیا ہے کہ ایک واقف کار شخص بھی لکھ گیا ہے: "واقف کار شخص سے مراد غالباً مولانا شبلی ہیں؛ اُن کا شعر ہے،

آپ کے لطف و کرم سے مجھے انکار نہیں

ملکہ درگوش ہوں، منون ہوں، مشکور ہوں میں

مولفین آصفیہ و نور بھی اس لفظ سے کچھ خوش نہیں،

۔ اگر منون و مشکور کی بجائے، منوں و شاکر کہیں تو بہا ہے۔ (آصفیہ)

۔ اہل علم اس معنی میں استعمال نہیں کرتے۔ مشکور، مفت اُس شخص کی ہوگی جس

نے احسان کیا ہے، نہ اُس شخص کی جس پر احسان کیا گیا ہے۔ (عز)

عربی قواعد کے لحاظ سے لغت نویسوں کا فیصلہ بالکل صحیح ہے، لیکن ایک دوسری زبان

اُن قواعد کی پاس بند کیوں ہو! مشکور، بمعنی شکر گزار، آج بھی برابر استعمال ہوتا ہے اور پہلے

بھی بے تکلف استعمال کیا گیا ہے۔ مولف قند نے لکھا ہے کہ اہل علم اس معنی میں استعمال نہیں

کرتے؛ "اہل علم" ہی میں سے ایک ممتاز فرد کا یہ قول ہے،

"عربی میں مشکور" اُس کو کہتے ہیں جس کا شکر یہ ادا کیا جائے، مگر ہماری زبان

میں اُس کو کہتے ہیں جو کسی کا شکر یہ ادا کرے؛ اسی لیے بعض عربی کی قابلیت

جٹانے والے، اس کو غلط سمجھ کر، صحیح لفظ "شاکر" یا "مشکر" بدلنا چاہتے

ہیں، مگر اُن کی یہ اصلاح شکر کے ساتھ واپس کرنا چاہیے۔

مولانا سید سلیمان ندوی (نقوشِ بلیغاتی ص ۹۸)

پندت و تاتریہ کی کتاب نے لکھا ہے،

"جب "عادی" اور "مشکور" دونوں سے "عادت گیرندہ" اور "احسان مند"

کے معنی میں استعمال ہو رہے ہیں اور حکیم اور سامع دونوں کا ذہن انہی معنی کی طرف
جاتا ہے، تو اب تاؤ کس اور مزاج سے فتوے کرے، ان الفاظ کو اُردو سے خواجہ
کرنے میں کیا سہولت ہے؟ ۹۔ (فتوحات، ص ۱۹۳)

اتمامِ حجت کے طور پر دو چار مثالیں بھی پیش کی جاتی ہیں،

رنگِ املو میں بدل، پھر اس درجہ و فہر کیا خداوندی۔ ہر اللہ، خدائی مشکور
میر (کلیاتِ مرثیہ آسمی ص ۷۳۷)

آپ کے لطف و کرم سے مجھے انکار نہیں، حلقہ در گوش ہوں، ہمنون ہوں، مشکور ہوں میں
شبلی (کلیاتِ نظم اردو ص ۱۲۰)

”جو کچھ ہو سکے وہ لکھا کرو اور ہمنون و مشکور کیا کرو“

مکاتیبِ میر دہلوی، مرثیہ اصن الشفاں ثاقب، طبع دوم ص ۱۷۰

”ان کے سبب کہ میں آپ کا نہایت ہمنون و مشکور ہوں“

مکاتیبِ میر تقی میر، مرثیہ شتان حسین ص ۲۷۲

”آپ کا خط پہنچا، میں غمناک و مشکور ہوا“

(تاریخِ نثر اردو ص ۵۹۸)

”خادمِ آپ، دل و تاج، بے غایت کا درجہ منور و مشکور ہوا“

(مرثیہ ادبی ص ۲۵)

بلکہ نے ایک جگہ ”مشکور“ اس معنی میں استعمال کیا ہے۔ شعر یہ ہے:

شکرِ خدا کو عشقِ مست اس میں مشکور ہوں

راحت۔ علی۔ جو رنج مجھے یار سے ملا

(مجموعہ دواوینِ رشک ص ۶۹)

”مشکور“ ہم کہ ملوں پرستوں ہے، مگر اس معنی میں اس نے رواج نہیں پایا۔

معتوب، رنغ، مفلوک، معتوب، مرقن جیسے بہت سے لفظ، عربی الفاظ کے قیاس پر بن گئے ہیں اور قبول عام کی سند پا چکے ہیں۔ قواعد کی عینک لگا کر دیکھیے تو ہم سب لفظ غلط نظر آئیں گے۔ مولفین قاموس نے ایسے بھی لفظوں سے اجتناب کا حکم دیا ہے۔ اس ضمن میں لفظ "معتوب" پر سب سے زیادہ عتاب کا اظہار کیا ہے، اور لکھا ہے کہ اس کے بجائے صحیح لفظ "معاتب" استعمال کرنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ اس پر مذاق کو کوئی مرد معقول خوش آمدید نہیں کہے گا۔ ذیل میں دو فقرے نقل کیے جاتے ہیں؛ ان میں "معتوب" کو "معاتب" سے بدل کر دیکھیے؛ خود اندازہ ہو جائے گا:

"ملا صاحب دربار اکبری سے معتوب ہوئے" مولانا شبلی

(شعر العجم، سوم ص ۷۴)

"وہ جبرم بناوت میں خود معتوب تھا" محمد حسین آزاد

(دربار اکبری، اشاعت لکھنؤ ص ۳۱۳)

بحور نظم حال (اشاعت مطبع العلوم علی گڑھ ۱۹۱۶ء) میں مولانا حالی کا ایک شعر یوں ہے:

دوست اللہ کے ہیں ٹھہرتے معتوب وہاں

اور سیماے زماں ہوتے ہیں مصلوب وہاں

اس شعر میں لفظ "معتوب" پر مولانا حالی نے یہ ماسخ لکھا ہے:

"صحیح لفظ "معاتب" ہے، مگر اردو میں بجائے "معاتب" کے "معتوب"

بول جاتا ہے، جیسے بجائے "معفو" کے "معاف"۔ پس اردو میں

یہی صحیح اور ہی فصیح ہے۔"

اس ضمن میں مولف لغت نامہ دہندا کا یہ قول ہمارے سامنے رہنا چاہیے:

"ماہوزن سخن عربی از لغات فارسی جزا ساختہ و بکار برودہ ایم و گاہ

عرب قدیم و معاصر را نیز باستعمال آن را داشتہ ایم، مثل ذاکت

از نازکی، و فَلَاکَت و مفلوک و مفلایک اذ کلّ فَلَاکَت و فَلَاکَت

(گفت نامہ و پنجا جلد ۴ ص ۴۰)

مولفِ گفت نامہ نے جس تعریف کا ذکر کیا ہے، اُس کا اطلاق اردو پر بھی ہوتا ہے۔ فارسی کی طرح اردو میں بھی اِس طرح کے بہت سے لفظ مستقل ہیں؛ اُن میں سے کچھ لفظ فارسی سے ہم کو بنے بنائے گئے ہیں (جیسے، مفلوک، نَزاکت، فَلَاکَت و غیرہ) اور کچھ اردو کی صلاحیت تراشش خراشش کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ ایسے سب لفظ اردو کے سرمایے کا قابلِ قدر حصہ ہیں۔ ان سے اردو کے ذخیرۃ الفاظ میں اضافہ ہوا ہے اور اداسے مفہوم کے لیے نئے نئے وسیلے آتے ہیں۔

لفظاً "معتوب" آصفیہ میں موجود نہیں۔ اُس میں صرف "معائب" ملتا ہے۔ اِس سے پر خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مولفِ آصفیہ کی رائے میں بھی "معتوب" قابلِ قبول نہیں۔ البتہ قور میں یہ لفظ موجود ہے، مگر اُس میں کوئی سند نہیں پیش کی گئی ہے۔ ہاں، رشک نے ایک غزل میں جس کے قوافی تب اور لب ہیں "معائب" بھی نظم کیا ہے۔ وہ شعر مع مطلع یہ ہے :

سادگی سے سبز و رخسار انسب ہو گیا کیا مزلف ہوتے ہی چہرہ مزین ہو گیا
جب زتب بھلا کیا بھر پر زمانے کا بنجار جس کو غصہ میں پر آیا میں معائب ہو گیا
(مجموعہ درادین رشک ص ۷۳)

قواعد کی رو سے لفظ صبیح ہے، مگر کس قدر اجنبی بل کہ غیر نصیم معلوم ہوتا ہے !

شکیل : "معتوب" کی طرح "شکیل" بھی عربی میں نہیں پایا جاتا۔ اِس کا مادہ "شکل" ضرور عربی ہے۔ اِس لفظ کو بھی بر بنائے اعتیاط ترک کرنے کی فرمائش کی گئی ہے ۔

”شکیل“ خوب رو کے معنی میں ! اس کا ترک اولیٰ ہے، اگر ہر ذوق نے لکھا ہے۔“ (قاموس)

شاید ہی کوئی شخص فاضل موفین کی ہم زانی کر سکے۔ آصفیہ و قمر میں یہ لفظ وجود ہے۔ موفین نے یہ مراحت کر دی ہے کہ یہ اردو نثر اور لفظ ہے، مگر سند کے لئے نہیں پیش کی ہے۔ ذیل میں چند اسناد درج کی جاتی ہیں :

نازداد اکے ساتھ وہ دل پر شکیل ہے تصویر چیں کی رو بہ رو اس کے ذیل ہے

میر (کلیات مرثیہ آتشی ص ۲۴۸)

نام خدا ہیں عون و محمد بھی کیا شکیل اک مہر بے نظیر ہے، اک ہلو بے عدیل

اتیس (روح انیس، ص ۱۱۱)

صفدر جواں شکیل جواں، نازیں جواں کس نے تجھے ٹوڑ لیا، اے عیس جواں

اتیس (روح انیس، ص ۱۶۵)

نور معنی ہے ہر شکل نیر اس کا اللہ اللہ زبے شکل شہنشاہ شکیل

ذوق (تھانہ ذوق مرثیہ سر شاہ طہان ص ۳)

”ایک جواں شکیل، زعفرانی جوڑا پہنے، گدڑی پر بیٹھا ہے۔“ میر آخن

(بانگ دہلاد مرثیہ مولوی عبدالحق ص ۲۸)

”سودائیوں کے غول میں اک جواں، خوب صورت، شکیل۔“ میر آخن

(بانگ دہلاد ۔ ۔ ۔ ص ۹۹)

”حاتم کے پاس ایک گھوڑا ہے اسیل و شکیل۔“ میر آخن

(گچا خونی، مطبوعہ کلکتہ، ص ۱۳۲)

”پیش اس کی نہایت جمیل و شکیل۔“ شیر علی انیس

(آراء پیش محل، مجلس ترقی ادب لاہور ص ۲۲۹)

میرا خیال ہے کہ یہ لفظ ہندستانی فارسی دانوں کا بنایا ہوا ہے اور بہت پہلے بنا ہے۔ میں فی الوقت اس کی سند پیش کرنے سے قاصر ہوں، مگر اچھی طرح یاد ہے کہ برابونی کی منتخب الثرائیح میں ایک جگہ ”زین جمیلہ و شکیلہ“ موجود ہے۔ یہ کتاب اس وقت دسترس سے باہر ہے اور جو یادداشت اس سے متعلق تیار کی گئی تھی، وہ بھی موجود نہیں۔

اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سلیمان جیم نے اپنے کُنت میں ”شکیلہ کو خوش قطع“ کے معنی میں لکھا ہے اور یہ فقرہ بطور مثال درج کیا ہے، ”اس جعبہ خیل شکیل است“۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی جمید میں یہ لفظ موجود ہے، ذرا سے معنوی فرق کے ساتھ۔ لیکن جیم نے یہ غلطی کی ہے کہ اس کو عربی لکھا ہے۔ فوربس پلیس، بیلن اور شیکسپیر نے بھی جیم کی طرح اس لفظ کو عربی لکھا ہے۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، یہ صحیح نہیں شیکسپیر اور فوربس نے ”شکیل“ کی تانیث ”شکیلا“ (الف کے ساتھ) لکھی ہے اور فوربس نے اس کو بھی عربی لکھا ہے۔ اردو (اور ہندستانی فارسی) میں ”شکیلہ“ ہے مادہ ”شکیلا“ کوئی لفظ نہیں۔

تابعدار، ”تابعدار، غلط ہے، اس لیے کہ تابع“ خود اسم فاعل ہے، پھر اُس پر ”دار“ صرف غیر ضروری بل کہ غلط ہے۔ (قاموس) مؤلفین قاموس کے علاوہ بعض اور لوگوں نے بھی اس کو غیر صحیح بتایا ہے۔ مؤلف آصفیہ نے لکھا ہے کہ، ”یہ لفظ غلط شہور ہے کیونکہ ”تابع“ خود فاعل کا صیغہ ہے۔“ یہی عبارت لفظ بانظ نور میں موجود ہے۔ مولانا فکرم علیا طہانی نے بھی اس کا شمار غلط الفاظ میں کیا ہے (معانی سخن ص ۴۶)۔ مولانا مال نے ایک استفادہ کے جواب لکھا تھا، ”تابعدار، غلط ہے۔ صرف فرماں بردار کہنا چاہیے۔ کیوں کہ ”تابعدار“ کے معنی

تالیج رکھنے والا کے ہیں۔ فصحا کے کلام میں نہیں آیا ہے۔ عوام اور جہلا کی زبان پر

اکثر جاری ہے۔ (مکاتیب حلی، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل بانی پتی ص ۷۶)

یہ لفظ بہ لحاظ قواعد غلط بھی لیکن اردو میں مستعمل ہے۔ غراں ہمداری کا جو مفہوم اس لفظ سے ادا ہوتا ہے، وہ صحیح لفظ ”تالیج“ سے ادا نہیں ہو سکتا۔ اسی سے ”تالیج داری“ بنا ہے اور یہ بھی مستعمل ہے۔ اوروں کا کیا ذکر، خود سولا نا آتی ہے اس لفظ کو کم از کم دونوں میں استعمال کیا ہے :

ماں باپ کے حکموں پہ پتلی کی طرح چپتی رہی غم غماں بالوں کی رہیں، ماؤں کی تابعدار تم
(چپ کی داد)

اپنے اعضا یا داغ و دل کے بختدار ہیں جیسے یہ محکوم ہیں، وہ سب بھی تابعدار ہی
(جوانوں کے خطاب)

استعمال عام کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا ! بعض اور مثالیں :

جو کچھ کہ حکم ہو، چاکر ہوں اور تابعدار جو کچھ کہ امر ہو، بندہ ہوں اور خدمت گار
میراٹن (گنج خوبی مطبوعہ کلکتہ ص ۱۳۲)

جب کہ دو لکھا ہے آپ تابعدار نہیں کرتا کسی طرح ٹکرا
متیر شکوہ آلودی دکھیات منیر ص ۱۶۶

”ہیں تابعداری و انا مدتروں کی واجب ٹھہری۔“ میراٹن

(گنج خوبی ص ۱۹۱)

(ص ۱۹۱ گنج خوبی)

انسان، جانوروں کو گام لگا کر اپنا تابعدار بنائے ہیں : سید سلمان ندوی
لیکن کاظمی مرحوم نے داغ سے متعلق ایک واقعہ لکھا ہے :

”بے نظیر کے سیلے میں داغ بیٹھے ہوئے کسی سے بات چیت کر رہے
تھے کہ اصغر علی خاں جنرل مرحوم آدھرت گزرے اور سلام کیا۔ مگر داغ اتنے

منہک تھے کہ سنا ہی نہیں..... اس پر انھوں نے پکار کر کہا، ”اوہر تو اب مرزا!
 حصار تو علاج ہی نہیں دے گا۔ یہ سنتے ہی داغ نے عرض کیا، ”مضربہ! وہ ایسا
 تیسرا ضلع، میں تو آپ کا تابعدار ہوں۔“

داغ (مستندہ جنگیں کاغذی، ص ۲۸۵)

عظیم برہم (علیہ آئینہ بنائی) نے ایک استفسار کے جواب میں، رسالہ اصلاح زبان اردو
 کے سلسلے میں لکھا تھا،

”مؤلف نے ”تابعدار“ کو بھی غلط بتایا ہے۔ یہ لفظ بھی اب زبان سے جڑ نہیں
 ہو سکتا۔ احتیاط کرنے کا ہر شخص کو اختیار ہے جس کو تقوا کہتے ہیں، مگر ترک کا
 فتوا دینا بہت دشوار ہے۔“ (مکتوب برہم، برنامہ مستندہ مرزا پوری، مرتبہ ادب
 جلد دوم، ص ۵۵)

تثقید: ”تثقید عربی میں نہیں آیا ہے، اردو والے نقد و انتقاد کی جگہ

کہتے ہیں۔ اس سے احتراز چاہیے، اس لیے کہ یہ غلط ہے۔“ (قاموس)

نیاز صاحب بھی اس لفظ سے خفا تھے اور میر خیال ہے کہ اُن کی یہ غفلت، مولفین قاموس کی
 تقلید کا نتیجہ تھی۔ سیلاب اکبر آبادی نے ایک مصرعے میں اس لفظ کو استعمال کیا تھا، ”
 غلط تثقید، ہل طعن بے جا ترا“ نیاز صاحب نے اس کے متعلق لکھا تھا،

”تثقید“ غلط ہے۔ عربی میں نقد و انتقاد تو آتا ہے، لیکن بابِ تفعیل سے

”تثقید“ کہیں استعمال نہیں کرتے۔“ (انتقادیات اول، ص ۲۷)

لیکن اس لفظ کی ہر گزیری کو کیا کہا جائے کہ خود نیاز صاحب نے اس کو مستندہ جگہ
 استعمال کیا ہے، مثلاً،

”جب ہم کسی شاعر کے متعلق تثقید کریں“ (مستندہ ریاضِ رضواں، ص ۴۵)

”اگر کوئی تنقید ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ وہ اچھی لکھی گئی ہے یا بُری“

(انتقادیات، جلد اول ص ۲۷)

یہ لفظ ”نقد“ اور ”انتقاد“ کے مقابلے میں کہیں زیادہ مستعمل ہے اور مستعمل رہے گا اور رہنا چاہیے۔

اس لفظ کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ یہ صرف اردو میں مستعمل ہے، مگر فارسی کی دو جدید فرہنگوں میں اس کا موجود ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ فارسی جدید میں یہ لفظ مستعمل ہے۔ (۱) سیم نے اپنے لغت میں اس کو درج کیا ہے۔ (۲) فرہنگ ایمرکیر میں بھی یہ موجود ہے اور اس وضاحت کے ساتھ،

”تنقید“ عیب جوئی کردن، خرد گیری بر نوشتہ یا کتاب، تمیز دادن

خوب و بد۔ در عمل از باب تفعیل نیادہ است۔

آخری جملے سے بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ لفظ فارسی میں مستعمل ہے۔

یہ لفظ فارسی کی طرح اردو میں بھی اصل معنی کے ساتھ ساتھ، مطلق عیب جوئی یا کٹہر بنی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے،

اے مسلکِ حق پر تنقید کرنے والو بے چارہ تماخیت، اچھا تھا یا بُرا تھا

مفتی کھنوی (دیوانی مفتی ص ۱۹)

قاضی عبدالودود صاحب نے اس لفظ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے،
اس سے معلوم ہو گا کہ یہ لفظ بہت زمانے سے فارسی میں مستعمل ہے،

”تنقید، لیکن جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے، یہ فعل مصدر ہے جس سے عرب

واقف نہیں۔ اس کے استعمال کی قدیم قرین مثال جو میرے مسلم میں ہے،

ضیاء برنی، مسامحہ سرودکن تاریخ فیروز شاہی میں ملتی ہے، ”در تنقید

روایات و تخریفات روایت“ (ص ۱۰) شیرانی مرحوم نے ضمیمہ

تتقیہ شمس المہم (ص ۵۵۲) میں عبد اللہ بن اوزبک کے ایک دیباری پابندہ محمد
نقشبانی تخلص کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے جس کا تاریخی نام تتقیہ الدیر ہے (۱۱۹۹ھ)۔
فہرست کتب خانہ محمدیہ بھی (ص ۵۷۹) میں ایک کتاب تتقیہ الکلام المنسوب
الی غوث الانام ہے۔ اس کے مصنف کا نام حافظ ابو الاسحاق محمد نسیم ہے اور مطبع
ڈولکھور میں ۱۳۴۲ھ میں طبع ہوئی تھی۔

ان مثالوں سے یہ ثابت ہو گیا کہ بعض اصحاب کا یہ خیال کہ شبلی اس لفظ کے
موجد ہیں، صحیح نہیں۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ اس لفظ کو انھوں نے زندہ کیا
ہے۔ اردو میں عام استعمال اُن کی بدولت ہوا ہو تو محب نہیں۔ زماذ حال کے
ایرانی مصنفین (مثلاً آقائی پور و آؤد) کے یہاں یہ لفظ ملتا ہے مگر میرا خیال
ہے کہ یہ اردو کا اثر ہے۔ (مجلہ معاصر ما ص ۱۳۵)

آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ توڑ میں یہ لفظ موجود ہے مگر موافق نے اس کو عربی لکھ لیا
اور یہ درست نہیں۔

جواہرات : ”جواہرات“ غلط ہے۔ اس کی جگہ جواہر (جمع جہر) کہنا کافی ہے۔
اردو میں جواہر کا اطلاق مفرد پر ہی ہوتا ہے؛ اس لیے اس کو مفرد کہہ کر جواہرات
جمع بنائی ہے جو قابلِ ترک ہے۔ (قاموس)

اس لفظ کو قابلِ ترک قرار دینا خوش مذاقی کی جان چسٹم کرتا ہے۔ بہت سے جملہ ایسے ہیں گے
جن میں ”جواہرات“ کے بجائے ”جواہر“ لایا جائے تو جملے کے شبن اور مفہوم کی پرکاری و دلالت
پر حرف آجائے گا۔ ”جواہرات“ میں سبقتی اور معنوی پرکاری کے لحاظ سے جو خوبی ہے۔ اردو
”جواہر“ میں نہیں۔ اُمیر سبانی کہنا اگر حکیم برہم نے ایک استفسار کے جواب میں
لکھا تھا :۱

”جواہرات“ بہ کثرت مستعمل ہے۔ اب اس کو داخل زبان سمجھنا چاہیے۔

(مکتوبہ تمام مقتدر مرزا پوری، مجمع ادب، دوم ص ۵۵)

احصیہ و نثر میں یہ لفظ موجود ہے، مگر دونوں میں سند نہیں ملتی۔ بعض مثالیں لکھی جاتی ہیں:

جو شخص ہے اُس جگہ پہ جاتا ڈھیروں ہے جواہرات پاتا

نسیم (گلزارِ نسیم مرتبہ چکبست ص ۲۲)

دیکھو جو جواہرات کے ڈھیر سب میں کی ہوس سے ہونگے سیر

نسیم (گلزارِ نسیم مرتبہ چکبست ص ۲۷)

”اگرچہ ان شعروں میں اور ان شعروں میں جو نسبت ہے، وہ ان جواہرات کے

پر لکھنے والے ہی جانتے ہیں۔“ آزاد (آپ حیات، ترجمہ آتش)۔

”جس میں وقت کے عاویس نے اپنے جواہرات خرچ کیے تھے۔“

آزاد (آپ حیات، ترجمہ آتش)

”بھالروں میں موارید و جواہرات مجمل کرتے۔“

(در بار اکبری، شائع کردہ کتبہ کلیاں لکھنؤ ص ۱۶)

”اکسیر کو خاک، جواہرات کو پتھر، موتی کو سیپ... کے برابر ہی لوگ نہیں جانتے۔“

نظام غوث بے خبر (انتخاب بے خبر، شائع کردہ دولتی دنیا، علی گڑھ ص ۱۲)

”اور کہتے ہیں، اُن کے ساتھ جس قدر جواہرات تھا، سب دولتِ خیال کی نذر ہوا۔“

شرر (گلدستہ لکھنؤ، گیلانی پریس لاہور ص ۷۳)

فردوسِ عام طور پر جمع الجمع کو اچھا نہیں سمجھا جاتا، جیسے القابوں، القابات، الفاعلون

اجابوں، علماؤں، اشعاروں (وغیرہ) بل کریں کہیے کہ محنت اور فصاحت، دونوں کے

خلاف قرار دیا گیا ہے اور ٹھیک یہی ہے، مگر ”جواہرات“ کو استثنا سمجھنا چاہیے بہ کثرت استعمال

نے جو اذکارِ حق و دارِ بنا دیا ہے۔ لیکن دوسرے الفاظ کو اس پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔

قاعدے کے لحاظ سے ”جوہر کی جمع“ جوہرہ کہسیر آنا چاہیے، لیکن شعرا نے
اس کو پیچ آ بھی نظم کیا ہے، مثلاً،

مہر کی تجھ سے توقع تھی، ستم گر نکلا موم بچے تجھے ترے دل کو، سو پتھر نکلا
گلج کا دی جوگ سیسنے کی غم جہاں نے اس دھنچے میں سے اقسام جوہر نکلا
تیرا کلیات مرتبہ آتی ص ۲۰

جب کچھ موردِ تحسین میں اکشر اشعار کہا اُستاد نے مجھ سے مرے سخن کر اشعار
ان فصاحت کی سند پھر زکلامِ محشر تھی لائے وہ میرے لیے یہ زجواہر اشعار
سودا (کلیات، نو لکھنؤ ص ۲۱۹)

مولف نور نے ”جوہر“ کی ایک دوسری جمع الجمع ”جواہروں“ کے متعلق لکھا ہے
کہ ”جواہروں متروک الاستعمال ہے“ لیکن اس کی مثالیں مل سکتی ہیں۔ ایک مثال پیش
کی جاتی ہے :

سینہ، علیم مہر و وفا کی کتاب ہے گو یا کتابِ حسن کا ایک ایک باب ہے
فقہ ہر ایک منتخب و لا جواب ہے اللہ کے مرتبہ، نظر اُس پر ثواب ہے
ہے صدقِ معرفت سے یہ سینہ بھرا ہوا

یہ ہے جواہروں سے خزمینہ بھرا ہوا

شادِ عظیم آبادی (مراثی شاد اول ص ۹۵)

مندرجہ بالا مصرعے میں یہ جمع اس طرح آتی ہے کہ پوری طرح کھپ گئی ہے؛ اس
لیے اسے متروک استعمال قرار دینا کچھ ضروری نہیں۔ بلکہ استعمال کے لحاظ سے فصاحت
و عدم فصاحت کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے، دوسرے الفاظ کی طرح ۔

راشی : ”راشی، رشوت دینے والا۔ مرتشی، رشوت پانے والا۔

مرثی کی جگہ راشی کہنا غلط ہے؟ (قاموس)

مؤلف نور کی بھی یہی رائے ہے، "رثوت لینے والے کو" راشی "کہنا غلط ہے۔ اس کے واسطے "مرثی" صحیح ہے۔ آصفیہ میں بھی "راشی" کو رثوت لینے والے کے معنی میں "غلط العوام" لکھا گیا ہے۔

عربی کے لحاظ سے صحیح بات وہی ہے جس کو مؤلفین لغات نے لکھا ہے یعنی "راشی" کے معنی ہیں، رثوت دینے والا۔ اور رثوت لینے والا "مرثی" ہے۔ لیکن اردو میں "راشی" رثوت لینے والے کے معنی میں مستعمل عام و خاص ہے۔ "یہ حاکم بہت راشی ہے"۔ اس کے بجائے "یہ حاکم بہت مرثی ہے" کہیے تو خود بخود امانت ہو جائے گا کہ اردو میں صحیح صورت کیا ہے۔ عام طور پر لوگ رثوت خورشخص کو "راشی" کہتے ہیں اور لفظ "مرثی" سے عام لوگ واقف نہیں، اس مصنوعی فرق سے واقف ہیں، اور ناواقف ہی رہیں تو اچھا ہے۔ آصفیہ میں "راشی" کو رثوت لینے والے کے معنی میں "غلط العوام" لکھا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی یہ صورت ہو، مگر اب تو یہ "غلط العام" کے ذیل میں آتا ہے اور اس نسبت سے اس معنی میں یہی تصحیح ہے۔ اردو کے لیے لفظ "مرثی" بالکل اجنبی ہے۔ ہاں، قدیم تصنیفات میں لفظ "مرثی" رثوت لینے والے کے معنی میں کہیں کہیں مل جاتا ہے۔ ابن الوقت میں بھی ایک جگہ موجود ہے، "مرثی بناو با، تمام تر پستان" (ص ۲۹۶)۔ اور بھی بعض مثالیں مل سکتی ہیں؛ مگر اب یہ بالکل غیر مستعمل ہے اور اس کی جگہ راشی بولا جاتا ہے۔

ردی، "ردی، خراب، ناکارہ، نکمٹا، بگڑا ہوا، بقتدیر
وال کہنا غلطی ہے؟ (قاموس)۔

عربی میں اس لفظ کی صحیح صورت یہی ہے (ردی؟)۔ لیکن مؤلفین نے اس پر غور نہیں فرمایا کہ بے کار یا خراب کتاب، بے کار کاغذ، پرانے اخبار (جن کو فردخت کیا جاتا ہے) ان

سب کو "ردی" ہی کہا جاتا ہے۔ اگر کے اس شعر میں :

مرزا غریب چپ ہیں، اُن کی کتاب ردی بدحو اکڑ رہے ہیں، صاحب نے یہ کہا ہے
 "ردی" کی جگہ کسی طریقے سے "ردی" لاکر دیکھیے، شعری ردی ہو جائے گا۔ یہی صورت
 حال کے اس بند کی ہے :

وہ تقویم پارسنہ یونانیوں کی وہ حکمت مجھ ہے ایک دھوکے کی شئی
 یقیں جس کو ٹھہرا چکا ہے نکتی عمل نے جسے کر دیا آ کے ردی
 (مسدس حالی، تاج کینی لاہور ص ۶۷)

موقف فور اللغات نے اصل لفظ لکھ کر "ردی" (بہ تشدید وال) بھی لکھا ہے اور اس کو
 اُردو مانا ہے۔ موقف آصفیہ نے مراحت بھی کر دی ہے کہ : "اردو میں بہ تشدید وال پہلے پہل
 ہیں" یہ صحیح طریقہ ہے۔

ہاں، اُردو شعرا نے ردی (بغیر تشدید) بھی نظم کیا ہے، جیسے :

انا مری حالت اب ردی ہے بہتر ہے وہی جو کچھ بدی ہے

(منوی گویا رستم عشق بکبیت ص ۳۷) —

ردی جب ہوا دستبر آفتاب گنلا دستبر امتحان حساب

(کلیات نصرت حسن، اکاکوری، نای پریس ص ۱۶۷)

لیکن اس طرح کم استعمال میں آیا ہے۔ اس لفظ کی دونوں صورتوں (ردی، ردی) کو صحیح
 ماننا چاہیے۔ جیسا عمل ہو ویسا ہی لفظ منتخب کیا جائے۔ یہ ضرور ہے کہ جس غہوم کو چڑھات
 انداز سے اردو لفظ "ردی" ادا کرتا ہے، وہ اُس کی نیم عربی صورت "ردی" سے ممکن
 نہیں (عربی میں "ردی" نہیں ہے)۔ فوزیس اور پائیس نے بہ تشدید وال (ردی) کو فارسی
 لکھا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ بہ وال مشدود، اُردو کا تعلق ہے۔

ذہانت : یہ لفظ چوں کہ مرئی کے کسی لغت میں نہیں پایا جاتا، اس لیے مولفین قاموس نے اس کو ترک کرنے کی فرمایش کی ہے۔ کیسا اچھا اور جامع لفظ ہے، اور اس کو گزرن نفی قرار دیا گیا ہے، مولانا نظم طباطبائی نے بھی اپنے مقالے ”ادب الکاتب والشاعر“ میں ”ذہانت“ کا شمار اُن الفاظ میں کیا ہے جن سے دامن بچانا واجب ہے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ فلین و پلیس نے بھی اس کو شامل لغت نہیں کیا ہے۔ فور میں یہ لفظ موجود ہے، لیکن اسناد مذکور نہیں۔ ذیل میں کچھ اسناد لکھیں جاتی ہیں،

”وہ خود بھی ذہانت میں دو شخصوں کے سوا کسی ہم عصر کو تسلیم نہ کرتے تھے۔“

عبدصمد آزاد کو (آپ حیات، ترجمہ موتی)

”اپنی طبائی اور ذہانت کا نشانہ نہ بناتے۔“ حافظہ مورخان مشیرانی،

(مکتوب مشیرانی صاحب، ملی گزشتہ میگزین، سالانہ)

”ذہانت کے لیے بڑا میدان شعر و شاعری کا تھا۔“ مولانا عبدالماجد دریا باوی،

(انشائے ماجد دوم، ص ۲۱۳)

”اُن کی ذہانت اور محنت کو دیکھا۔“ ڈاکٹر عبدالستار مستورلی،

(فرانے ادب، (بجی) اپریل ۱۹۷۰ء، ص ۱۳)

”ذہانت“ ہی کی قبیل کا ایک اور لفظ بادشاہت ہے۔ مولفین قاموس نے اس کو بھی ”عوام“ سے متعلق کر دیا ہے، ”بادشاہت، عوام بادشاہی کی جگہ کہتے ہیں“ (قاموس)۔ صاحب آصفیہ نے بھی اس کو ”عوام“ کا لفظ بتایا ہے۔ یہ خرابا بالکل سچ نہیں۔ یہ لفظ مستعمل عام و خاص ہے۔ اثبات مذہا کے لیے کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں،

بادشاہت پہ انہی لوگوں کی غش ہوں میں تو گلا توڑ چڑھی کوئی جن کے فقرت میں نہیں

اتش (کلام اتش، ص ۱۶۶)

بادشاہت ہے اگر عہدہ درباری میں ہوئے معشوق کے دروائے پر تو کو عاشق

انشا (کلام انشا، ص ۸۹)

جنوں میں عالمِ طفلی کی بادشاہت کی کھلونا آنکھوں میں اپنی ہر اک غزال ہوا

آتش (کلیات نو کشور، ص ۸۹)

”اور بھی ریاستیں دیکھیں، بادشاہت بھی دیکھیں۔“ داغ (دربان داغ، ص ۱۵۲)

باغِ دیہارِ مرقعہ مولوی عبدالحمید (شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند) میں صفحات ۵، ۶، ۹، ۱۰،

۲۶، ۵۶، ۶۸، ۷۵، ۱۰۷، ۱۸۵، ۱۹۹، ۲۰۳، ۲۱۵، ۲۲۵ پر یہ لفظ موجود ہے۔

میر خیال ہے کہ اثباتِ مدعا کے لیے یہ مثالیں ہی کافی ہیں۔

اردو میں بہت سے عربی و فارسی اور ہندی الفاظ کے آخر میں آئے مصدری یا ت

کا اضافہ کر لیا گیا ہے، جیسے، چنگا گت، دیہانت، چودھرایت، اپنایت، بازاریت،

چاہت، رنگت، ملاہیت، یکسانیت وغیرہ۔ اردو سے پہلے فارسی میں یہ طریقہ مستقل رہا

ہے۔ عربی و فارسی کے بہت سے لفظوں سے عربی مصادر کے انداز پر الفاظ بنا لیے گئے ہیں،

جیسے، فلاکت، نزاکت، ترازت وغیرہ۔ اس قبیل کے سب لفظ بالکل صحیح ہیں اور فصیح

بھی ہیں۔

”مَفَاعَلَتَا کے وزن پر سارے الفاظ پانچ حرفِ چارم صم ہیں۔“ (قاوس)

اس میں شک نہیں کہ عربی کے لفاظ سے اس وزن پر آنے والے الفاظ پانچ حرفِ چارم ہی

صحیح ہیں، جیسے، مُبَالَغَة، مُشَاوَرَة، مُشَاهَدَة وغیرہ؛ مگر اردو میں ایسے اکثر الفاظ

ہر کسبِ حرفِ چارم زبانِ زد ہیں۔ ان کو اگر لغت کے مطابق ادا کیا جائے تو ثقالت کا شدید

احساس ہوگا۔ کوشش کر کے، کچھ رنگ کر، اور گفتگو کی روانی کو ختم کر کے، ان کو پانچ حرف

چارم بولا جاسکتا ہے۔ مثلاً ایک مصدر ہے، معاہدہ، ”علاج معاہدہ“ زبانِ زدِ ترکیب؛

اب اس کو لغت کے مطابق پانچ حرف چارم بول کر دیجیے، روانی کلام خود بہ خود مبعروج ہو جائے گی۔ ایسے الفاظ کی (نامتام) فہرست یہ ہے :

”مبالغہ، محاربہ، محاسبہ، مراقبہ، مطائبہ، مباحثہ، معالجہ،
مبادیہ، مشاہدہ، مہامرہ، معاہدہ، مشاہرہ، مناظرہ، موازنہ،
مناقشہ، مقالطہ، ملاحظہ، مرافقہ، معانقہ، مضائقہ، مجادلہ،
مقابلہ، مکالمہ۔“

مراسلت، مخاطبیت، مصاحبت، مکاتبت، مناسبت، مسامحت،
مصاحبت، مناگت، مباسرت، مسافرت، مشاورت، معاشرت،
منافرت، مہاجرت، موازنت، مجالست، محافقت، متابعت،
مجامعت، مدافعت، مراجعت، ممانعت، منازعت، مخالفت،
مطابقت، مفادقت، منافقت، موافقت، مشارکت، مداخلت،
مواصلت، ممانعت، مزاحمت، مشایعت۔

اس سلسلے میں یہ پہلو بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ مندرجہ بالا الفاظ میں سے بعض کے تلفظ میں
کبھی کبھی ایک یہ صورت بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ بولنے میں حرف چارم کا زیر واضح طور پر
اوا نہیں ہوتا اور نہ پوری طرح سکون کی کیفیت نمایاں ہوتی ہے۔ سکون اور ذہیک دوریانی
کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے ایک لفظ ہے : مقابلہ، گفتگو میں ب کا زیر واضح نہیں
ہوتا، بل کہ زیر اور سکون کی مثل چلی کیفیت نمایاں ہوتی ہے۔ مگر یہ صورت صرف بول چال سے
تعلق رکھتی ہے۔ اگر ایسے الفاظ بر اعراب لگائے جائیں تو اس صورت میں حرف چارم پر کسرو
ہی لگانا چاہیے۔

ہاں، فارسی امروزہ میں، ایسے الفاظ میں یہ تغیر ہو چکا ہے، یعنی حرف چارم کا فتح،
کھڑے سے بدل گیا ہے۔ مولف فرہنگ امروز گارنے ایک صواب قائم کیا ہے :

”تغیرات ہم کو در لغات عربی وارہ شد“؛ اُس کے ذیل میں لکھا ہے، ”و تغیرات حرکت مانند مبارزہ، میاحضہ، مغالطہ؛ پاکسہ حرف چہارم بہای فتحہ“ (فرہنگِ نمودگار) بابِ مغالطہ سے دو مصدر ”مصافحہ“ اور ”مطالعہ“ بھی آتے ہیں۔ ان کو اوپر کی فہرست میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ یہ دونوں لفظ ایک اور طرح بھی بول چال میں آتے ہیں، یعنی حرفِ چہارم مفتوح اور حرفِ پنجم ساکن (مصافحہ، بروزنِ لفاظہ)۔ جس طرح ”قلعہ“ کے کلام کو (جو اصلًا ساکن ہے) مفتوح کر کے، عین کو ساکن کر دیتے ہیں، اور ”قلعہ“ بروزنِ مُضَعَج بولتے ہیں، یا قلعی کو (جو اصلًا بروزنِ فَعْلَن ہے) بروزنِ مُعَلَّ بولتے ہیں؛ اسی قسم کا تعریف ”مصافحہ“ اور ”مطالعہ“ میں ہوا ہے۔ گفتگو میں عام طور پر یہ دونوں لفظ بروزنِ فَعْلَن مستعمل ہیں۔ ان لفظوں کے اس تلفظ کو بھی صحیح مان لینا چاہیے۔

یہاں پر ایک نکتہ تو یہ طلب ہے، آتش اور ولی کے درج ذیل اشعار میں لفظ ”مطالعہ“ اسی طرح نظم بھی ہوا ہے:

دیکھنا ہر جگہ تجھ رخسار کا ہے مطالعہ مطلعِ انوار کا

(اُکلیاتِ ولی، مرتبہ ڈاکٹر ذوالسن باشی ص ۲۷)

لکھے ہیں سرگزشتِ دل کے مضوں یک قلم اس میں تماشا قتلِ گج کا ہے مطالعہ میرے دیوان کا

(اُکلیاتِ آتش، نول کشور پریس، ص ۶۷)

بعض لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ان شعروں میں دونوں شاعروں نے غلطی سے ”مطالعہ“ کو ”مطالع“ نظم کیا ہے۔ لیکن یہ غلطی نہیں، رواجِ عام کی پیروی ہے۔ ان شعروں میں اس لفظ کو لکھا تو جائے گا اصل کے مطابق یعنی ”مطالعہ“ مگر پڑھنے میں ”مطالع“ بروزنِ فَعْلَن آئے گا۔ یہ بات ذہن میں رہنا چاہیے کہ اس لفظ کے اس طرح نظم ہونے سے اس کا اظہار گز نہیں ہو گا۔ ”مصافحہ“ کو بھی اسی پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔

اس قبیل کے چند لفظ اور بھی ہیں، جیسے، قلند، قلنس، رقعہ۔

مولفین تمام اس نے "قلند" کو پہنچے اول و سکون دوم لکھا ہے، اور پہنچے لام کو غلط بتایا ہے۔ بہ لحاظ لغت یہ بالکل صحیح ہے، لیکن بول چال میں یہ لفظ کبیر اول و پہنچے ثانی پر وزن ضلع آتا ہے۔ اس کو بھی صحیح مان لینا چاہیے۔ آصفیہ میں اس کو پہنچے اول و کبیر اول دونوں طرح لکھا گیا ہے اور دونوں صورتوں میں اس کو عربی مانا ہے۔ یہ درست نہیں کبیر اور دو کا اثر ہے۔ اس غلطی کے ذمہ دار اصلاً مولف غیاث اللغات ہیں۔ انہوں نے اس کو پہنچے اول و سکون لام لکھ کر، آخر میں لکھ دیا ہے، "در منتخب کبیر اول"۔ صاحب منتخب اللغات پر یہ اتہام ہے کہ انہوں نے اس لفظ کو کبیر اول ہی لکھا ہے۔ منتخب میں لفظ "قلند" کے ذیل میں فتحی یا کسرے کا مطلق ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اس لفظ کے ذیل میں صرف یہ عبارت ملتی ہے، "قلند"۔ ابر بارہ و غادہ ذکر از غلج ساختہ باشند (مخرب اللغات، طبع احمدی کانپور اشاعت سوم)۔ آصفیہ میں لفظ "قلند" کے ق پر ذر اور زیر دونوں اعراب لگے ہوئے ہیں، مگر اس کے مرکبات (جیسے قلند دار وغیرہ) میں ق پر صرف زیر لگا ہوا ہے، البتہ ق پر ہر جگہ جزم بنا ہوا ہے۔ یہ صورت تلفظ کی پوری طرح نمایندگی نہیں کرتی۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، بول چال میں یہ لفظ کبیر قاف و پہنچے لام بھی آتا ہے اور عام لوگ اسی طرح استعمال کرتے ہیں۔ فلکسیر اور ویلسن نے صحیح طریق اختیار کیا ہے کہ اس لفظ کے اصل اعراب لکھ کر، مزید لکھا کہ مقبول عام تلفظ مانند ہے۔ یہ صحیح صورت ہے۔ نظر میں تو یہ اصل تلفظ کے مطابق آسکتا ہے، آیا بھی ہے، مگر گفتگو میں اس کی پابندی نہیں کی جاسکتی، اس بنا پر اس لفظ کی دونوں صورتوں کو صحیح مان لینا چاہیے، یعنی قلند بروزن فعلن، اور قلند، بروزن فعل۔ ہاں اس کی مراعت کر دی جائے کہ بہت سے لوگ گفتگو میں بھی ق کو مفتوح رکھتے ہیں، یعنی "قلند" بروزن فعل کہتے ہیں۔ مناسب یہ ہو گا کہ اس لفظ کی ان سب صورتوں کو درج اُلفت کر لیا جائے، یعنی قلند، قلند، قلند، قلند (بروزن فعل)۔ اور "قلند" کو عربی سے

مخصوص سمجھا جائے۔

قلع : یہ لفظ بہ لحاظِ اصل بروزِ بنِ فعلن ہے۔ اس طرح نظم بھی کیا گیا ہے، جیسے :
مردی کوئی اڑ سکتے ہیں کُمل جائے ابھی قلعی جو ہم ترکیب دیویں نقرۂ مہتاب کا گنگنا
اتشا (کلامِ اتشا، ص ۲۹)

مری آنکھوں سے اس آئینے کی صورت دیکھ گئی
کُملے کی حُسن کی قلعی جو کوئی تیج میں آیا
آتش (کلیات، ص ۶۲)

مگر بول چال میں بروزِ بنِ فعلن آتا ہے، اور یہی کانوں کو اچھا لگتا ہے۔ اس لفظ کی بھی
ان دونوں صورتوں کو صحیح مان لینا چاہیے۔ ہاں، یہ واضح کر دیا جائے کہ اس کو بول چال
کے مطابق، بروزِ بنِ فعلن نظم بھی کیا گیا ہے :

دیکھ کر خُدا تیرے کی صفا آئنے کی یاں اُکھڑتی ہے قلعی

درد (دیوانِ درد، مکتبہ جامعہ دہلی ص ۲۵)

کیا ہی ٹکڑا ہے وہ کہ جس کے حضور آئنے کی قلعی اُکھڑتی ہے

قائم (دیوانِ مرتضیٰ خورشیدِ اسلام ص ۱۸۵)

رقعہ : اصل کے لحاظ سے یہ بہرِ مَتمِ اول و سکون دوم و رِیح سوم ہے (رُقعہ، اُردو
میں زبانوں پر بہرِ تشدیدِ قاف ہے۔ مولفِ حیاتِ اللغات نے خاص طور پر لکھا ہے کہ،
”مردم از بے التفاتی کہ بہرِ تشدیدِ قات بدولتِ مین خوانند، غلط“ مگر یہ غلطی اُردو میں
قبولِ عام کی سند حاصل کر چکی ہے اور اس حد تک کہ اب اس لفظ کو نُقُت کی رعایت سے
بہرِ سکونِ قاف و رِیح مین بولنا، غلطی کرنا ہے۔ صاحبِ نورِ اللغات نے استعمالِ عام کا احترام
کیا ہے، اصل حرکات لکھ کر مزاحمت کی ہے کہ، ”بول چال میں بیش تر بہرِ تشدیدِ دوم

و حذف عین یعنی رُفد ہے ۔ البتہ صاحب آصفیہ نے استعمال عام سے سروکار نہیں رکھا ہے ، اور وہی عربی کی اصل حرکات و رُج کی ہیں ۔ مصافحہ ، مطالعہ اور قلعہ کی طرح اس لفظ کی بھی دونوں صورتوں کو درجِ لغت رکھنا چاہیے ۔ اطلاق ایک ہے ، ہے گا ، وہ تو کسی صورت میں نہیں بدلے گا ۔ نظرمیں کوئی چاہے تو اصل کی رعایت سے استعمال کر سکتا ہے البتہ گفتگو میں وہی صورت رہے گی جس کی مراحت کی گئی ہے ۔

تعین ۔ تعینات ۔ تعیناتی : تعین اور تعین ، عربی کے دو مصدر ہیں ؛ ان کی جمع تعینات اور تعینات آتی ہے ۔ ان کے انداز پر دو نئے لفظ بن گئے ، تعینات اور تعیناتی ۔ پہلے میرا خیال تھا کہ ”تعینات“ اردو میں بننا ہے ، مگر ہندوستانی فارسی دانوں کی کتابوں میں اس لفظ کا وجود ، اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ لفظ یہاں بہت پہلے بن چکا تھا ۔ دو کتابوں سے مثالیں پیش کی جاتی ہیں ،

”بارودگر اُترا کہ تعینات صوبہ دکن برونڈ“ (جہانگیرنامہ ص ۱۸۳)

”و فرمایاں دستک بنام جمیع منصب داران تعینات آخبر کردند“

(ذخیرۃ الخواص جلد اول ص ۱۴۲)

ان کتابوں میں یہ لفظ بار بار آیا ہے ، مثلاً ذخیرۃ الخواص کی پہلی جلد میں یہ لفظ صفات ۱۵۹ ، ۱۸۵ ، ۱۸۸ ، ۱۹۶ ، ۱۹۹ ، ۲۰۶ ، ۲۲۱ ، ۲۲۳ پر بھی موجود ہے ۔

مولفین ناموس نے لفظ ”تعین“ کے ذیل میں لکھا ہے ، ”اسی سے تعینات

اور تعیناتی بنا لیا ہے جو غلط ہے“ مندرجہ بالا اسناد کی روشنی میں خود یہ قول غلط قرار پاتا ہے ۔ صاحب نور اللغات نے لکھا ہے کہ ، ”اردو میں تعینات بروزن رسیدات ، بمعنی مقرر ، مسلط مستعمل ہے“ مگر عام بول چال میں ”تعینات“ کی ج ، ی سے اس طرح مخلوط ہو جاتی ہے کہ علامہ آواز نہیں دیتی ، اس لیے بروزن

”سیدات“ سے تلفظ کی صحیح طور پر نشان دہی نہیں ہوتی۔ یہ لفظ ”بروزی“ ”خیرات“ بولا جاتا ہے اور یہی صحیح تلفظ ہے۔۔۔ یہی صورت ”تعییناتی“ کی ہے۔۔۔ ان دونوں لفظوں میں بھی آج کا وہی حال ہوا ہے جو رقت، قلعہ اور مطالعہ میں ہوا ہے کہ املا میں وہ موجود ہے، مگر تلفظ میں نمایاں نہیں ہوتا۔

صاحب فرہنگ آصفیہ نے ان دونوں لفظوں کو ”غلط العوام“ میں شامل کیا ہے۔ مولفین قاموس کے اس فیصلے کی طرح مولف آصفیہ کی اس رائے کو بھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ لفظ ”تعیینات“ ہندوستان میں اردو سے پہلے فارسی میں رائج ہو چکا تھا۔ اردو میں بھی خواص و عوام سبھی کا استعمال ہے۔ ”تعیینات“ کی طرح ”تعییناتی“ بھی اردو میں عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے،

”وہ بولے کہ بادشاہ نے خمارے استقبال کے واسطے ہمیں تعینات کیا ہے۔“

میرا تقی (بلخ و بہار و شیراز و دکن فورس ص ۲۴۲)

”اور لڑاکا فوج جنوں اور عفریوں اور پری زادوں کی تعینات کی تے۔“

(..... ص ۲۵۶)

”اور آدمی ہر عہدے کے تعینات ہیں کہ خبر گیری مسافروں کی....“

(..... ص ۱۰)

”بالفعل ان کی تعیناتی تحصیل سانچہ ضلع رہنک میں ہوئی ہے۔“

مولانا حالی (مکاتیب حالی دوم ص ۳۸۵)

صاحب نور اللغات نے لکھا ہے :

”تعیین..... فارسیوں نے ایک ہی تخفیفاً معذن کر کے، بروزین امین

۱۵۔ آج کے شاگرد کلپ سین خاں تاجر نے لکھا ہے، ”اور لفظ تعیناتی بھی غلط ہے۔ بجا ہے اُس کے ”تعیین“ کہنا چاہیے۔“ [تعمین مغل ص ۱۲۳]

کر لیا ہے۔ ملا طغرا :

تقیں گشت ساعت بزم طرب خوشی یافت از حکم اور روز و شب۔

طغرا کا یہ شعر بہارِ طرب میں اس لفظ (تقیں) کی سند میں لکھا گیا ہے۔ نور میں غالباً وہیں سے نقل کیا گیا ہے۔ یہ ہر صورت، فارسی کی طرح اردو میں بھی لفظ ”تقیں“ مستعمل رہا ہے جیسے :

اس صدمے بھلا فائدہ، بخی ہے کہیں یوں جو بات میں کہتا ہوں، وہ کہتے ہیں نہیں یوں
پڑتا تھا کہیں روزوں میں، داستانیہ کیا دل اب عشق آتالیق ہوا اس پر تقیوں یوں
میر حسن (دیوان، ناول کشور پریس ص ۷۵)

مگر اب یہ متروک ہے۔

تبدیلی : ”تبدیل“ بہاے خود مصدر ہے، بہ ظاہر اُس میں مزید یا اسے مصدری کا اضافہ غلط معلوم ہوتا ہے، مگر فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں ایسے متعدّد الفاظ میں یا اسے مصدری کا اضافہ کر لیا گیا ہے، اور یہ لفظ مستقل عام و خاص ہیں۔ جیسے، سلامتی، زیادتی، طغیانی، انگساری وغیرہ۔ ایسے کچھ لفظ فارسی سے بنے آئے اردو کو ملے ہیں، اور کچھ لفظ اردو میں بنائے گئے ہیں۔ ”تبدیل“ سے ”تبدیلی“ بھی اسی طرح بنا ہے۔ آصفیہ و نور دونوں میں اس کو ”غلط العوام“ بتایا گیا ہے اور مولفین قاموس نے بھی اس پر اعتراض کیا ہے : ”تبدیل خود مصدر ہے، اُس پر یا اسے مصدری لگانے کی کیا ضرورت ہے ؟ لیکن اس خطا کی ہمہ گیری کا اونا ثبوت یہ ہے کہ آصفیہ و نور کے مولفین نے خود اس لفظ کو استعمال کیا ہے :

”یہ اخبار سننے میں سب سے اول خاص بیگماتی زبانی میں شائع ہوا اور
دو برس بعد، مالک کی تبدیلی ہو جانے سے ملتوی کر دیا گیا۔“ (آصفیہ، جلد اول، ص ۱۰۲)

”ہل کرنا، اہم ایک دوسرے کی تبدیلی کرنا“ (نور، ہزلی ”تبادلہ“)-

دو چار مثالیں اور پیش کی جاتی ہیں :

بن گیا قطرۂ ناہیز تر تری سے گھر ذات ہے ایک، نقطہ نام کی تبدیلی ہے

آرژو نکھنوی (جہان آرژو ص ۲۳۹)

وضع گدا کو تنگ ہے تبدیلی لباس میں خاکسار ایک ہی چادر میں قید ہے

آرژو نکھنوی (جہان آرژو ص ۹۲)

”تصاری تبدیلی کسی پاس کے خطے یا کم از کم لاہور کی قسمت میں ہو جائے“

حاک (مکتوبات حالی مشرقی خواجہ بکا حسین ص ۳۹)

”حقہ اول کی ترسب میں کچھ تبدیلی ہوئی“ آرژو نکھنوی (مقدمہ نظام آرژو)

”صرف و نحو میں بھی تبدیلی ہو جاتی ہے“ مولوی عبدالحق (مقدمہ باغ دہلوان)

ہاں، یہ لفظ حسین کے لغت میں موجود ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ فارسی جدید میں بھی یہ

مستعمل ہے۔ بہر طور، سلاسی و زیادتی وغیرہ کی طرح ”تبدیلی“ بھی صحیح اور مستقل لفظ ہے۔

جس طرح ”تبدیل“ سے ”تبدیلی“ بنالیا گیا ہے، اُسی طرح ”تبادل“ سے ”تبادلہ“

بنالیا گیا ہے اور یہ لفظ اردو میں مستعمل عام و خاص ہے؛ اور اس حد تک کہ اب اگر

کوئی شخص، لغت کی رعایت سے، اس کے بجائے صحیح یا اصل لفظ ”تبادل“ استعمال

کرے تو کچھ عجیب سا معلوم ہوگا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے :

”لفظ ”تبادلہ“ عربی کے لحاظ سے غلط ہی کیوں نہ ہو، لیکن ہماری زبان میں

صحیح ہے۔ اس کو چھوڑ کر ”مبادلہ“ یا ”تبادل“ بولنا زبردستی ہے.....

”تبدیل“ کے مقابلے میں ”تبدیلی“ غلط ہے، مگر وہ ہمارے ہاں صحیح ہے“

(نقوش سلیمانی ص ۲۲۱)

تبادل، تبادلہ، تبدیلی، تبدل، مبادل؛ سب لفظ کم و بیش مستعمل ہیں اپنے اپنے محل۔

اس سے بحث نہیں کر عری کے لحاظ سے کون سا لفظ صحیح ہے۔ اردو کے لحاظ سے یہ سب لفظ صحیح ہیں۔ ”تبادلہ“ کے معنی میں ”بدلی“ بھی استعمال ہے، جیسے: اُن کی بدلی ہو گئی ہے۔ مکاتیب مالی جلد دوم میں کئی جگہ یہ لفظ آیا ہے (مثلاً صفحات ۲۲۰، ۲۶۶، ۱۳۷)۔
 ”منشی موہن لال کی بدلی دلی کو ہو گئی ہے“ (ص ۲۲۰) یہ بھی اردو کی ایجاد ہے۔

خلاصی: ”خلاص“ میں فارسی والوں نے یا سے مصدری کا اضافہ کر کے، ایک نیا لفظ ”خلاصی“ بنالیا۔ اسناد بہارِ عجم میں مندرج ہیں۔ اردو میں بھی یہ لفظ استعمال رہا ہے اور اس کا شمار مفرس الفاظ میں کیا جائے گا۔ آصفیہ میں اس لفظ سے متعلق درج ذیل عبارت ملتی ہے:

”خلاصی“۔ ۱۔ (۱) ام موث۔ رہائی، نجات، آزادی، رستگاری، چھٹکارا۔ (۲) اسم مذکر۔ توپ خانے یا جہاز کے کارندے۔ خیر استادہ کرنے والے۔ (اس معنی میں لوگ بہ تشدید لام خلاصی بولتے ہیں۔ اول معنی میں بھی غلط مشہور ہے، اگرچہ بعض لوگوں نے اسے ایک قسم کا تصرف فارسیاں قرار دیا ہے، لیکن جس حالت میں ”خلاصی“ خود مصدر ہے تو پھر یا سے مصدر کی نگاہِ خلافِ عقل ہے)۔

مؤلف نے اس کو اردو مانا ہے، حالانکہ یہ مفرس ہے۔ پھر وہ ”خلاصی“ میں یا سے مصدری کے اضافے کو ”خلافِ عقل“ قرار دیتے ہیں اور اس لیے یہ لکھتے پر مجبور ہوئے ہیں کہ ”اول معنی میں بھی غلط مشہور ہے“۔ اس قبیل کے الفاظ سے مؤلف آصفیہ واقعاً خوش نہیں تھے، مثلاً لفظ ”طفیانی“ کے ذیل میں انھوں نے لکھا ہے:

”چونکہ ”طفیانی“ خود مصدر ہے، اس میں یا سے تثنائی مصدری کی ضرورت نہ تھی، مگر اہلِ فارس کا قاعدہ ہے کہ وہ جب تک اس قسم کے مصدریوں میں اپنے

ہاں کی یاے مصدری نہ لگائیں، اُن کو میں نہیں چڑتا۔ چناں چہ فضولی، غلامیٰ

سلامتی سے ظاہر ہے۔ پس اس کو فارسی صورت میں خیال کرنا چاہیے ۛ

یہ دراصل ایک طرح کا تذبذب ہے کہ چون کہ فارسی والوں نے یاے مصدری زائد کا اضافہ

کیا ہے؛ اس لیے غلط تو کہ نہیں سکتے، مگر یہ اضافہ خلاف عقل ۛ بھی معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال

اب ایسے سب الفاظ کو بالکل صحیح الفاظ میں شمار کیا جائے گا۔ تبدیل، طغیانی، غلامیٰ

سلامتی، زیادتی، انکساری جیسے لفظ اسی ذیل میں آتے ہیں۔ ”غلامیٰ“ ربائی، آذلوئی

اور نجات کے مفہام میں مفرس ہے اور جہاد پر یا رمل وغیرہ پر کام کرنے والوں کے معنی کیا

اردو نژاد ہے۔ اسی تفریق کے ساتھ اس کو درج لغت کیا جائے گا۔

اس قبیل کے کچھ اور لفظ بھی ہیں، جیسے، پابوسی، تقدی، انکساری، طغیانی۔

پابوسی : ”پابوسی۔ غلط۔ اس میں یی زائد ہے۔ پابوسی حامل مصدر کا

بھروسہ پر یاے مصدری زائد کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اُردو میں قدم پوس

پابوس کہنا صحیح ہے۔ پابوس کو فارسی والے پای بوس کہتے ہیں“ (قاموس)

”غلامیٰ“ کی طرح ”پابوسی“ بھی فارسی سے بنا بنا یا اُردو کو ملا ہے۔ تفصیل بہارِ بھجم میں

موجود ہے۔ فارسی میں صرف ”پای بوس“ مستعمل نہیں، جیسا کہ مولفین کی تحریر سے متبادر

ہوتا ہے۔ وہاں پابوس، پای بوس، پای بوسی، پابوسی؛ چاروں صورتیں ملتی ہیں۔

بہارِ بھجم سے سند کے شعر نقل کیے جاتے ہیں جن سے ان چاروں صورتوں کا مستعمل ہونا معلوم

ہوگا :

پای بوس تو دست از حیات خود شستم

نثار جو ہر جان است ساقی سیمیں را

(نغانی)

ادای ذوقِ پابوسی ہمیں بس کہ رنگِ نامہ شوقِ حنائی است
(مقید لجنی)

جزا شکِ خود مقید ز کس رنگِ ندید ہر چند پایِ بوسی اہلِ زمانہ کرد
(مقید لجنی)

دہم میسوی چوں معطر شدہ بپا بوسی دودِ مہر شدہ
(ملقرا)

آب از پیرِ سرِ قدرتِ می آید از فرسنگھا در حضرتِ پابوسی تو سری زند بر سنگھا
(جامی)

اردو میں "پابوسی" بہ کثرت مستعمل ہے۔ مولف نور نے اس لفظ کو فارسی لکھا ہے، مگر یہ بھی لکھ دیا ہے کہ "اس جگہ پابوس فیصح ہے" اصل میں شوقِ غیور نے اپنے رسالے اصلاح میں "پابوسی" کو مترادفات کے ذیل میں شامل کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

"پابوسی بہ زیادت یاہ انتشار کی طرح یہ بھی غیر فصیح ٹھہرا ہوا ہے" (ص ۱۳)۔

مولف نور نے غالباً اُسی کے زیر اثر "پابوسی" کو غیر فصیح فرض کر لیا ہے۔ لیکن یہ درست نہیں۔ اساتذہ نے اس لفظ کو استعمال کیا ہے، اور آج کل تو قدم بوس، دست بوس اور پابوس کے مقابلے میں، قدم بوسی، دست بوسی اور پابوسی زیادہ مستعمل ہیں۔ لطیف یہ ہے کہ مولف نور نے "دست بوسی" اور "قدم بوسی" کو غیر فصیح نہیں لکھا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ دونوں لفظ رسالہ اصلاح میں بھی موجود نہیں۔ ذیل میں ان الفاظ کے استعمال کی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

نہ کرتے اُس کی ہر رنگِ منا جو پابوسی تو شکلِ برگِ حنائیوں پسا دے کرتے ہم

موسس (دیوانِ مرثیہ ضیاء احمد بدایونی ص ۱۲۳)

دست بوسی پر کرو پاں قتل اپنے ہاتھ سے کچ تو کہتے ہیں، قبول انصاف فیروں کا ہیں

(۱۳۳ء ص ۱۳۳)

تیری پا بوسی سے اپنی خاک بھی پا بوس ہے نقش پا پر نقش پا، ظالم کفِ انوس ہے

(۱۹۳ء ص ۱۹۳)

سر ترے کٹھنے کا دیکھے گا نہ ہر گز روئے خاک لے اڑے گا شوقِ پا بوسی اُسے جلاؤ کا

ذوق (دیوان مرتبہ آزاد ص ۶۲)

دست و بازو کے تصور میں ہوا آتش میں قتل پاے بوسی کی ہوس نے خاک کے یکساں کیا

آتش (کلیات ذیل شور پر ص ۷)

رنگ جو جو کچھ کر چاہیں لائیں بن میں آبلے پاے بوسی کو ترستے تھے وطن میں آبلے

(۲۳۵ء ص ۲۳۵)

لو مبارک ہو قدم بوسی حضرت حسن کس کو ہوتی ہے نصیب ایسی سعادت حسن

حسن کاکوروی (کلیات نصیب حسن ص ۱۱)

وہ استخارِ خضر جو پہنچا مسیاں آب دوڑے حباب بہر قدم بوسی جناب

شادِ عظیم آبادی (امرائی شاد، اول ص ۶۷)

جان کر سوتا تجھے، وہ قصیدِ پا بوسی مرا اور ترا شکرا کے سر وہ سکرانا یاد ہے

مست ہوانی (کلیات طبع لاہور ص ۱۱)

وہ خوابِ ناز میں تھے اور تھے لے شوقِ پا بوسی نہ بھی سستی بہت تری، اس لطفِ ایسا کو

(۲۸ء ص ۲۸)

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، اردو میں آج کل "قدم بوس" وغیرہ کے بجائے "قدم بوسی"

وغیرہ ہی زیادہ مستعمل ہیں۔ قدم بوس، پا بوس، دست بوس؛ ترکیبِ فارسی میں آئیں

تو دوسری بات ہے، درنہ مفرد صورت میں یہ کچھ اجنبی سے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً

دآغ کا یہ قلعہ دیکھیے !

قدم بوس حضرت کا حاصل ہوا بڑے شوق سے اور ارباب سے

حضور کی تاریخ پوچھیں اگر یہ کہ دو، طے دآغ سلطان سے

(دآغ - مصنفہ، تنکین کاظمی ص ۱۰۱)

اس میں لفظ "قدم بوس" بالکل صحیح اور قطعاً فصیح ہونے کے باوصف، اب کچھ اجنبی سا لگتا ہے۔

قدیمی : عربی کے لفظ "قدیم" میں یا سے مصدری کا اضافہ کر لیا گیا ہے۔

صاحب خیاث اللغات نے اس کو نارست قرار دیا ہے : "در آخر این لفظ زیادست یا

خطا باشد، چنانکہ در زیادتی و بیدیدی سے مؤلفین قاموس نے بھی اس لفظ کو غلط بتایا

ہے : "قدیمی" عربی میں قدیم ہے۔ چون کہ صفت ہے، اس لیے یا محض غلط ہے۔

آج کل فارسی میں یہ لفظ مستعمل ہے۔ مجیم نے اس کو اپنے لغت میں درج کیا ہے،

اور مثال میں یہ فقرہ لکھا ہے : "او دوست قدیمی من است" بعض اور مثالیں :

"کلمات و تعمیرات قدیمی عصر شاعر پاک در عصر ایشان و محیر فر مغیر یا غیر مانوس شد"

(دیباچہ دیوان حافظ، مرتبہ ترقی و قاسم فنی، ص ۱۷)

"مانیا اینکود نسخ قدیمی معاصر یا بسیار قریب العصر یا خود شاعر" (ص ۱۷)

"و آئیم نسخ بسیار قدیمی نزدیک بعض حافظ است" (ص ۱۷)

"و از روی اصح صورت پذیرفته است، و از روی قدیمی ترین نسخ موجودہ

در دیوان ہے (دیباچہ دیوان حافظ، مرتبہ ۱، پایادار)

"بابروس، نام قدیمی بابل است" (فرہنگ نوہار ص ۸۲)

ہندستان کے فارسی مصنفین نے بھی اس لفظ کو بے تکلف استعمال کیا ہے۔ صرف ایک مثال

پر اکتفا کرتا ہوں :

”در اشنای راه پر تو آب سید حسن علی خاں کہ با ایشان تعارف قدیمی داشت،
برخورد“ (مجموعہ فنون، ص ۱۱۶)۔

اُردو میں تو اس کو بالعموم استعمال کیا گیا ہے۔ چند مثالیں :

مردن پر تری دل کو جو ہے حاج کی سوچی تشبیہ قدیمی ہے نہیں آج کی سوچی
بحکم قدمت الشرفا تم (تذکرہ سرور)

نک اس طرف تو دیکھو آنکھیں ملا کے حساب ہم سے قدیمی بندے، شایستہ ستم ہوں
انشا (کلام انشا، ص ۱۵۰)

رنگ ہے سرکار عالی میں قدیمی جاں نثار کب اُسے غلعت میں شیر و سپر ملی نہیں
رنگد (دیوان نولی کشور پر، ص ۱۸۳)

”اگرچہ یہ مصرع قدیمی میاں تہذوب کا ہے“ (آب حیات، ترجمہ ذوق)
”ہندستان کے قدیمی ہمدیں جب سنسکرت زندہ زبان مانی جاتی تھی“

احسن مارہروی (تاریخ نثر اُردو، ص ۳)

”اچھے ماہوں صاحب قبلہ جو میرے قدیمی عنایت فرما اور حسن زادے ہیں“
تغیر شکوہ آبادی (تاریخ نثر اُردو، ص ۵۳۳)

آصفیہ و نور دونوں میں یہ لفظ موجود ہے۔ رچرڈسن اور فوربس نے ”قدیمی“ کو عربی
لکھا ہے، اور جانتسن نے ”قدیمی“ پر یاے مشدد کو عربی بتایا ہے۔ اس کا غیر صحیح ہونا
میاں ہے۔ ہاں، میں اس وقت یہ کہنے سے قاصر ہوں کہ یہ لفظ فارسی قدیم میں ہے
یا نہیں۔

انکساری، آصفیہ، نور، امیر اللغات، سرمایہ زبان اُردو، ان
میں سے کسی لغت میں یہ لفظ موجود نہیں۔ یہ ”انکسار“ کا مزید طبع ہے، اور قدیمی

غلامی و پابوسی (دخرو) کی طرح مستعل ہے اور یہ لفظ بھی اُسی طرح بنا ہے جس طرح یہ سب لفظ بنے ہیں۔ مولفین قاموس نے اس لفظ کو بھی غلط بتایا ہے۔ آخر لکھنوی مرحوم نے بھی اسی رائے کا اظہار کیا تھا (الکھرا - لاہور - جنوری ۱۹۵۷ء)۔

”طغیانی“ اور ”غلامی“ کی طرح ”اکھساری“ بھی اردو میں قبولِ عام کی سند پا چکا ہے اور اب یہ لفظ بھی ایسے دوسرے الفاظ کی طرح بالکل صحیح ہے اور اسے لغت میں باقاعدہ جگہ ملنا چاہیے۔

اندازا۔ نمونشا، آملیہ، نور، امیرالغلات؛ کس میں بھی یہ لفظ موجود نہیں۔
 ”انداز“ (یا اندازہ) فارسی کا لفظ ہے، قاعدے کے لحاظ سے اس پر تنوین نہیں آنا چاہیے؛ غالباً اسی بنا پر ان لغات میں اس لفظ نے جگہ نہیں پائی۔ مولفین قاموس نے تو اس لفظ کو غلط ہی بتایا ہے،

”اندازا، غلط ہے۔ عربی ماں اسما ب نے ”اندازہ“ سے ”اندازا“ بنایا ہے۔ اس کی جگہ ”تحینا“ کا لفظ موجود ہے، جو صحیح ہے۔ ”اندازا“ کی طرح ”نمونشا“ بھی کہتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ تنوین، عربی الفاظ پر آتی ہے، نہ فارسی الفاظ پر“ (قاموس)۔

راستے میں کوئی صاحبِ طبع اور دقت پر ہمیں؛ گھڑی پاس نہ ہو اور آپ اُن سے کہیں کہ ”تحینا“ دُرُجھ ہوں گے۔ تو یقین کیجیے کہ وہ صاحب اگر زبان سے کچھ نسبت رکھتے ہوں گے تو اپنا سوال بھول کر اس ”تحینا“ پر آپ کا منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔ — مولفین نے ”اندازا“ کی جگہ تو ”تحینا“ بولنے کی فرمائش کی ہے، مگر یہ نہیں بتایا کہ ”نمونشا“ کی جگہ کیا کہیں؟ اگر اردو کوئی زبان ہے تو پھر ان الفاظ کے غلط ہونے کا کیا سوال! یہ دونوں لفظ عام طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔

پیش نے "اندازا" کو فارسی لکھا ہے، مگر یہ اُردو نثر ادا ہے۔ رچرڈسن، جانسن اور کسپیئر نے "اندازا" بغیر تنزین لکھ کر، اس کے معنی *Measurement* لکھے ہیں۔ غالباً یہ لوگ اس کو فارسی کے مصدر "انداختن" کے مشتق کوئی نیا لفظ سمجھے ہیں۔ فارسی میں "انداختن" اور "اندازه" ضرور ہیں، "اندازا" کوئی لفظ نہیں۔

آصفیہ و نوری میں "نمونشا" بھی موجود نہیں۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان لفظ کا کوئی معنی نے "اندازا" کی طرح "نمونشا" کو بھی ناقابل قبول قرار دیا ہے۔ یہ دونوں لفظ چون کہ اُردو میں مستعمل ہیں اور بہ کثرت، اس لیے اب ان کو بھی لغت میں مناسب طور پر درج کرنا چاہیے۔ اُردو کے لحاظ سے یہ دونوں صحیح لفظ ہیں۔

آزردگی : مولفین تانوس نے اس لفظ کو صرف پہنچ ڈا لکھا ہے (آزردگی) نوری میں بھی "آزردہ" اور "آزردگی" کو پہنچ دوم لکھا گیا ہے۔ امیر اللغات میں بھی "آزردہ" کی تہ پر زبر لگا ہوا ہے (آزردہ)۔ اس میں "آزردگی" موجود نہیں۔ فارسی کے قدیم لغات میں بھی عموماً اس کو پہنچ ڈا لکھا گیا ہے۔ بعض لغات میں یہ مراد بھی کوئی گئی ہے کہ پہنچ ڈا غلط ہے۔ مثلاً :

"آزردن، پہنچ ڈا... پہنچ ڈا غلط است، چرا کہ تنقیذ آزاریدن است۔

از کشف : (توضیح الفضل)۔

لیکن فارسی کے بعض جدید لغات میں اس کو پہنچ ڈا لکھا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو فرہنگ امیر کبیر اور سلیمان صمیم کا لغت۔ صمیم نے "آزاریدن" اور "آزارون" کی اصل "آزردن" کو بتایا ہے۔ اُردو میں آزارون، آزرده، آزرودگی، سب لفظ پہنچ ڈا بولے جاتے ہیں۔ پہنچ دوم بولے تو اجنبیت کا احساس ہوگا۔ مثلاً اس مصرعے میں، "رات آزرده ہوا یا رجمے نوشی میں" آزرده کو پہنچ ڈا بڑھے تو محسوس ہوگا کہ مصرعے کا سارا لطف تباہ ہو گیا۔ بل کہ یہ خیال ہوگا کہ

یہ کوئی نیا لفظ نہیں ہے آگیا ہے۔ مولانا اسحق مارہروی نے لکھا ہے ،
 ”آزردہ ، لُغت میں بہشتِ ذائے مجرہ ہے ، مگر پڑھے لکھے لوگ پیش سے بولتے
 ہیں ۛ (تاریخِ نثرِ اُردو ، ص ۲۵۶)۔

آصفیہ میں بھی ”آزردگی“ اور ”آزردہ“ کی ذہ پر پیش لگا ہوا ہے۔ اب اُردو لغات میں ان لفظوں کو صرف
 بہشتِ ذَا لکھنا چاہیے۔ بہشتِ ذَا کو فارسی سے مخصوص سمجھنا چاہیے۔

عربی کے کئی ایسے لفظ ہیں جو اصلاً بہ یائے مشدود ہیں ، مگر اُردو میں ان کو بہ یائے
 مشدود بہ یائے منفی ، دونوں طرح استعمال کیا جاتا ہے ، اس فرق کے ساتھ کہ بول چال
 میں تو یہ لفظ تشدید کے بغیر ہی آتے ہیں اور تحریر میں (خاص طور پر نظم میں) ان کی دونوں
 صورتیں ملتی ہیں۔ ان میں کیفیت ، خاصیت ، نیت ، حیثیت ، انسانیت ، ماہیت
 خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

”خاصیت - ع - موثف - بہ تشدید مَادِ مَكْسُورِ دِیائے مفتوح اُردو
 میں صرف بہ تشدید دِیائے مفتوح مستعمل ہے “ (خانمکس)۔

آصفیہ میں بھی ”خاصیت“ لکھا ہوا ہے اور مولف نے اس کے ذیل میں اس طرح کی کوئی
 ملاحظہ نہیں کی ہے کہ یہ لفظ بہ یائے منفی بھی آتا ہے۔ فارسی میں اس کو عربی کے مطابق
 بہ یائے مشدود اور تقریباً کے ساتھ بہ تخفیف یا بھی استعمال کیا گیا ہے (پہا رجم)۔ اُردو
 میں بھی یہی صورت ہے کہ اس لفظ کو دونوں طرح استعمال کیا گیا ہے اور استعمال کیا جاتا
 ہے۔ البتہ یہ تفریق ملحوظ رہنا چاہیے کہ نظم میں تو اس کو دونوں طرح استعمال کیا گیا ہے اور
 استعمال کیا جاتا ہے) مثلاً ،

عہد میں تیرے عجب کیا ہر داغِ دل شمع شعلے میں مرہم کا فور کی ہو خاصیت

ذوق (دیوانِ مرثیہ آزاد ، ص ۲۱۸)

سرگشتیں زمزمی شن کر اچٹتی ہے نیند
خاصیت یہ ہے مری جان ابن انسانوں کی
تیر اکلیات، مرتبہ آسمی، ص ۱۴۹

خاصیت سیما کی ہے اس تمے بے تاب میں
جل کے خاکستر گرہوں تو بھی میں اکسیر ہوں
احسان دہوی (تذکرہ سرور)

مگر بول چال میں عموماً یہ یاے منف ہی آتا ہے۔ رہزوسن نے اپنے لغت میں، خاصیت کے
ذیل میں، ایک مصدر جعل "خاصیدن" بھی لکھا ہے، لیکن توہین میں "مشکوک" بھی لکھ دیا ہے
فارسی میں "خاصیدن" کوئی مصدر نہیں۔

"انسانیت" عربی میں یہ یاے مشدود ہے (الانسان)۔ فارسی میں بھی عموماً یہ یاے مشدود
استعمال کیا گیا ہے، لیکن اردو میں بول چال کی حد تک یہ صرف یہ یاے منف مستقل ہے نظم میں
ضرورتاً یہ یاے مشدود آ سکتا ہے اور یہ محض مجبوری کا سودا ہوگا۔ قاسم میں اس کو صرف
یہ یاے مشدود لکھا گیا ہے۔ آصفیہ، نور اور امیر اللغات میں اس لفظ پر تشدید نہیں ملتی۔
مولفین نے اس سلسلے میں مراحت بھی نہیں کی ہے، حالانکہ یہ ضروری بات تھی۔ امیر اللغات
میں یہ فقرہ بطور مثال درج ہے، "آدمی ہوا، ذرا انسانیت سیکھو، یہ کیا بد تہذیبی ہے۔"
یہی فقرہ نور میں منقول ہے؛ عربی یا فارسی کی رعایت سے اس فقرے میں "انسانیت" کو
یہ یاے مشدود پڑھ کر دیکھیے، سارا آئسن خاک میں مل جائیگا۔ ہاں، آصفیہ و نور میں "انسانیت"
کو عربی لکھا گیا ہے۔ یہ ذرا مبہم صورت ہے۔ یہ مراحت ضروری تھی کہ عربی میں "آسی"
مشدود ہے اور یہ تخفیف اردو کا اثر ہے۔ بعض مثالیں بھی پیش کی جاتی ہیں،

انسانیت ہے ان میں، نہ تہذیب کا ہتمام
دیں کے لیے ہے جنگ، تو باجوں کا کیا ہے کام
نثار و عظیم آبادی (مرثیہ شاد، ص ۱۴۹)

لے جیسے، بس کہ اسے نور نہیں، جموں میں ہے انسانیت
مشق سون تیرے ضم صورت انسان ہوا (دلی)

محبت محض ہی کمزور ہے تو پھر پابندیاں کیسی حد انسانیت تک آدمی مجبور رہتا ہے
آرزو لکھنوی (جہان آرزو ص ۱۸۲)

خطا تھی تو کب قابلِ درگزر تھی یہ انسانیت کی کر انسان جانا
(ص ۳۷)

اسی قبیل کا ایک لفظ ہے، " آدمیت "۔ یہ بھی اصلاً بریائے مشدود ہے، لیکن اردو میں دونوں طرح مستقل ہے۔ اس لفظ کی دونوں صورتوں کو یک ساں طور پر مستقل مان لینا چاہیے۔ آصفیہ، نور اور امیر اللغات میں یہ لفظ صرف بریائے مشدود لکھا ہے۔ لفظ " انسانیت " میں اور اس لفظ میں یہ فرق ضرور ملحوظ رہنا چاہیے کہ " انسانیت " بریائے مشدود، بول چال میں نہیں آتا، لیکن " آدمیت " گفتگو میں دونوں طرح مستقل ہے۔ شاد عظیم آبادی نے فکرِ بیخ میں " آدمیت " بریائے منف کو تصرفاتِ جائز کی مثال میں پیش کیا ہے (ص ۵۲)۔

" حر " عربی کا لفظ ہے، اس میں " یت " کا اضافہ کر کے " حریت " بتایا گیا ہے، اور غالباً یہ اردو والوں کی کارگزاری ہے۔ ایسے اور الفاظ کے قیاس پر اس لفظ کو بھی دونوں طرح استعمال کیا گیا ہے، مثلاً،

کبھی ہمت تھی مری قاعدہ صرف میں صرف کبھی تھی خمی نہیں ہر خوب مجھے حریت
ذوق (دیوانِ مرتضیٰ آدائو ص ۳۱۱)

گم شدہ کی جستجو میں حریت کی حد پہنچ سانسے جو شے نظر آئی، اُسے دل کہہ دیا
آرزو لکھنوی (جہان آرزو ص ۵۱)

منزل الفت میں اپنی حریت کے میں شمار مجھ کو ہر وہ روپ، تیری شکل کا دھوکا ہوا
عزیز لکھنوی (انجم کدہ ص ۴۲)

آصفیہ میں " حریت " صرف بریائے مشدود لکھا ہوا ہے اور اس کو عربی بتایا گیا ہے۔ نور میں

بھی صرف یہ آئے مثلاً ہے، مگر مولف نے یہ مراحت ضرور کر دی ہے کہ ”ہندستانیوں نے ”مو“ سے مصدر بنالیا ہے۔“ اس لفظ کی بھی دونوں صورتیں قابل قبول ہیں۔

جلیل نامک پوری (تمیذاتِ مرثیائی) نے ایک خط میں لکھا ہے،

”ملکیت بہ تخفیف یا، روز مرہ کی بول چال ہے۔ اگر بہ تشدید یا بھی استعمال کیا

ہلے تو جائز ہوگا، جیسے، ماہیت، خاصیت، کیفیت وغیرہ، اگر یہ بہ تخفیف یا

صحیح ہیں، اور کبھی بہ تشدید یا بھی ان کا استعمال کیا جاتا ہے۔“

(مکتوب جلیل، رسالہ الحمرا، لاہور، نومبر ۱۹۵۳ء)

جلیل نے یہ تو بالکل سہم لکھا ہے کہ ”ملکیت“ بہ تخفیف یا، روز مرہ کی بول چال ہے، مگر ان کا یہ لکھنا کہ ماہیت، خاصیت، کیفیت ”بہ تخفیف یا صحیح ہیں“ اس اعتبار سے درست نہیں کہ اصطلاح لفظ بہ تشدید یا ہیں اور صرف کے سبب بہ تخفیف مستقل ہیں۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، ایسے لفظوں کی دونوں صورتوں کو صحیح مانا جائے گا۔

اُردو میں ایسے بہت سے لفظ مستقل ہیں جو ”گی“ کے لاحقے کے ساتھ حاصل ہو۔ مد کا فائدہ دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو قاعدے کے مطابق بنتے ہیں اور بعض خلاف قاعدہ۔ قاعدہ تو یہ ہے کہ لفظ کے آخر میں آئے متغی ہو تو ”گی“ کا لاحقہ آئے گا، جیسے غنچے سے غنچگی اور تشنہ سے تشنگی اور بے چارہ سے بے چارگی اور آوارہ سے آوارگی۔ اگر لفظ کے آخر میں الف ہوگا تو ”فی“ کا اضافہ کیا جائے گا، جیسے گدا سے گدائی، اور فضا سے فضا فی۔ جس طرح بہت سے قاعدوں کی حدیں نہیں نکھیں ٹوٹ ہی جایا کرتی ہیں، وہی حال اس قاعدے کا ہوا، اور کئی لفظ خلاف قاعدہ بن گئے۔ جیسے ”ادا“ سے قاعدے کے مطابق ”ادائی“ بننا چاہیے، بنا بھی ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک خلاف قاعدہ صورت ”ادائیگی“ بھی وجود میں آگئی۔ مولفین قانوس نے لکھا ہے،

آگیا ہے۔ صاحب نور اللغات نے "ناراضی" کے ذیل میں لکھا ہے : "عام عورتیں ناراضگی" بولتی ہیں۔ اور مثال میں جان صاحب کا شعر لکھا ہے :

ناراضگی سے جاتی ہو، ہوگا نہ حج قبول

ماں زار زار روتی ہے، اور زار زار باپ

عام عورتوں کی تخصیص درست نہیں، "خاص عورتیں" بھی بولتی ہیں اور مرد بھی بولتے ہیں۔
 داغ کا منقولہ بالا جملہ سند کے لیے کافی ہے۔ ایسے لفظوں کو دونوں طرح مسیح اور نصیح ماننا چاہیے۔ "ناراضگی" کی طرح "دستگی" بھی خلاف قاعدہ بنا ہے اور اب "دستی" اور "دستگی" دونوں لفظ استعمال میں آتے ہیں۔ نور و آصفیہ میں صرف "دستی" ہے۔ "دستگی" موجود نہیں۔

(۳) ایسے لفظ جن کو دونوں طرح استعمال کیا گیا ہے، مگر اب ان کی خلاف قاعدہ صورت ہی استعمال عام میں نظر آتی ہے اور باقاعدہ صورت، کتابوں میں محفوظ ہو کر رہ گئی ہے، جیسے، "کرفت" سے "کرختگی"۔ "کرفت" سے قاعدے کے مطابق تو "کرفتگی" بنے گا، جیسے "سنت" سے "سختی"۔ نور میں واجد علی شاہ کا شعر سندا لکھا گیا ہے،
 وہ چھاتیوں کی غضب تھی سختی کب سبب میں ایسی ہے کرفتگی

لیکن یہ باضابطہ بنایا گیا لفظ، اب قبول عام کی سند سے غالی ہاتھ نظر آتا ہے، اور اس کی جگہ "کرختگی" نے لے لی ہے۔ مثلاً مولوی عبدالقی صاحب کے اس جملے میں،

"اصل الفاظ میں جو بہتدہا ہیں اور کرختگی اور تلفظ اور لہجے کی دقت تھی، بالکل

جاتی رہی" (قواعد اردو، ص ۲)

اس لفظ "کرختگی" کی جگہ پر "کرفتگی" لکھ کر دیکھیے ! لکھنے والے پر تازہ وارد ہوئے کا شبہ کیا جائے گا۔ "ادائی" کتابوں میں کہیں کہیں نظر آ جاتا ہے۔ یاد پڑتا ہے کہ مولانا قاسم علی خان کے دیوان میں بھی ایک جگہ آیا ہے ! لیکن "کرفتگی" کی طرح اب ابھنی معلوم ہوتا ہے۔

سرایہ زبان اردو، امیر اللغات، آصفیہ اور نور میں "د" "ادائی" ہے، "د" "ادائیگی"۔

نور میں "کرتی" اور "کرتگی" دونوں لفظ موجود ہیں، البتہ آصفیہ میں "کرتی" موجود نہیں، صرف "کرتگی" ہے۔ یہاں اس بحث سے قطع نظر کرتا ہوں کہ ان میں سے کون کون سے لفظ فارسی میں بھی موجود ہیں۔

سُجَبَہ : اصل لفظ "سُجَبَہ" (بروزی نقطہ ہے۔ فارسی میں: تعریف ہمارا ایک ہا ساقط ہوگئی اور ب پر زبر آگیا، یعنی "سُجَبَہ" بروزی کلمہ ہو گیا۔ البتہ مع تعریف محکم استعمال کیا گیا ہے۔ اس تعریف کا اظہار صاحب ہمارے مجملے نے کیا ہے :

"سُجَبَہ بقیعہ اول و سنج سوم۔۔۔۔۔ و فارسیان بقیعہ دوم و اسے لفظ نیز کہتے ہیں چاہی :"

بہان است غروب آفتاب را ہر شام مرج با تو گچم کزیت شک و سُجَبَہ
چو آسمان بسوی قصر شاہ کرد نظر ز نقش زسیر آسمان فتاد کلمہ :
اُردو میں صورت یہ ہے کہ بول پال کی مدد سے "سُجَبَہ" ہی مستعمل ہے، "سُجَبَہ" کوئی نہیں بولتا۔ البتہ نظم میں کلمہ اصل کے مطابق "سُجَبَہ" استعمال کیا گیا ہے۔ آتش نے ایک شعر میں "سُجَبَہ" (یہ سکون حرف دوم) بھی باندھا ہے :

خیر یہ کلام کا بھی مزہ بھولتا نہیں خیر و شکر سے ہے یہ بلا سُجَبَہ و شک لذیذ
(کلیات نول کشور پریس، ص ۸۲)

حلف کی صورت میں یہ نہایت مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح اصل لفظ کے ساتھ ساتھ، اردو میں "سُجَبَہ" اور "سُجَبَہ" بھی مستعمل ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ گفتگو کی مدد سے "سُجَبَہ" ہی سننے میں آتا ہے۔ مختصر یہ کہ اردو میں اب اس لفظ کی تین صورتیں ماننی جائیں گی : سُجَبَہ، سُجَبَہ، سُجَبَہ۔ اس کی جمیع "شہادت" (یہ سکون و شک) مستعمل ہے۔

مولفین کا موس نے لکھا ہے :

”شبیہ بروزنی گئے کہنا غلط ہے۔ ”شبیہ“ بروزنی لفظ کہنا صحیح ہے۔

شبیہ کی جمع شبہات بھمتیں ہے۔

دونوں باتیں قابل قبول نہیں۔ اردو کی بول چال میں صرف ”شبیہ“ مستعمل ہے۔ اگر کوئی بد ذوق شخص، عربی کی رعایت سے، گفتگو میں ”شبیہ“ لے آئے تو بات چیت کی بے ساختگی اور جس، دونوں پر حرف آجائے گا۔ یہی صورت ”شبہات“ کی ہے۔ عربی میں جو بھی صورت ہو، اردو میں یہ لفظ صرف پر سکونی دوم (شبہات) مستعمل ہے۔

تو ر و آصفیہ میں بڑی بہم صورت ہے۔ آصفیہ میں ”شبیہ، شبہ کرنا، شبہ مٹانا، شبہ ہونا“ چھپے ہوئے ملتے ہیں، مگر سندا آنا سح کا جو شعر پیش کیا گیا ہے، اُس میں ”شبیہ“ نظم ہوا ہے۔ ”شبیہ“ کے سامنے قوسین میں (ع) لکھا ہوا ہے۔ ان دونوں باتوں سے یہ ظاہر یہ متبادر ہوتا ہے کہ شاید یہاں پر کتابت کی غلطی ہے کہ ہر جگہ ”شبیہ“ کی بجائے ”شبیہ“ لکھ دیا گیا ہے مگر غلط نامے میں اس کا کچھ ذکر نہیں ملتا۔ مولف نے اس لفظ کے متعلق کس طرح کی وضاحت بھی نہیں کی ہے، نہ تصرّف کا ذکر کیا ہے۔ یہ واقعاً الجھن میں ڈالنے والی صورت ہے۔

تو ر میں بالکل دوسری صورت ہے۔ وہ بھی پریشان کن ہے۔ مولف نے اصل لفظ ”شبیہ“ لکھ کر، فارسی کے تصرّف کا ذکر کیا ہے :

”فارسی شعرانے شبہ پنجم اول و شیع دوم و سکون ہائے مفعولہ بروزنی نظم بھی

کہا ہے۔

اس کے بعد اردو کے جتنے شعر مثلاً لکھے ہیں، اُن میں ”شبیہ“ ہی نظم ہوا ہے۔ اس لیے یہ احتمال پیدا ہو سکتا ہے کہ مولف نے فارسی کے جس تصرّف کا ذکر کیا ہے، وہ فارسی تک محدود رہا، اور اردو میں اس نے بار نہیں پایا۔ اس طرح کی کوئی مراعت نہیں

ملتی کہ اردو میں یہ لفظ تصرف کے ساتھ بھی متصل ہے۔ اسی طرح مولف نے اس کی جمع ”شہات“ کے اعراب کا مطلق ذکر نہیں کیا ہے، یعنی یہ کہ یہ بہ ختم دوم ہے یا بہ سکون دوم۔

خرج۔ خراج : مولفین تائوسس نے ”خرج“ کو بہجم تازی ”خرج“ لکھا ہے اور سند فارسی کے کئی شعر پیش کیے ہیں، جن میں یہ لفظ ”درج“ وغیرہ کا ہم تانیہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ فارسی میں (اصل کے مطابق) ”خرج“ ہی ہے، مگر اردو میں اس نے رواج عام نہیں پایا۔ اس کے بجائے ”خرج“ نے قبول عام کی سند پائی۔ اردو کے بعض شعرا نے اس کو بہ ضرورت تانیہ (فارسی کی رعایت سے) بہجم تازی نظم کیا ہے، لیکن اس ضرورت شعری کو استعمال عام سے کوئی علاوہ نہیں۔ عام طور پر گفتگو اور تحریر دونوں میں ”خرج“ ہی آتا ہے۔ اردو میں اس سے خرچا، خرچہ وغیرہ بھی بن گئے ہیں۔ توڑ میں صحیح طور پر اس کو ”خرج“ لکھا گیا ہے۔

”خرج“ کی جمع ”اخراجات“ مستعمل ہے۔ اس میں اصل لفظ کا جیم باقی رہا ہے۔ آصفیہ و نور میں ”اخراجات“ موجود ہے، مگر اس کو عربی بتایا گیا ہے۔ یہ درست نہیں۔ یہ (غالبا) ہندوستانی ایجاد ہے۔ ”اخراجات“ کے ذیل میں سند ان دونوں لغات میں موجود نہیں، اس لیے دو تین سندیں لکھی جاتی ہیں :

”ہم نے کس کس جاں کا ہی، جاں نشانی اور اخراجات کی برداشت کر کے“
(مقتدرہ نرنگ آصفیہ، جلد اول، طبع دوم)

”ان سب اخراجات کا بار غلام کے سر تھا“ مرزا آسوا۔

(امراہان ادا، مکتبہ شاہراہ دہلی، ص ۱۳۹)

”معمولی گفتگو کے بعد، تعین اخراجات ہو کر“

(ص ۱۵۶)

ہاں، متعلقہ شعر کے دو ابویں میں ایسی غزلیں موجود ہیں جن کی ردیف ”خرج“ ہے اور یہ غزلیں حرف ح کی ردیف میں ملتی ہیں۔ خلا ۱

ذفقروں کے جان داہی خرج ۱ اے میاں، ان کے ہیں الہی خرج
انت (کلام انشا، ص ۶۹)

رو الفت میں نقد عمر کر خرج کہیں ہر چند مسک تجھ کو زر خرج
آتش کلیات (نول کشور پریس، ص ۳۶۲)

اُردو والوں نے ”خرج“ سے ”خراج“ بنا لیا ہے، عربی الفاظ کے قیاس پر یہ لفظ استعمال میں آتا رہتا ہے۔ آصفیہ و نور دونوں میں یہ لفظ موجود نہیں۔ بعض لوگ اب تک اس لفظ کو مبتذل سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ لفظ حسن مفہوم کو جس ہم گیری کے ساتھ ظاہر کرتا ہے، وہ دوسرے الفاظ سے شاید ہی ادا ہو سکے۔ ”مرغن“ ”فوق البهرک“ اور ”مدتخ“ وغیرہ کی طرح، اس لفظ کو بھی صمیم مان لینا چاہیے اور لغت میں جگہ دینا چاہیے۔

”ناواقفی“، ناواقفیت کی جگہ ”ناوقنی“ کہنا غلط ہے، جیسا کہ آتش نے کہا ہے،

ناوقنی کی دلیل یہ تھی کہ ہے وار کا منصور پہ گماں ہے مجھے نے سوار کا“
(قاموس)

یہ آتش پر اتہام ہے کہ انہوں نے ”ناوقنی“ لکھا ہے۔ شعر صمیم طور پر یوں ہے،

ناہی کی دلیل یہ تھی کہ ہے وار کا منصور پہ بقیں ہے مجھے نے سوار کا

کلیات آتش کے دوسرے پیش نظر ہیں، ایک ۱۳۶۹ء کا۔ اور دوسرا نول کشور پریس کا جس کا سال طبع ۱۹۲۹ء ہے، دونوں میں اس شعر کا متن اسی طرح ہے۔ ”ناواقفی“ ضرور استعمال کیا گیا ہے، جیسے،

”سدا بہر سرمد محمد احمد کہ ناواقفی نے آپ کی ملاقات سے

مردم رکشا“ اخیر مینائی (مکاتیب امیر خانی، طبع دوم، ص ۲۷۲)
 ”پہلے تو یہ دیکھا جائے کہ احراض کیسا ہے، ایسا ہے کہ بالکل ہی معترض کی نادانی
 پر دلالت کرتا ہے۔“ غلام غوث دکنبر (اختلائے بے خبر و شائع کردہ لہری دنیا علی ٹرڈ، ص ۴)
 نور اور آصفیہ دونوں میں ”نادانی“ موجود نہیں۔

مانند : فارسی میں ”مانند“ پر فتح زونِ اول ہے۔ مولفینِ قاموس نے بھی اسی طرح
 بولنے کی تاکید کی ہے اور لکھا ہے کہ، ”پکسر زونِ اول کہنا غلطی ہے۔“ اردو کی بول چال
 میں یہ لفظ پکسر زونِ اول مستعمل ہے اور اب اسی طرح کانوں کو اچھا لگتا ہے۔ اصل حرکت
 کے ساتھ، اس حرکت کو بھی گھج مان لینا چاہیے۔ بعض لوگ اصل کی رعایت سے پر فتح زونِ
 اول بولتے ہیں، لیکن بہت کم۔ عام طور پر پکسر زونِ اول بولا جاتا ہے۔ آصفیہ میں ن
 پر زیر لگا ہوا ہے (مانند) اس کے ساتھ ساتھ مولف نے قومین میں مزید لکھا ہے،
 (عوام، مانند)۔ مطلب یہ نکلا کہ مولف کے نزدیک صحیح تلفظ پر فتح سوم ہے اور پکسر سوم،
 عامیانه تلفظ ہے۔ اس کے برخلاف مولف نور نے استعمالِ عام کا احترام ملحوظ رکھا ہے؛
 اصل حرکات کو درج کرنے کے بعد لکھا ہے کہ، ”اردو میں زبانوں پر پکسر سوم ہے۔“ اور یہی
 صحیح صورت ہے۔

اصطیل : اصلًا اس لفظ میں الف پر زیر ہے، ط پر زیر ہے، اور ہ ساکن
 ہے (اصطیل)۔ شعراے اردو نے اس طرح نظم بھی کیا ہے، مگر بول چال میں یہ ”یرمل“
 کے وزن پر آتا ہے (اصطیل)۔ کیا خواص، کیا عوام، یہی اسی طرح بولتے ہیں اور یہ اردو
 کا تصرف ہے۔ بول چال میں اصل حرکات کی پابندی کی جائے تو بے حد خفیت کا احساس
 ہوگا۔

امیر اللغات میں یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ "اصطبل" صحیح نہیں، "یہ لفظ نہ
پہنچ اول صحیح ہے نہ پہنچ بائے موحده"۔ یہی بات مولفین قاموس نے لکھی ہے۔ تو میں
اس کو صرف "پہسرالف و سکون صاد و فتح طاء و سکون باء لام" لکھا گیا ہے۔ مطلب
اس سے بھی یہی نکلتا ہے کہ پہنچ اول و چہارم صحیح نہیں۔ گو یا ان حضرات نے اس لفظ میں
اُردو کے تصرف کو قابل قبول نہیں سمجھا۔ البتہ آصفیہ میں مختلف صورت پائی جاتی ہے۔ اُس
کی عبارت یہ ہے :

"اصطبل.... اس کے تلفظ میں اختلاف ہے۔ روزمرہ حال اور کشف اللغات
کے موافق پہنچ اول ہی درست ہے۔ مگر یونانی تلفظ اور صراح، منتقب،
مزیل الاغلاط، فیاض میں پہسر اول و بائے موحده موقوف پایا جاتا ہے، لیکن
شعرے ہند نے اس بے کو متحرک و موقوف کردونوں طرح باندا ہے، چنانچہ
ایک ایک مصرع لکھا جاتا ہے،

تودا ۱۔ یہ یمن یہ کہ اصطبل او ہڑ کرے ہزار۔

میر تقیس، ۲۔ خالی ہوا اصطبل، چلے آتے ہیں گھوڑے"۔

مؤلف آصفیہ نے بجا طور پر روزمرہ حال کے موافق اس کو "اصطبل" لکھا ہے۔ اگر کشف اللغات
میں اس کو پہ لانا اصل، پہنچ پہ لکھا گیا ہے، تو یہ درست نہیں۔ اصل یہ صرف پہ سکون
پہ ہے۔ پہ کا زبر، اُردو کا اثر ہے۔ اسی طرح الف کا زیر بھی اُردو کا تصرف ہے۔
اثر لکھنوی مرحوم نے لکھا ہے :

"مجھ یوں ہی ہے جس طرح لکھا ہے، اور شاعر بھی زیادہ تر اسی طرح نظم کرتے ہیں؛

مگر کیا خواہ کیا موام، بولتے اصطبل ہیں پہنچ اول و سکون صاد و فتح طاء

و باء و سکون لام" [فرحنگ اثر ص ۱۳۷]

چوں کہ یہ لفظ نظم میں ہمیشہ تر اصل حرکات کے ساتھ اور کم تر تصرفت نظم ہوا ہے، اور بول چال میں

صرف پہنچ اول و پنج چارم (اُخْطَبِل) آتا ہے؛ اِس بنا پر، اِس لفظ کی دونوں صورتوں کو صحیح مانا جائے گا۔ اِس مراحت کے ساتھ کہ ”اُخْطَبِل“ اردو کا تصرف ہے اور بول چال میں صرف اِسی طرح آتا ہے اور نظم میں اس کو بیش تر پر سکون بآ اور کم تر پر فحیح بآ باندھا گیا ہے۔

اعراف : قاموس الاغلاط، فرہنگِ مصفیہ، امیر اللغات اور نور اللغات، اِن باب میں اِس لفظ کو صرف پہنچ اول لکھا گیا ہے۔ اصل کے لحاظ سے یہ بالکل صحیح ہے، لیکن یہ قول آخر لکھنوی مرحوم : ”اردو میں کبسر اول بولتے ہیں۔ ہمارا لہجہ اِسی کا مستقامنی ہے“ (رسالہ التحریر لاہور، جنوری ۱۹۵۵ء)۔

حکمت کا یہ اختلاف اردو میں ہی نہیں، جدید فارسی میں بھی ہے؛ مجیم نے اپنے لغت میں اِس کو کبسر اول لکھا ہے۔

الایچی : ”الایچی“ ہ - معروف - الایچی کہنا غلط ہے ” (قاموس) - نفس اللغة، نفائس اللغات اور امیر اللغات میں کسی طرح کی مراحت کے بغیر، صرف ”الایچی“ ملتا ہے۔ گویا اِن لغات کے مؤلفین کے نزدیک اِس لفظ کی صحیح صورت یہی ہے۔ سرمایہٴ دِبانِ اُردو میں ”الایچی، تو موجود نہیں، البتہ ”الایچی داد“ موجود ہے۔ ”الایچی“ اس میں بھی موجود نہیں۔ گویا اِن سب کی رائے میں صحیح لفظ ”الایچی“ ہے۔ آخر صاحب نے فرہنگِ آخر میں لکھا ہے کہ :

”لکھنوی میں ”الایچی“ نصفا کی دِبان اور ”الایچی“ حوام کی دِبان بھی جاتی ہے۔“
 مصفیہ میں الایچی اور الایچی، دونوں لفظ ہیں اور کسی تفریق کے بغیر عبارت میں بھی کئی جگہ ”الایچی“ آیا ہے۔ نوادر الاغلاط اور نور اللغات میں بھی یہ دونوں لفظ موجود ہیں۔ بول چال کی بھی یہی صورت ہے کہ یہ لفظ دونوں طرح سننے میں آتا رہتا ہے۔ آخر صاحب کا یہ کہنا

کو لکھتوں میں "الایچی" "عوام کی زبان ہے، یوں ملتی نظر قرار پاتا ہے کہ ششوی گلزارِ نسیم میں یہ لفظ موجود ہے، چکنی ڈلی، عطر، الایچی، پان نقل وے دجام و خوان الوان آصفیہ کے اندراج سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اربابِ دہلی کے نزدیک یہ لفظ دونوں طرح صحیح ہے۔ اسی طرح نور اللغات کے اندراج اور نسیم کے مندرجہ بالا شعر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لکھتوں میں بھی اس کو دونوں طرح صحیح سمجھا گیا ہے۔ چون کہ اس لفظ کو دونوں طرح لکھا گیا ہے، اس لیے "الایچی" اور "الایچی" دونوں صورتوں کو صحیح مانا جائے گا۔

نور میں "الایچی" کو فارسی اور "الایچی" کو سنسکرت لکھا گیا ہے۔ اس قول کا جزو آخر صحیح نہیں۔ "الایچی" سنسکرت نہیں، ہندی ہے۔ فارسی میں الف پر ذر ہے (تیم کا لغت) مگر اردو میں عموماً پکسر الف بولتے ہیں۔ نفائس اللغات میں "الایچی" کو کچھ بکر بول لکھ کر، فارسی لکھا ہے۔ یہ ملتی نظر ہے۔ کسرہ اردو کا اثر ہے۔ فارسی میں الف مفتوح ہے۔ خان آرزو نے نوادر الالفاظ میں لکھا ہے،

"دیز الایچی در کتب لغت فارسی آرد، پس از توافق لسانین باشد" (مرح)

میری نظر سے فارسی میں "الایچی" گزرا ہے، "الایچی" میں نے نہیں دیکھا۔ اس کا امکان ہے کہ اصل عبارت میں "الایچی" ہو اور کاتب صاحب نے اُس کو "الایچی" بنا دیا ہو، اور غالباً یہی ہوا ہے۔ شکستہ نے "الایچی" اور "الایچی" دونوں کو سنسکرت لکھا ہے۔ یہ درست نہیں۔

ارنی، مولفین قاسم نے "ارنی" کو صرف پکسر دوم (آرینی) لکھا ہے، جس سے یہ مطلب کھلا جا سکتا ہے کہ یہ لفظ صرف پکسر را صحیح ہے اور پکسون را غلط۔ اس میں شک نہیں کہ اصلاً ر پر ذر ہے، لیکن فارسی میں اس کو پکسون را بھی نظم کیا گیا ہے اور یہ تقریباً بہارِ نظم اور خیانت اللغات میں تفصیل موجود ہے۔ صرف ایک مثال یہ شعر نقل کیا جاتا ہے،

"موسی از سبام تہا وید دست شیش یکچہ پایہ ارنی شکست" (غلامی)

یہ لفظ مغرب ہو کر ہم تک پہنچا ہے اور اس بنا پر اس کو دونوں طرح یکجہا جانے کا
(آرئی۔ آرئی)۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ امیر اللغات میں موجود ہے، مگر ضبط
حرکات سے کام لیا گیا ہے اور در اس کی صراحت کی گئی ہے، البتہ مثال میں جو شعر درج کیے
گئے ہیں، ان سب میں یہ کسر دوم آیا ہے اور اس سے بجا طور پر یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے
کہ مولف کی رائے میں یہ لفظ صرف کسر دوم صحیح ہے۔ غالب نے ایک خط میں لکھا ہے :
”اگر تقطیع شعر مساعدت کر جائے اور آرئی بر وزن چمن، گنبدیش پائے تو
نعم الاتفاق، درد قاعدہ تعریف، مقتضی جواز ہے“

(اولیٰ خطوط غالب، ص ۹۰)

”آرئی“ کی طرح عربی کے اور کئی لفظ ہیں جن کو ہر سکون حرف دوم استعمال کیا گیا
ہے، جیسے، کلمہ، خمرہ، درجہ، حرکت، برکت، عظمت۔ یہ سب لفظ ”آرئی“
کی طرح، ہر سکون حرف دوم بالکل صحیح ہیں، بل کہ اکثر تو اردو کے لحاظ سے صرف ہر سکون حرف
دوم ہی صحیح ہیں، جیسے عظمت، درجہ، برکت، کلمہ، خمرہ۔ اگر ”عظمت“ یا ”خمرہ“ (خمرہ)
کہا جائے تو بولنے والے پر نودارد ہوئے کا شبہ کیا جائے گا۔ قافی کی ایک رباعی کا پہلا
مصرع ہے، ”اک کلمہ شوق لب پر لایا دگیا“ یا جیسے مثنوی گلزارِ نسیم کا یہ مصرع،
”خمرہ ہے قلم کا حمید باری“؛ ان میں یہ دونوں لفظ (کلمہ، خمرہ) اردو کے لحاظ سے
صحیح طور پر آتے ہیں، یہی بول چال ہے۔ نظم کی مجبوری سے ان لفظوں کو ہر حرکت دوم استعمال
کیا جاسکتا ہے، استعمال کیا ہی گیا ہے؛ مگر یہ ضرورت شعری، استعمال عام کی ضامیندگی
نہیں کرتی۔ بہر صورت، ان لفظوں کو دونوں طرح صحیح مانا جائے گا، مگر ضرورت شعری
اور استعمال عام کی وضاحت کے ساتھ۔

بابر، ”بابر جنسیت باے موحده۔ مسیح ہے“ (فانوس)۔

اس میں خلک نہیں کہ بادشاہ معروف کے نام کے طور پر، اصلاً یہ لفظ پیغمؐ ہائے موحّدہ ہے (غیث)، مگر اُردو میں یہ لفظ صرف پرستش یا مستقل ہے، اور اب اُردو میں اسی طرح صحیح سمجھا جائے گا۔ پیغمؐ یا کو اُردو سے کچھ تعلق نہیں۔

توہر میں یہ لفظ بادشاہ معروف کے نام کے طور پر موجود نہیں۔ آصفیہ میں ہے، مگر اُس میں، فارسی کی رعایت سے، صرف پیغمؐ ہائے موحّدہ لکھا ہوا ہے۔ لغت نامہ و ہند میں ہائے ثانی پر کسرہ لگا ہوا ہے (بابر)، صاحب لغت نامہ نے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ رچرڈسن نے "بابر" کے ساتھ "پاپر" (بہرہ و ہائے فارسی) بھی لکھا ہے، مجھے اس طرح اور کہیں نہیں ملا۔

"بے وقوف"، وقوف کے داد کو عوام فقہ سے کہتے ہیں (تاموس)۔

تنہا لفظ "وقوف" عربی کے مطابق پیغمؐ اول ہی مستقل ہے، مگر لفظ "بے وقوف" صرف پرستش واد بولا جاتا ہے اور اردو کے لحاظ سے اسی طرح لگے ہے۔ "بے وقوف" کہنے میں اس قدر تکلف یا اہتمام کرنا پڑے گا کہ گفتگو کی روانی کے ساتھ ساتھ مفہوم کی پیگیری بھی مرحوم ہو کر رہ جائے گی۔

توہر میں یہ لفظ موجود ہے، مگر اُس میں حرکات کی مراحت نہیں کی گئی ہے۔

آصفیہ میں "بے وقوف" اور "بے وقوفی" ہے،

"بے وقوف" - ف + و - صفت - احمق، نادان، مورکھ،
مودعو

"بے وقوفی" - ف + و - اہم مونث (۱) نادانی.....

اعراب تو ٹھیک ہیں، مگر یہ مراحت ضروری تھی کہ یہ ہند صورت ہے۔

تاہم، "تاہم" غلط ہے۔ اس کی جگہ "بریں ہم" یا "اس پر بھی"،

آصفیہ میں سرشت کے سس پر زیر لگا ہوا ہے۔ نور میں حرکات کی باقاعدہ سرشت کی گئی ہے: سرشت بکسر اول و دوم و سکون سوم۔ اسی طرح سرایت کے نقل میں لکھا گیا ہے: بکسر اول و فتح چہارم۔ موقوف قاموس نے اور زیادہ وضاحت سے کام لیا ہے: سرایت، بالکسر صحیح ہے اور بالفتح غلط: سرشت، بفتح سین بہلک صحیح نہیں۔

اردو میں یہ دونوں لفظ، عیال، عیال اور عمار وغیرہ کی طرح، صرف بفتح حرف اول استعمال کیے جاتے ہیں۔ اب اردو میں ان کو اسی طرح صحیح ماننا چاہیے اور بکسر اول کو اردو سے غیر متعلق سمجھنا چاہیے۔

جراحت، بفتح جیم صحیح نہیں۔ (قاموس) عربی میں یہ لفظ بکسر اول ہی ہے۔ فارسی میں بھی یہی صورت ہے۔ غیاث اللغات میں خاص طور پر یہ صراحت کی گئی ہے کہ بفتح اول صحیح نہیں: جراحت، بالکسر..... وبالفتح خطاست۔ مگر اردو میں سرایت کی طرح اس کو جیم کے زیر سے بولتے ہیں۔ نور میں جیم پر زیر لگا ہوا ہے، اور مزید صراحت اس طرح کی گئی ہے: عربی میں بکسر اول: گویا موقوف نے کم سے کم اس لفظ میں اردو کے تصرف کو تسلیم کر لیا۔ آصفیہ میں اس کو عربی بتایا گیا: اور اعراب اس طرح لگے ہوئے ہیں کہ اس لفظ کو بالفتح بھی پڑھا جاسکتا ہے اور بالکسر بھی۔ یہ کتابت کی گڑبڑ معلوم ہوتی ہے۔ یہ صراحت ضروری تھی کہ عربی میں ج پر زیر ہے، اور اردو میں بفتح جیم ہے۔ پلیٹس نے بکسر اول کو عربی اور بفتح اول کو فارسی لکھا ہے۔ اس قول کا جزو آخر صحیح نہیں۔ عربی کی طرح فارسی میں بھی بکسر اول ہے۔ جیم کا زیر، اردو کا اثر ہے۔

بہشت، فارسی میں بکسر تین ہے (بہشت)۔ تعجب اس پر ہے کہ صاحب نور اللغات نے بھی اس کو مطلقاً فارسی کے مطابق لکھا ہے: بکسر اول و دوم و سکون

سوم و اردو میں تو اس طرح کوئی نہیں ہوتا۔ سب لوگ پہنچے اول و کسر اول (پہشت) بولتے ہیں جس طرح فارسی کا ”فرشتہ“ اردو میں ”فرشتہ“ بن گیا، اُسی طرح ”پہشت“ یہاں ”پہشت“ ہو گیا ہے۔ اردو میں اب صرف اسی تلفظ کو صحیح ماننا چاہیے۔ آصفیہ میں ب پر زبر لگا ہوا ہے (پہشت)، اور صحیح طور پر اس کو فارسی کا لفظ بتایا گیا ہے۔ قابلِ لحاظ بات بس یہ ہے کہ اس اندازِ نگارش سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ فارسی میں بھی یہ پہنچ اول ہو گا۔ یہ لکھنا ضروری تھا کہ فارسی میں ب کسر اول ہے، اور اردو میں پہنچ اول۔

چنگیز، خزانہ، درغ :

آصفیہ و نور دونوں میں ”چنگیز“ موجود نہیں۔ موقنین قاموس نے اس کو ب کسر اول لکھا ہے۔ فارسی میں حرفِ اول ضرور کسور ہے (خیات اللغات)، مگر اردو میں اس کو صرف پہنچ حرفِ اول بولا جاتا ہے اور اب اردو کی حد تک اسی حرکت کو مرتج ماننا چاہیے۔

خزانہ، عربی میں ب کسر حرفِ اول ہے۔ ایسے اور الفاظ کی طرح اردو میں اس لفظ کے پہلے حرف کا زیر، زبر سے بدل گیا۔ یہ یہاں کے بچے کا اثر ہے۔ اردو میں اب اس کو صرف پہنچ حرفِ اول بولتے ہیں۔ ب کسر حرفِ اول (خزانہ) کو عربی کے حوالے کر دینا چاہیے۔

نور اور آصفیہ دونوں میں پریشان کن صورت پائی جاتی ہے۔ نور میں اس کو پہلے ”ب کسر اول“ لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد یہ بھی لکھا ہے: ”مؤید الفضلا میں ب کسر اول و پہنچ اول دونوں طرح لکھا ہے“ مگر مولف نے یہ نہیں لکھا کہ اردو میں کیا صورت ہے؟ اس سے الجھن پیدا ہوتی ہے۔ آصفیہ میں ”خزانہ“ لکھا ہوا ہے، یعنی ز پر زبر

لگا ہوا ہے اور مزید راحت یہ کی گئی ہے کہ: مشہور پہنچ غا اور محج بہ کسر خلتے ہوئے ہے۔ اس سے بات پوری طرح صاف نہیں ہوتی۔ یہ وضاحت ضروری تھی کہ عربی میں یہ بہ کسر اول ہے، مگر اردو میں اس کو پہنچ اول بولتے ہیں اور اردو میں اسے بھی حرکت صحیح ہے۔

دریغ، فارسی میں بہ کسرتین ہے (دریغ)۔ فرشتہ اور بہشت کی طرح، اردو میں اس لفظ میں بھی حرف اول کا کسرہ، فتح سے بدل گیا، اور اب اردو والے اس کو (دریغ) بولتے ہیں۔ اردو میں اس کی یہی صورت مرتج ہے۔ — آصفیہ میں یہ حفظ موجود ہے، لیکن ضبط حرکات سے کام لیا گیا ہے اور نہ صراحت کی گئی ہے۔ البتہ فور میں اس کو فارسی لغات کے مطابق ”بہ کسر اول و دوم“ ہی لکھا گیا ہے۔ تاحوس میں بھی فارسی حرکات کو صحیح بتایا گیا ہے۔ اردو میں ”دریغ“ اور ”دریغ“ دونوں لفظ صرف پہنچ وال استعمال کیے جاتے ہیں۔

درود، دروغ، رعونت

لفظ ”درود“ اصلاً بہیم وال ہے (درود)۔ آصفیہ اور قاموس میں وال دال پر پیش لگا ہوا ہے، اور صاحب نور اللغات نے مزید صراحت کی ہے کہ: پہنچ وال غلط ہے۔ یہ ان کی زیادتی ہے۔ عام لوگ خاص طور پر عورتیں اس کو پہنچ وال بولتی ہیں۔ مناسب یہ ہوگا کہ اس لفظ کو دونوں طرح صحیح مان لیا جائے۔ کچھ لوگ (بل کہ بعض لوگ) بہیم اول بولیں گے، اور اکثر بولنے والے اس کو پہنچ وال استعمال کریں گے۔

”دروغ، بہنچ وال ہے“ (تاحوس)۔ مگر یہ قول بجاے خود غلط ہے۔ براہن قاطع کے ایرانی مرتب ڈاکٹر محمد معین نے ”دروغ“ کو عاشیہ میں بہیم اول

لکھ کر اس کا افغانی تلفظ پر فسح اول لکھا ہے۔ اردو میں بھی اس کو پر فسح اول استعمال کیا جاتا ہے۔ آصفیہ میں تو اس کو فارسی کے مطابق صرف پر فسح اول لکھا ہے، مگر قود میں ہے کہ: ”پر فسح اول و دوم و نیز پر فسح اول و اصل میں صاحب غیاث اللغات نے لکھا ہے کہ: ”پر فسح اول نیز آمدہ“۔ مولف قود نے نابا غیاث کے اسی انداز کی بنا پر اس کو دونوں طرح لکھا ہے۔ لیکن فارسی کے اور لغات میں اس کو صرف پر فسح اول لکھا گیا ہے۔

بہر صورت، اردو میں دروغ صرف پر فسح اول مستعمل ہے۔ پر فسح اول کو اب صرف فارسی تک محدود سمجھنا چاہیے۔ دروغ بیانی، دروغ گوئی، دروغ حلقی، مستعمل مرکبات ہیں، ان میں دروغ کو پر فسح اول بول کر دیکھیے: تلفظ کی مثال آئیں دیکھئے گی۔

”رحمت“ کے متعلق قاموس میں لکھا گیا ہے کہ: ”پر فسح اول رکبنا غلط ہے۔ آصفیہ و قود میں بھی یہ پریش لگا ہوا ہے، اس کا مطلب یہی ہوا کہ دونوں مؤلفین کے نزدیک بھی یہ لفظ پر فسح اول صحیح ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ لفظ عربی میں صرف پر فسح اول ہے، مگر اردو میں یہ لفظ عموماً پر فسح اول بولا جاتا ہے۔ پر فسح اول شاید ہی کوئی بولتا ہو۔ اردو میں اب اس لفظ کو پر فسح اول مرغ ماننا چاہیے۔

جمہور، سوال، مرقت :

لفظ ”جمہور“ عربی میں پر فسح جیم ہے۔ فارسی کے لغات میں بھی اس کو پر فسح جیم لکھا گیا ہے۔ اسی روایت سے قاموس میں اس کو ”پر فسح جیم غلط“ لکھا گیا ہے۔ اردو میں یہ لفظ صرف پر فسح جیم مستعمل ہے۔ اسی طرح ”جمہوری“ اور ”جمہوریت“ کو بھی پر فسح اول بولا جاتا ہے۔ اردو میں اس لفظ کو صرف پر فسح اول ماننا چاہیے۔

نور میں ”جمہور“ کے ج پر پیش لگا ہوا ہے (جمہور) اور کسی طرح کی صراحت نہیں ملتی۔ اس کے برخلاف، آصفیہ میں ج پر زیر لگا ہوا ہے (جمہور)، اور اس کو عربی لکھا گیا ہے۔ یہ صحیح صورت نہیں۔ یہ صراحت ضروری تھی کہ عربی میں ج پر پیش ہے، اردو میں اس کو بفتح جیم بولتے ہیں۔

”سوال“ کے ذیل میں نور اللغات میں یہ اندراج ملتا ہے: سوال۔ ع۔ پنجم۔ اول و نسخہ ہمزہ کہ بہ صورت واو ہے۔ یعنی صحیح لفظ ”سؤال“ ہے۔ یہ عربی کی تقلید ہے۔ مولف نور نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا تعلق دراصل عربی سے ہے اور اسی سے رہنا چاہیے۔ مؤلفین قاموس لے بھی پنجم اول کو صحیح بتایا ہے: ”بفتح سین کہنا درست نہیں“۔

اردو میں اس کو ”سوال“ بفتح س و واو بولا جاتا ہے اور اردو میں اسی طرح مرتج قرار دینا چاہیے۔ قبیلین نے صحیح طریقہ اختیار کیا ہے کہ ”سؤال“ لکھ کر لکھا ہے کہ عام تلفظ بفتح اول مع واو ہے، اور صحیح بات بھی یہی ہے۔ آصفیہ میں ”سوال“ لکھا ہوا ہے۔ نہ تو اس پر زیر نہ لگے ہوئے ہیں اور نہ صراحت کی گئی ہے، البتہ ”سوالات“ کے س پر پیش لگا ہوا ہے۔ یہ بھی درست نہیں۔ اردو میں ”سوالات“ کو بھی صرف بفتح س استعمال کیا جاتا ہے (سوالات)، اسی طرح ”سوالی“ بھی صرف بفتح س بولا جاتا ہے۔

لفظ ”مروت“ اردو میں پنجم اول و فتح دوم بولا جاتا ہے (مُرَوّت) اور اب اردو والوں کے لیے یہ اسی طرح صحیح ہے۔ آصفیہ میں ”مُرَوّت“ لکھا ہوا ہے، مگر نور میں ”مُرَوّت“ ہے، مگر اس صراحت کے ساتھ: ”بفتح اول و دوم و نسخہ واو مشدود صحیح“۔

خمود، نمود، نقص،

موقوفین قاموس نے خمود اور نمود، دونوں کو بہضم اول لکھا ہے۔ بیش تر فارسی لغات میں یہ دونوں لفظ بہضم اول و دوم ہی ہیں، مگر برآن قاطع میں خمود اور نمود کو بہفتح اول لکھا ہے۔ نیز نمود کے ذیل میں لکھا ہے: ”بہکسر اول ہم بہنظر آمدہ است۔“ برآن کے ایرانی اڈیشن کے مرتب ڈاکٹر معین نے اس کے حاشیے میں لکھا ہے: ”درد لہجہ مرکزی بہکسر اول، نیز بہضم و فتح اول تلفظ شود۔“ صاحب حاشیہ نے ”نمود“ کو ”نمودن“ سے مشتق مانا ہے۔ نیز ”خمودار“ کو جو صاحب برآن نے بہفتح اول لکھا ہے، اس سے اختلاف بھی نہیں کیا ہے۔ (اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ ”نمودن“ اور ”نمود“ فارسی میں بہفتح اول اور بہضم اول دونوں طرح صحیح ہیں۔ محمد علی تبریزی نے فرہنگ نوہار میں خمودار اور نمود کو بہفتح اول اور بہضم اول دونوں طرح لکھا ہے۔

اردو میں یہ دونوں لفظ عموماً بہفتح اول مستقل ہیں۔ نوذ میں نمود کو تو صرف بہضم اول و دوم لکھا گیا ہے، البتہ ”خمودار“ کے ذیل میں یہ مراحت ملتی ہے: ”فارسی میں بہضم اول و دوم، اردو میں بہفتح اول وضم دوم زبانوں پر ہے۔“ گویا ایک لفظ میں اختلاف کو تسلیم کیا گیا اور ایک لفظ میں اس کو نظر انداز کر دیا گیا۔ ہاں ”نمود“ میں مولف نے اختلاف کا پوری طرح احترام ملحوظ رکھا ہے، لکھا ہے: ”ف، بہضم اول و دوم صحیح ہے۔ اردو میں بہفتح اول زبانوں پر ہے؛ آصفیہ میں خمود، خمودار، نمود؛ سب میں ن پر زیر لگا ہوا ہے۔“

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، اردو میں خمود، خمودار، خموداری، نمود؛ یہ سب لفظ بہفتح اول بولے جاتے ہیں اور یہی صواب مرتجح ہے۔ ہاں ”نمود“ سے ”نورشا“ بھی اردو میں مستقل ہے۔ موقوفین قاموس نے نور سے بھی غلط بتایا ہے، کیوں کہ

• نمونہ فارسی کا لفظ ہے، اُس پر عربی کی تہوین کیسے آسکتی ہے؛ مگر اردو میں اندازاً
 اور نمونہ ”دونوں لفظ مستقل ہیں اور اردو کے لحاظ سے یہ بالکل صحیح لفظ ہیں۔
 ”قص“ عربی کا لفظ ہے اور عربی میں ن پر زبر ہے، فارسی میں بھی یہ ”نِصِج“
 نون ہے، لیکن اردو میں عموماً ہر ضمّ نون (قص) مستقل ہے۔ اکثر لوگ اس طرح
 بولتے ہیں۔ ازراہ احتیاط اس لفظ کو دونوں طرح صحیح مان لینا چاہیے، اس
 صراحت کے ساتھ کہ اردو میں عام سطح پر یہ ہر ضمّ نون مستقل ہے۔

نور میں اس کو عربی کے مطابق بالفتح لکھا گیا ہے اور یہ بھی لکھا گیا ہے کہ بالعم
 غلط ہے۔ ”آصفیہ میں نقص“ لکھا گیا ہے، مگر اس صراحت کے ساتھ کہ ”مشہور ہر ضمّ
 نون ہے، مگر صحیح ہر فتح نون“۔ قاموس میں بھی ہر ضمّ نون کو غلط بتایا گیا ہے۔ ہر ضمّ
 نون کو غلط نہیں کہا جاسکتا، بل کہ حسب قول صاحب ”آصفیہ“ مشہور ہر ضمّ نون ہے۔

چغند، صفر، نفل

آصفیہ، نور، قاموس، سب میں ”چغند“ کو صرف ہر سکون دوم لکھا گیا ہے۔ بل کہ
 قاموس میں تو یہ بھی صراحت ملتی ہے کہ: ”جہلاً چغند، ہر فتح نین کہتے ہیں“ فارسی میں
 یہ لفظ ہر سکون نین ہے۔ اردو میں شعرانے اس کو ہر سکون نین ہی نظم کیا ہے، مگر بول چال
 کی زبان میں اس کا تلفظ بھی بدل گیا اور معنی بھی۔ فارسی میں چغند، آٹو کا مرادف ہے۔
 اردو میں بھی اس معنی میں مستقل ہے، لیکن بول چال میں ”چغند“ ہر فتح نین، احمق کے
 معنی میں بھی مستقل ہے اور ہر کثرت اس لفظ کی دونوں حرکات کو مان لینا چاہیے،
 متعدد جہالاتیاد کے ساتھ۔ ایک نہایت معروف مصرع، جو ضرب الثقل کی حیثیت
 اختیار کر چکا ہے، اُس میں یہ لفظ ہر فتح نین آیا ہے اور اس طرح کہ پوری طرح
 کھپ گیا ہے۔ مصرع یہ ہے: ”بُھا کو کب چغند پہچانتا ہے۔ اس سے بول چال کے اثر

کا بہ غولی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ہاں، ترکیب کی صورت میں، اصل کے مطابق، ہسکون دوم ہی اچھا معلوم ہوگا۔

”صفر، ہ فتح فَا (صفر) کہنا غلط ہے“ (قاموس)۔ عربی کے لحاظ سے ضرور غلط ہے، مگر اردو میں زبانوں پر ہ فتح فَا ہے (صفر)۔ یہی رائے صاحبِ نور اللغات کی ہے: ”زبانوں پر ہ فتح ہے“ البتہ آصفیہ میں ف پر جزم لگا ہوا ہے (صفر) کسی طرح کی مراحت کے بغیر۔ یہ عربی کی تقلید ہے۔ اردو میں شعرا نے اس کو اصل کے مطابق ہسکون فَا نظم کیا ہے، مگر بول چال میں اُس کا عمل دخل نہیں ہو پایا ہے۔ گفتگو میں ہ فتح فَا ہی آتا ہے۔ اس لفظ کو بھی دونوں طرح صحیح مان لینا چاہیے۔

”صفر“ کی طرح ”نفل“ بھی زبانوں پر بہ حرکت دوم (نفل) ہے، حالانکہ اصلاً یہ بھی ہسکون دوم ہے۔ اس لفظ میں بھی موقعِ نور اللغات نے اردو کے تلفظ کو ملحوظ رکھا ہے، اصل حرکات کو کر لکھا ہے: ”اردو میں زبانوں پر ہ فتح اول دکر دوم ہے۔“ مگر آصفیہ میں عربی کے مطابق صرف ہسکون دوم لکھا ہے (نفل)۔ اس لفظ کی بھی دونوں صورتوں کو صحیح مان لینا چاہیے۔

اس وزن کے متعدد لفظ ہیں جو اصلاً ہسکون دوم ہیں، مگر اردو کی بول چال میں بہ حرکت دوم مستقل ہیں۔ یہ تبدیلی یہاں کے لہجے کا اقتضا ہے اور فطری عمل ہے۔ اس کی طرف سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی اور اس کے تسلیم کرنے میں، عربی فارسی اور اردو لغات کے اندراجات اسبغ راہ نہیں ہو سکتے۔ مثلاً وحی، لہر، حمل، نفی (وغیرہ) بہت سے لفظ ہیں جو بول چال میں ہمیشہ بہ حرکت دوم آتے ہیں۔ ایسے سب الفاظ کے متعلق ایک اصول یہ قرار دینا چاہیے کہ ان کو دونوں طرح درست مانا جائے گا۔ اور اسی طرح درجِ لغت کیا جائے گا۔ یہ انداز کہ ایسے الفاظ کو بہ حرکت دوم غیر صحیح یا غیر فصیح سمجھائے، کسی طرح درست نہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر

آرژو کسنوی مرحوم کی ایک عبارت کو نقل کر دیا جائے۔ انھوں نے لفظ نفی کو ایک جگہ پر کسر دوم نظم کیا ہے اور مغز نہیں، ترکیب فارسی کے ساتھ، اور پھر اُس پر حاشیہ لکھا ہے وہ شعر اور حاشیہ کی عبارت درج ذیل ہے :

”آرژو اک بے بضاعت آدمی جس کا کل سرمایہ اک لائے نفی لے

لے یہ لفظ ساکن الاوسطا ہے۔ میں نے اسے جن وجوہ کی بنا پر ساکن الاخر لانا

اور پھر اضافت فارسی کے ساتھ استعمال کرنا جائز جانا ہے، وہ حسب ذیل

ہیں :

(۱) اردو یونے والوں کے لیے میں یہ ساکن الاخر ہے۔ متقدمین نے نشا

وغیرہ کے استعمال میں اس اعتبار کو ہر جگہ دخل دیا ہے، اور وہاں کے قافیے

میں نشا نظم کر گئے ہیں۔ وہ جاہل نہ تھے، اور نہ میں اس لفظ کی حقیقت سے۔

بے خبر ہوں۔ عربی کے لیے ساکن الاوسطا صحیح و فصیح ہے، مگر اردو کے

یہ ساکن الاخر ہی صحیح بھی ہے اور فصیح بھی، خاص کر آخر کلام میں۔

(۲) ختم کلام حرف متحرک پر محال ہے؛ اس لیے آخر لفظ اگر ساکن الاخر

ضہیں ہوتا تو ساکن کر لیا جاتا ہے۔ اسی مقصد سے فارسی کے متحرک الاخر

الفاظ میں اسے مختلف بڑھا دیتے ہیں کہ حرکت آخر، حرف ساکن کے موجود ہونے

سے، کلمہ کو اک حرف کی آواز پیدا کر دیتی ہے۔ جیسے: ”ہم“ ”وہ“ ”میں“

لفظیں ہیں۔

(۳) صرف حرکت و سکون کی تبدیلی ایسی چیز نہیں جس سے لفظ اصل سے

دور ہو کر مثل ”ناخون“ اور ”صاین“ کے سندھان لیا جائے؛ لہذا اُس

میں اضافت فارسی کا لانا بھی غلط نہیں ہو سکتا۔ اس ترکیب عربی ہوتی تو

درست نہ بھی جاتی۔ یہ میرا ذاتی خیال ہے، میں دوسروں کو اس طرز عمل

پر مجبور نہیں کرتا: (جہاں آرزو، نظامی پریس لکھنؤ، ص ۱۷)

ایک زبردست استاد، اہل زبان اور زبان دان نے جو کچھ کہا ہے، وہ توجہ سے پڑھنے کی چیز ہے۔ انھوں نے جس اصول کو پیش کیا ہے، اس کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو ایسے لفظوں کے متعلق صحیح طور پر فیصلہ کرنا آسان ہوگا۔ اس یہاں ہم یہ یاد دلانا بھی بے محل نہ ہوگا کہ مثنوی گلزارِ نسیم کے مباحثے کے دوران ماوراءِ اعراضات کے علاوہ لفظ "حمل" کو بہ حرکت دوم نظم کرنے پر بھی اعتراض کیا گیا تھا یہ کہا گیا تھا کہ صحیح لفظ پسکون دوم (نخل) ہے، اس کو نخل "نظم کیا گیا ہے چکبست نے بہ حرکت دوم کی سند میں کئی شعر پیش کیے تھے، ان میں سے ایک شعر و ابد علی شاہ کا بھی تھا،

"گھر میں میرے بھی اے خوش اطوار آثار حمل کے ہیں نمودار"

اور اس اعتراض کے سلسلے میں چکبست نے یہ بھی لکھا تھا،

"یہ اعتراض اس اصول سے بے خبری ظاہر کرتا ہے کہ شاعر الفاظ اُسی صورت پر نظم کرتا ہے جس صورت سے کہ وہ اہل زبان کی زبان پر جاری ہوتے ہیں، بعض لغت کے تلفظ کی پیروی شاعر کے لیے ضروری نہیں ہوتی۔ یہ مادہ لغت کی رو سے نخل "درست ہے، لیکن شاعر نے لکھنؤ کی زبان پر اس لفظ کا یہی تلفظ جاری ہے.... لفظ "حمل" پر موقوف نہیں، متقدم الفاظ ایسے ہیں جن کا تلفظ لغت کی رو سے کچھ اور ہے، اور نظم، عام محاورے کے مطابق کیا جاتا ہے۔ مثلاً اصل لفظ "گلزار" ہے، یعنی لام بالکسر ہے، لیکن محاورے میں چون کہ پسکون لام بولتے ہیں، اس لیے شعرا نے اسی طرح نظم کیا ہے"

(مضامین چکبست، ص ۱۹۰)

حرکت، برکت، غلظت، خرہ، گلزار جیسے بہت لفظ شالائش کیے جاسکتے ہیں، اصل لفظ نخل ہے، مگر اس کو محاورہ عام کے مطابق پسکون لام نظم کیا گیا ہے،

حکومتِ عم کر کے، نام ہے بہت پاس و فاصلہ یعنی ہم نے کس لیے غلطی جنائی آپ کی
(حسرتِ موابانی)

لفظ "نفی" کی بعض اور مثالیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں، مثلاً :

جو کچھ تو نادراں تو اک بات ہے نفی ہی تری اُس کا اثبات ہے

تاکم دیوانِ یکس نسخہ اندیا آفس لندن، ورق ۱۵۹ الف

ہم نے اس بات کو اثبات کیا سوچ سے یوں دم بہ دم ذکرِ نفی میں ہے یہ محرابِ حجاب
(شاہِ نقیر)

حبشی، تمکین، فہم

لفظ "حبشی" کے متعلق تاحوسس میں لکھا گیا ہے کہ اس کو ہر سکونِ با نہیں کہنا چاہیے

اس بے چارے حبشی نے کیا ایسی خطا کی ہے کہ اس قبیل کے اور الفاظ میں اردو کے
تصرف کو مان لیا جائے اور اس کو اُس صف میں شامل نہ کیا جائے! آصفیہ و نور دونوں
لغات میں، عربی کی تقلید میں اس کو صرف ہر فتح دوم لکھا گیا ہے۔ استعمالِ عام میں یہ
صرف ہر سکونِ با ہے۔ اس لفظ کی دونوں حرکات کو مان لینا جاہل ہے۔ ہر فتح دوم کبھی کبھار
نظم کے کام آجائے گا اور ہر سکون دوم، بول چال کے کام آتا رہے گا۔ قبیل نے صحیح
ملاحظہ اختیار کیا ہے، اُس نے ہر فتح دوم لکھ کر لکھا ہے کہ مقبولِ عام تلفظ ہر سکونِ ثانی
ہے۔ ہاں جو صاحب ہر فتح دوم پر اصرار کریں، وہ حبشی حلوا سوچیں "میں اس کو ہر فتح
دوم بول کر دیکھیں! بات سمجھ میں آجائے گی۔

نور، آصفیہ، تاحوسس؛ سب میں "تمکین" کو ہر فتح دوم (تمکین) لکھا گیا ہے

اور ان سب مؤلفین نے اس بات کو قطعاً بھلا دیا کہ بول چال میں یہ صرف ہر سکونِ دوم
آتا ہے۔ نظم میں یہ لفظ ہر فتح دوم آ سکتا ہے، آنا بھی ہے مگر گفتگو میں صرف ہر سکونِ دوم
آتا ہے۔ اس لفظ کو ہر سکونِ دوم بھی صحیح آتا چاہیے، خواہ نظم میں ہو اور خواہ گفتگو میں۔

نعت میں بھی اسی تفصیل کے ساتھ اس کو لکھنا چاہیے۔

نَعْنٌ اور نَعْنٌ، دو لفظ ہیں، "نَعْنٌ، بہ نصتین، خطا شدن در رائے و تدبیر و بہ نفع اول و سکون ثانی، نریاں یافتن در خرید و فروخت" (غیاث اللغات)۔ اردو میں عام طور پر نَعْنٌ (بہ نصتین، خیانت، خورد خورد کے معنوں میں مستعمل ہے۔ یہ گویا اردو کا تصرف ہے۔ "نَعْنٌ" کوئی نہیں بولتا اور نہ بولنے کی کچھ ایسی ضرورت ہے۔ اردو کی بعین پُرانی تحریروں میں نَعْنٌ فاحش کی ایک ترکیب کہیں کہیں مل جاتی ہے، اور بس۔ اس کے علاوہ اس لفظ کا استعمال شاید ہی کہیں ہو۔

آصفیہ میں نَعْنٌ "اور نَعْنٌ کرنا" ملتے ہیں۔ مولف نے عربی کا لفظ بہ نظر رکھا ہے، اور اردو کے معنوں کو اُن سے وابستہ کر دیا ہے۔ خیانت وغیرہ کے معانی میں اردو میں نَعْنٌ "کوئی نہیں بولتا" صرف "نَعْنٌ" کہتے ہیں۔ نوری میں البدۃ استعمال عام کی روایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اردو میں بہ نفع اول و دوم مستعمل ہے یہ مولفین قاموس نے اپنی روایت کے مطابق، بہ نفع اول و دوم کو غلط بتایا ہے۔ اور اُن کا یہ قول بجائے خود غلط ہے۔ اردو میں اب اس لفظ کو خیانت وغیرہ کے معانی میں، صرف بہ نفع اول و دوم ماننا چاہیے۔

طرفین، غفلگی، غلبان، جمعہ،

"طرفین، بہ نصتین صحیح ہے، اور پسکون غلط" (قاموس)۔ آصفیہ میں تو یہ لفظ موجود ہی نہیں۔ نوری میں ہے، مگر عربی کے مطابق اس کو "طرفین" لکھا گیا ہے۔ اردو میں یہ لفظ پسکون یا بھی مستعمل ہے اور بہ کثرت۔ نظم کی ضرورت سے یا کسی خاص ترکیب میں چاہے "طرفین" آجائے، مگر استعمال عام میں یہ پسکون وہی آتا ہے۔ اسی مراحت کے ساتھ اس لفظ کی دونوں صورتوں کو تسلیم کر لینا چاہیے۔

”ظہان“ بہ لحاظِ اصل پر فقہین ہے (ظہان)۔ آصفیہ و نور میں بھی اس کو صرف پہنچ اول و ثانی لکھا گیا ہے۔ نور میں حرکات کی صراحت کی گئی ہے: پہنچ اول و دوم؟ قانوس میں بھی یہی صورت ہے۔ ان موافقین کرام نے استعمالِ عام سے مستعمل طور پر چشم پوشی کی ہے۔ بول چال میں یہ لفظ ایسے اور الفاظ کی طرح، صرف پسکون ثانی مستعمل ہے اور اردو میں اب اس کی یہ حرکات قابلِ قبول ہیں۔ یہ فقہین کو غلط تو نہیں کہا جاسکتا، اس بنا پر کہ نظم میں کبھی نہ کبھی یا کہیں نہ کہیں مل سکتا ہے، البتہ بول چال میں صرف پسکون دوم ہے۔

”خفلی“ بھی بول چال میں صرف پسکون دوم آتا ہے۔ اس طرح نظم بھی کیا گیا ہے: ماں کی خفلی سے ہے بہت ڈرتی اُس کے تیور ہے دیکھتی رہتی

حالی (جواہراتِ حالی)

نور میں لکھا گیا ہے کہ: پہنچ اول و دوم صحیح ہے، اور پسکون دوم غلط؟ مگر اس کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ فقہین کا تعلق فارسی سے رہے گا، اور اردو میں اس کو پسکون دوم ہی مانا جائے گا۔ آصفیہ میں اس کو پسکونِ فا (خفلی) ہی لکھا گیا ہے اور اردو کے لحاظ سے یہ بالکل صحیح ہے۔

یہاں پر ایک وضاحت کی ضرورت ہے: آصفیہ میں ”خفلی“ کو اردو لکھا گیا ہے۔ یہ تو صحیح ہے کہ اردو میں یہ لفظ پسکون دوم ہی ہے، مگر موافق کے اندازِ نگارش سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید وہ اس لفظ کو برا اعتبارِ اصل اردو سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لفظ فارسی الاصل ہے۔ ”خف“ ”گر فغلی گلو“ کے مفہوم میں آتا ہے، اُسی سے ”خفلی“ بن گیا ہے، جس کے حقیقی معنی تو ہیں: ”گلو فشر دگی“، اگر فشر راہِ نفس“ (فرنگیہ کبیر) لیکن بہ طورِ مجاز، ناراضی کے مفہوم میں بھی استعمال ہوا ہے: ”در اصل بہ معنی افسردگی گلوست، و بہ معنی مضطرب و غضب و آزد دگی خاطر مجاز باشد“ (غیاث اللغات)

۔ غلّی، بہ منجّ اول و دوم [ازخفّ (خفک)، ہی (مصدری)] در پہلوی
 حالت فشر دگی گلو و جس نفس۔ اضطراب خاطر۔ کمی و فشر دگی
 ہوا۔ (حاشیہ بر ابن قاطع، تہران اڈیشن)۔

فیہن نے غلّی کے ساتھ ساتھ ”خفا“ کو بہ معنی ناراض، فارسی لکھا ہے۔ یہ
 صحیح نہیں۔ فارسی میں ”خفّ“ ہے، اور اس کے معنی فشر دگی گلو ہیں۔ ”خفا“ بہ معنی ناراض،
 فارسی میں نہیں، یہ اردو میں ”خفّ“ کی ہند صورت ہے۔

موتفین قاموس نے لفظ ”جمد“ کو بہ ضمّ اول و دوم، اور بہ فتح اول و سکون دوم
 لکھا ہے۔ اردو میں بہ ضمّ اول و دوم تو مستعمل نہیں۔ اگر کہیں نظم میں اس طرح آیا ہے، تو
 اُسے ضرورت شعری کا کرشمہ سمجھنا چاہیے۔ استعمال عام کو اُس سے علاوہ نہیں بہ ضمّ اول
 و سکون دوم (مجمّد) اردو میں استعمال کیا گیا ہے لیکن نظم میں۔ بول چال میں اس کی
 ایک اور ہی صورت ہے، یعنی جیم پر پیش، میم پر زیر، عین اورہ دونوں ساکن۔ ایسے
 کئی لفظ ہیں جو عوام و خواص، سب کی بول چال میں اسی طرح مستعمل ہیں، جیسے ”قلعہ“
 کراصل میں قی پر زیر ہے اور لام ساکن ہے، مگر گفتگو میں یہ فتح لام و سکون عین و
 ہ آتا ہے۔ ایسے الفاظ کی اس صورت کو بھی تسلیم کر لینا چاہیے ”جمد“ نئے جمعات
 بنا ہے، اور اس لفظ میں یہ تلفظ پورے طور پر نمایاں ہے۔ — آصفیہ میں
 ۔ جمّد“ کو صرف بہ فتح اول و سکون دوم و منجّ سوم (مجمّد) لکھا گیا ہے، لیکن جمعات
 کو بہ فتح اول و کسر دوم و سکون سوم (مجمّعات) لکھا گیا ہے۔ یہاں پر آخر کا استعمال
 عام نے موافق کو مجبور کر ہی دیا۔

نور میں پختیتین اور بہ فتح اول و سکون دوم لکھنے کے بعد، مزید لکھا گیا ہے کہ پیش
 بول چال میں جما ہے، جمّد نہیں ہے۔ ”موتف نے بول چال کا لفظ ”جما“ لکھا ہے!
 تلفظ کی مدد کو یہ صورت ٹھیک ہے، لیکن تحریر میں ”جمّد“ ہی رہے گا۔ یعنی لکھا جائے گا

”جمد“ اور پڑھا جائے گا۔ ”بجاء“ اس ”بجاء“ کو الف سے لکھا جائے گا۔ یہ گویا نیا لفظ بن گیا۔

مختصر یہ کہ اردو میں یہ لفظ بہ متم اول و سکون دوم و فتح سوم (جمد) بھی ہے اور جمعد بروزن ”ہما“ بھی۔ اور بہ مختصین (جمد) کو عربی سے مخصوص سمجھا جائے گا اور اردو سے غیر متعلق۔

”اس“ جمعات“ کو آصفیہ میں ”جمعات“ (بکسریم) اور نور میں بہ فتح یم ”جمعات“ لکھا گیا ہے۔ یہ لفظ دونوں طرح سننے میں آتا ہے، اس بنا پر، اس کی دونوں صورتوں کو تسلیم کیا جائے گا۔

فوق البعڑک، فی زمانہ، قرآن

”فوق البعڑک“ اس کی ترکیب غلط اور بے معنی ہے۔ ”قاموس“۔ یہ ترکیب اردو سے قواعد غلط سہی، لیکن بے معنی ہرگز نہیں؛ بل کہ جو مفہوم اس مرکب سے ادا ہوتا ہے، وہ کسی دوسرے لفظ سے ادا نہیں ہوتا۔ اردو میں خلاف قاعدہ بنے ہوئے بہت سے کارآمد لفظ متعل ہیں، اور یہ لفظ بھی انہی میں سے ایک ہے۔ ایسے سب الفاظ کو اب اردو کے صحیح الفاظ میں شامل سمجھنا چاہیے۔ آخر لکھنوی مرحوم نے لکھا تھا، ”فوق البعڑک“ قاعدے سے یقیناً غلط ہے، مگر ہم نے نہ معلوم کتنے ایسے لفظ گڑھے لیے ہیں، اور ان کا استعمال اس لیے جائز ہے کہ زبان میں ان کا بدل موجود نہیں ہے۔“ (رسالہ الحوا، اکتوبر ۱۹۵۵ء)۔ سرشار نے جام سرشار (ص ۲۲۹) میں لکھا ہے: ”میں“ فوق البعڑک لباس زیب تن کیے اتراتی پھرتی تھی تو اس عبارت میں ”فوق البعڑک“ کی جگہ کوئی لفظ رکھ دیجیے، یہ بات پیدا نہیں ہوگی۔

نور میں یہ لفظ موجود ہے، مگر اس کو عوام ”سے“ منسوب کیا گیا ہے۔ آصفیہ میں

اس سے زیادہ قطعیت کے ساتھ اس کو غلط العوام " لکھا گیا ہے۔ اب ان اندراجات کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ یہ لفظ کس طرح استعمال میں آتا ہے، اُس کی سبب اجماعی مثال یہ ہے کہ موقف آصفیہ، جنہوں نے اُس کو غلط العوام " لکھا ہے، خود اس کے استعمال کرنے والوں میں سے ہیں؛ "ذوق برق ہو کر آنا" کے ذیل میں انہوں نے لکھا ہے:

"بن سہر کر آنا، فوق البصرک بن کر آنا" اس کے بعد کچھ اور کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

موتفین تاموس نے "فی زمانہ" کے بجائے "فی زمانہ" بولنے کی فرمائش کی ہے۔ موقف نور نے بھی اس کو عوام کے حوالے کر دیا ہے؛ "فی زمانہ" کے ذیل میں لکھا ہے:

عوام اس جگہ فی زمانہ بولتے ہیں۔ اصل لفظ "فی زمانہ" اچھا خاصا ثقیل مرکب ہے۔ اردو والوں کی خوش مذاقی نے اگر اس کو تراش کر "فی زمانہ" جیسے سبک لفظ میں بدل دیا ہے تو اس پر تو خوش ہونا چاہیے۔ ہر صورت، ارباب لغت کچھ بھی کہیں، یہ لفظ (فی زمانہ) اردو کا ہے اور اس کا شمار بالکل صحیح اور فصیح الفاظ میں کیا جائے گا۔ آصفیہ میں "فی زمانہ" کے سامنے "ع + ف" لکھا ہوا ہے، مگر یہ اردو کا تراشیدہ لفظ ہے۔

ہر حال قابل ذکر بات یہ ہے کہ موقف نے اس کو غلط کہا ہے نہ غلط العوام " لکھا ہے۔

"قرآن" کے ذیل میں لکھا گیا ہے؛ "بجائے الف ممدودہ، الف مقصورہ سے قرآن" کہنا غلط ہے "تاموس"، یہ غلط فہمی کہ "قرآن" بروزن زبان غلط ہے، موتفین تاموس تک محدود نہیں، بعض اور لوگ بھی اس کا شکار ہوئے ہیں۔ غالباً سب سے پہلے غالب نے اس طرف توجہ کی۔ شہاب الدین احمد خاں ثاقب کو ایک خط میں لکھا ہے؛ "میا زاد اللہ! امیر خسرو قرآن کو، کہہ سکوں، اسے قرشت رالف ممدودہ ہے، قرآن، بروزن پُران لکھیں گے۔ یہ دونوں غریب، دو گدھوں کی ہیں۔ شاید ایک نے مقطع میں حاقظ اور ایک نے مقطع میں خسرو لکھ دیا ہے" (خطوط غالب، ستمبر، ص ۱۰۹)۔ مولانا انظم طباطبائی نے شرح غالب میں یہی اعتراض تہجہ کے اس سمرے پر کیا ہے، اگر اُسے شجہ بن کے جملہ قرآن کا۔

اس لفظ میں اسلماً ساکنہ فارسی نے تصرّف کیا ہے اور اس کو بروزنہ زبان نظم کیا ہے۔ قرآن ہر زبان کو، عوام کا گڑھا ہوا لفظ غالباً مدوحوں سے سمجھا گیا، ایک قویہ کہ فارسی کے اس تصرّف کا ذکر، فارسی کے لغات میں نہیں ملتا۔ دوسرے یہ کہ ہندی کے بعض دوہوں میں یہ اس طرح آیا ہے، مثلاً،

چندت پوتھی باجنتے، ملتا پڑے قرآن لوک دکھا والا کہ پڑھو، نہیں ملے سکواں
(آصفیہ)

ان وجوہ سے یہ سمجھا گیا کہ یہ الف مقصورہ غیر مستند ہے۔ فارسی کی چند اسناد درج ذیل ہیں،

سرور دستم کہ باشد رستہ اندر بوستان بوستان ہرگز نہ دیدم دستہ بر سر و دواں
مدح او خواں، مگر قرآن خواندن زانی از قیاس تا ہی خوانی مدح او، ہی خوانی قرآن
(فرخی)

الاماں اے دل کہ زحمت و دشت آمد اماں زیں مغیلاں گاہ غولاں ہر گراں شود گراں
گود داری چچ فرزندانے شرف داری کہ حق ہم شرف زیں دارو، ایک لم پلہ خواں لڑ قرآن
(غاقانی)

ماہ رمضان آدمے ترک سمن بر بر خیز و مراسیم و سجادہ بیاد
باسے پشبتاں شد و در صف نخستیں بنشت و قرآن خواند و بچنانہ ہی سر
(کاکانی)

مخدومی قاضی عبدالودود صاحب نے غلاب پر مشیتِ محققہ میں قرآن مبالغہ مقصورہ کی متعدد سندیں پیش کی ہیں، ان میں سے کچھ یہ ہیں،

آنم کہ ہیگویم، پانڈ مستران است (ہندی)
دکشتن اس قصہ ہر اہل مشران است (منوچہری)

آیات تشران و شعر حجت (ناصر)

اے خواندہ بعد جلد و تعلید تشران را

ملکت جو قرآن اور جو معانی قرآن است (منوچہری)

سہ قرآن، قرآن نکوداند (سنائی)

اردو میں بھی اس کی تقلید کی گئی ہے۔ گفتگو میں تو اکثر یہ لفظ بغیر مد سنانے میں آیا

ہی ہے، اس طرح نظم بھی کیا گیا ہے، مثلاً،

مت مانیو کہ ہو گا یہ بے درد اہل دیں گراؤے شیخ، پہن کے جامہ قرآن کا

تیر (کلیات مرتبہ آتشی، ص ۴۹)

یار، مجھ کو تشران کی سوگند جی چلا، تیری جان کی سوگند

میر سوز (دیوان سوزِ ظلی، ملوکہ انجمن ترقی اردو ہند، ورق ۴۵ ب)

کما قسم، بھوٹ بولے ہے کتنا چپ ہو چپ، بس قرآن کے صدقے

انشا (تذکرہ میر حسن)

مت دیجو اپنے مصحفِ رخسار کی قسم رکھ جائے گا ابھی کوئی ہاتھ اس قرآن پر

میرامانی اسد (مجموعہ نغز، جلد اول)

سب حفظ قرآن دے کے براؤ اک رکھتے ہے آئے ٹکڑ، یاو

قائم چاند پوری (شہنوی درجہ اکول، دیوان شہنواز آفس لندن، ص ۱۱)

یہ دل رہا کا ہے قصہ جو لوگ پڑھتے ہیں قرآن میں، وہی انجیل میں، وہی ہر زبور

احمد گجراتی (دو دنیا یاب فرادہ بیاضیں، ص ۱۱)

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں

پڑھتے ہیں آدمی ہی نماز اور قرآن یاں اور آدمی ہی ان کی چڑاتے ہیں جو تیاں

جوان کوٹاڑا ہے، سودہ بھی ہے آدمی (نظیر اکبر آبادی)

آصفیہ میں فارسی کے اس تصرف کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اُس میں صرف قرآن ہے۔ قرآن کا جامہ پہننا کی سند میں میر کا وہ شعر بھی لکھا گیا ہے جس میں قرآن ”نظم ہوا ہے“ مگر اس سلسلے میں کچھ مراحت نہیں کی گئی۔ اور میر کے اُس شعر میں بھی قرآن ”چمپا ہوا ہے“۔ یہ ظاہر اس سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ میر کے اس شعر میں مولف کے نزدیک قرآن ہی نظم ہوا ہے۔ اور یہ کہ اس لفظ میں کسی طرح کا تصرف نہیں ہوا! یہ دونوں باتیں درست نہیں۔ فوراً میں الہدیہ مراحت ملتی ہے کہ: ”فارسیوں نے قرآن پر وزن زبان بھی کہا ہے“ اور یہ بھی لکھا گیا ہے کہ: ”اردو میں عورتیں قرآن پر وزن زبان ہی بولتی ہیں“ اس میں یہ اضافہ کرنا چاہیے کہ عام لوگ بھی اس طرح بولتے ہیں۔ یہ ہر حال، اردو میں اس لفظ کو دونوں طرح صحیح مانا جائے گا۔

جلال نے سرائے زبان اردو میں قرآن کا جامہ پہننا لکھا ہے، اُس میں قرآن بغیر مدہی ہے سند میں بھی میر کا وہی شعر لکھا گیا ہے جس میں قرآن ”بالف مقصورہ“ یا ہے! مگر چوں کہ انھوں نے مراحت نہیں کی، اس لیے بات پوری طرح واضح نہیں ہوتی، شک سا رہ جاتا ہے۔

فہمایش، رہایش، پیدایش، زیبایش، گریایش:

”رہایش، سکونت و قیام کے معنی میں جاہل کہتے ہیں“ (تاموس)۔ یہ خیال صرف موثقین تاموس کا نہیں، کئی اہل علم نے اردو کے اس مستعمل لفظ کو کثر جمالت بتایا ہے۔ اردو لکھنوی مرحوم نے لکھا ہے: ”رہایش کی وضع بھی صحیح نہیں، کہ کسی زبان کے مخصوص حروف کا امتزاج غیر زبان کے کلمات کے ساتھ درست نہیں“ (نظام اردو، ص ۲۰)۔ پنڈت کیتلی نے شوخی قدوائی کا یہ قول نقل کیا ہے: ”سنسکرت خیز اردو رہایش وغیرہ سے بحث فضول ہے۔ یہ جھٹلا کے تراشے ہوئے ہیں۔ فقہا ان کا استعمال

نہیں کرتے۔ (منشورات، ص ۲۲۹)

آرژد صاحب نے جس قاعدے کا ذکر کیا ہے، وہ اردو میں ہزار جگہ لوٹ چکا ہے۔ فارسی کے معلوم کئے الفاظ کے آگے عربی کے حروف جمع بڑھا کر جمع بنائی گئی ہے۔ یہی نہیں، خالص اردو الفاظ کے ساتھ بھی یہ سلوک کیا گیا ہے، جیسے، مکشورات، دیہات، بہتات، فرایشات، خواہشات وغیرہ۔ ایسے اور بھی قاعدے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اس بنا پر رہائش کے غلط ہونے کی یہ کوئی دلیل نہیں۔

رہائش، رہنا سے بن گیا ہے۔ یہ قیاس فارسی قواعد کے عین مطابق ہے۔ فارسی میں رہائش ہے، لیکن اُس کے معنی وہی ہیں جو رہائی کے ہیں (حجیم، نقلی معنی مام بات ہے اور اس میں کچھ عیب نہیں۔ عربی میں جہامت، ترقد، رقم، مذاق، محنت، غلیظ، بخار، جلوس، جن معانی میں ہیں، اردو میں ان کے علاوہ دوسرے معانی میں بھی ان کو استعمال کیا جاتا ہے۔ یہی نہیں، بہت سے ایسے لفظوں کے اصلی معنی اردو میں مراویے ہی نہیں جاتے، جیسے: ترقد، محنت، غصہ وغیرہ۔

انٹانے درباے لطافت میں رہائش، کو رہنا کا حاصل مصدر لکھا ہے (ترجمہ درباے لطافت، ص ۲۲۲) سند کے لیے یہ کافی ہے۔ آصفیہ دونوں میں یہ لفظ موجود ہے، مگر دونوں لغات میں اس کو حوام سے متعلق بتایا گیا ہے۔ یہ تحدید قابل قبول نہیں۔ اس کا شمار عام الفاظ میں کیا جائے گا۔ نور میں اس کے حسب ذیل معنی لکھے ہوئے ہیں: قیام، بود و باش، سکونت، گنجائش، ضبط، برداشت، لیکن ضبط، گنجائش اور برداشت کے معنوں میں یہ لفظ مجھے کہیں نہیں ملا۔ مولف نے نہ کوئی سند پیش کی ہے، نہ حوالہ دیا ہے۔ جب تک کوئی مثال نہ ملے، اُس وقت تک یہ معنی محض نظر رہیں گے۔

رہائش کی طرح فہمائش کو بھی غلط کہا گیا ہے۔ غالب نے اپنے انداز میں

لکھا ہے :

”فہمائش کا لفظ میاں بہت اولد میاں مجتہ اور لاد گینیش واس ولد بھروں ناتھ
کا گھڑا ہوا ہے۔۔۔۔۔ فیصدین فارسی الاصل نہیں ہے، مصدر جھل ہے۔ فہم فہما
عربی الاصل ہے۔۔۔۔۔ اس کا معنی میں یہ کہیہ ہے کہ لغت اصل عربی آخر کو امر میں
جاتا ہے۔ حاصل بالعید فہمش اور طلبش ہونا چاہیے : ”فہم“ تھا صیغہ امر ”فہمہ“
سے نکلا تھا۔ الف اور ی کہاں سے آیا : ”فہائی“ تو نہیں جو فہمائش درست
ہو : (ہنام میر مہدی بھرتو ج)

یہ لفظ علی الاعظم غائب، اردو میں مستعمل رہا ہے۔ اور اس میں خاص دوام کی کچھ قید
نہیں، اور سندھ میں کمرہاں سے اس کی بیسیوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً
معرکہ چکبست و شہر میں منشی سجاد حسین کا ایک مضمون ص ۲۹۱ سے شروع ہوتا ہے :
اس مضمون میں ”فہمائش“ سات آٹھ جگہ آیا ہے۔ آزاد کی تصنیف دربار اکبری میں یہ
جگہ جگہ لتا ہے۔ میرے سامنے اس کتاب کا وہ اڈیشن ہے جس کو گھنٹو کے مکتبہ کلیاں
نے شائع کیا ہے، اس میں ص ۲۰۰، ۲۹۰، ۲۹۳، ۲۹۹، ۲۹۱، ۲۹۳، ۲۹۸،
۵۲۰، ۵۲۲، ۵۸۹ پر اس کو دیکھا جاسکتا ہے۔ امر او جان ادا میں بھی یہ لفظ موجود ہے :
”مگر ایک مشکل ہے، جب کسی کو کسی بات کی فہمائش کی جائے“ (نیا اوارہ لاہور ص ۳۸)
نیز ص ۹۸۔ یا جیسے : ”بعض رسالے عام اہل اسلام کی فہمائش کے لیے اردو میں لکھے“
(آب حیات، ص ۲۹)۔ اس کی بیسیوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

جس طرح ”فہمائش“ بنا ہے، اُسی طرح ”زیبائش“ بنا ہے۔ مضارع ”زیبہ“ ہے،
اُس سے ”زیبش“ بن سکتا تھا، مگر بنا ”زیبا“ سے ”زیبائش“ نہ تاسی عبد اللہ صاحب
نے لکھا ہے : ”زیبائش، ایرانی نظم و نثر میں آج تک نہیں ملا، اردو میں ہے اور ہندی
فارسی میں بھی ہو تو ہو“ (تقدیر غالب، ص ۳۱۲)۔ اردو میں اس کو بے تکلف استعمال

کیا گیا ہے اور ہر ترکیب فارسی بھی لکھا گیا ہے، مثلاً،

آرایش گلشن کے لیے جہانِ مرغیں زیبایشِ فنر کے لیے تنگِ قبائ

ذوق (دیوان مرتضیٰ آزاد، ص ۳۰۵)

دیوان ہوں تیرا، مجھے کیا کام کہ لوں گل زیبایشِ سرکوبیں میرے داغِ جنوں، گل

ذوق (دیوان مرتضیٰ آزاد، ص ۱۲۰)

جس طرح ”زیبا سے“ زیبایش۔ اور ”ربا سے“ ربایش۔ بنا، اُسی طرح پیدا سے پیدایش بنا ہے۔ یہ لفظ فارسی میں استعمال ہوا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے نقدِ غالب، ص ۳۱۲۔ اردو میں عام طور پر مستعمل ہے۔ صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے،

کون تجھ سا ہے ولی اللہ، لے مولا میرے کعبہ، پیدایش سے تیری، مگر خدا کا ہو گیا
آتش (کتبِ طبع نول کشور، ص ۳۲۱)

گرایش نیا لفظ ہے۔ میں نے اس کو ایک معروف کپڑا بننے کے اشتہار میں سنا تھا۔ غالب پچھلے سال (یعنی ۱۹۹۷ء میں) ”وگیا پن کاری کرم“ میں اس بن کے ادنیٰ کپڑوں کے اشتہار میں ”گرایش اور آرام کے لیے“ کا ٹکڑا بار بار گھسنے میں آتا تھا۔ مجھے یہ لفظ بہت دل چسپ اور کارآمد معلوم ہوا۔ اس کو بھی پیدایش اور ربایش کی طرح صحیح مان لینا چاہیے۔ ”گرا“ نئے گرایش۔ بہ خوبی بن سکتا ہے اور نہایت خوبی کے ساتھ مفہوم کو ادا کر سکتا ہے۔ نئے لفظ اس طرح بھی بنتے ہیں۔

گرہ، زرہ، ہشکریہ،

”زرہ، پرستخ راے مہلہ غلط ہے“ (قاسم)۔ نور میں بھی اس کو صرف ہر کپڑا اور دھانی لکھا گیا ہے۔ یہ فارسی کی پیروی ہے۔ فارسی میں یہ لفظ، ہر کپڑا اور دھوم بھی ہے،

مگر اردو میں یہ یکسر اول و منج دوم مستعمل ہے :

فیضان ہے دل مقیم اُس کی رہ کا غرض کیا کہ محتاج ہو بادشہ کا
خندنگ آہ کالے فلک بے طرح ہے بھروسہ تو تاروں کی ہمت کز زہ کا
تری آشنائی میں کیا میں نے پایا دیا نقدِ دل اور اپنی گرہ کا

انشاء (کلام انشاء، ۲۳۷)

مروِ سپاہی ہے وہ، اُس کی درہ لا الہ سائے شمشیر میں اُس کی پنہ، لا الہ
اقبال (مسجدِ قرطبہ)

”زہ“ کی طرح فارسی میں ”گرہ“ بھی یکسر تین ہے (گہرہ، اردو میں اس کو بھی بہ فتح ۴ فی استعمال کیا گیا ہے۔ انشاء کے مندرجہ بالا اشعار میں یہ قافیہ بھی موجود ہے۔ یہ دونوں لفظ بول چال میں تو صرف بہ فتح دوم آتے ہیں، البتہ فارسی کی رعایت سے ان کو یکسر دوم بھی نظم کیا گیا ہے، جیسے :

نعرہ جدا، مدائے بگیر و پیرہ جدا گوشے کہاں سے دور، تو گوشوں پہ زہ جدا
بکتر جدا زمین پر ٹکڑے، زہ جدا فیروں کو دیکھے تو گرہ سے گرہ جدا

انیس (روح انیس، طبع اول ص ۱۱۱)

غلّ تھا کہ وہ چمکتی ہوئی آئی، یہم گری برہمی سے اڑ گئی وہ سناں، یہ گرہ گری
ترکش کٹا، کہاں کیا فی سے زہ گری یہ سرگرا، وہ خود گرا، یہ زہ گری
انیس (ایضاً ص ۱۸۵)

اب ان فظوں کی محدثوں حرکات کو صحیح مان لینا چاہیے، مگر اس تفصیل کے ساتھ کہ بول چال میں یہ دونوں لفظ بہ فتح دوم آتے ہیں اور یہ اردو کا تصرف ہے۔

”شکرۃ بہ تشدید کہنا چاہیے؟“ (تاموس) سند میں زند کا یہ شعر لکھا ہے :

زبانِ تامر ہے، کیوں کر اُس کا شکرۃ ادا ہوگا عنایت کا، توجہ کی نظر کا، مہربانی کا

میرے سامنے کلیاتِ رندِ مطبوعہ نول کشور پریس کان پور ہے، اُس میں یہ شعر اس طرح ہے:
 زباں قاصر ہے، کیوں کر شکر یہ اُس کا ادا ہوگا عنایت کا، توجہ کی نظر کا، مہربانی کا
 نور اللغات میں یہی شعر بہ تخفیف یا کی سند میں لکھا ہوا ہے، مگر اُس میں پہلا مصرع
 یوں ہے: زباں قاصر ہے، اُس کا شکر یہ کیوں کر ادا ہوگا۔ یہی صورتِ معین الشعر میں ہے۔
 یہ ہر صورت، یہ شعر برائے شتد کی سند میں نہیں پیش کیا جاسکتا۔ مؤلفین قاموس کا یہ کہنا کہ
 ”شکر یہ“ برائے شتد کہنا چاہیے، اس حد تک ضرور صحیح ہے کہ بعض شعرا نے اس کو برائے
 شتد و نظم کیا ہے۔ نور میں محسن کا کوڑی کا یہ شعر سندا لکھا ہوا ہے:
 طے شکر یہ میں اُس بُتِ شکن کو خوانِ صدفِ منت
 یہ مہمانی ہوئی باغِ خلیل ابنِ آذر میں

(کلیاتِ نعتِ محسن، نامی پریس ص ۲۰۸)

لیکن عام طور پر تحریر و تقریر میں برائے مختلف ہی استعمال ہے۔ یہ لفظ عربی کا نہیں
 اردو نثر اور ہے؛ اس بنا پر، بالکل ضروری نہیں کہ اس میں ہی شتد ہو۔ ضرورتِ شعری
 کی بنا پر اس کو برائے شتد و نظم کیا گیا ہے، جیسے انشا کا یہ شعر:
 حمد کے بعد بہ شکر یہ ادا کرتا ہوں شکر صد شکر ہے اے حمد و ثنا کے الیق
 (کلامِ انشا ص ۲۹۱)

مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ استعمالِ عام پر بھی اس کا اثر پڑے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔

حقاً، شجاعت، ہمت، ہمتک :

”حقاً، بالضم غلط ہے“ (قاموس)۔

یہی دسے موقعِ نور کی ہے: ”بالفتح صحیح و بالضم غلط“ صاحبِ آصفیہ نے الفاظ

میں تو اس کی مراحت نہیں کی مگر س پر زیر لگا ہوا ہے؛ مطلب اس سے بھی یہی نکلتا

ہے۔ یہ لفظ بہ لحاظِ اصل بہ فتحِ اول ہے، مگر اردو میں اس کو عام طور پر بہ ضمّ عین استعمال کیا جاتا ہے۔ دو چار عربی دانوں کے سوا اور کوئی بہ فتح عین نہیں بولتا۔ بہتر یہ ہوگا کہ اس کی دونوں حرکات کو تسلیم کر لیا جائے۔

حقاً کی طرح شجاعت بھی اصلاً بہ فتحِ اول ہے۔ موقوفین دور و قاموس نے بہ منہجِ اول (شجاعت) کو صحیح اور بہ ضمّ اول (شجاعت) کو غلط بتایا ہے۔ اصفیہ میں بھی شس پر زیر ہی لگا ہوا ہے یہ لفظ بھی زبانوں پر بہ ضمّ اول ہے۔ بہ فتحِ اول میں اجنبیت کا شائبہ بھی شامل ہو جاتا ہے اردو میں بعد اس کو بہ ضمّ اول ماننا چاہیے۔

یہ عرض کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ اس وزن کے کئی لفظوں میں فارسی جدید میں تصرف ہوا ہے۔ اس فہرست میں یہ لفظ (شجاعت) بھی شامل ہے کہ اس کو اردو کی طرح بہ ضمّ اول لکھا گیا ہے۔ فرہنگِ آموزگار میں ایک عنوان ہے: تغیراتِ ہم کہ در لغاتِ عربی دادہ شد۔ اس کے ذیل میں لکھا گیا ہے: تغیر در حرکات، مانند مبارزہ، مباحثہ، مبالغہ (باکسرہ حرف چہام بجای فتح) و شجاعت باضمّ مشین بجای فتح؟

محبت اور مسرت بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ خاص لوگ ان کو اصل کے مطابق بہ فتح یم بولتے ہیں، اور عام لوگ بہ ضمّ یم۔ ان دونوں لفظوں میں حرکات کا یہ اختلاف، حقاً اور شجاعت کے مقابلے میں ذرا مختلف حیثیت رکھتا ہے؛ اس لیے محبت اور مسرت میں یم کی دونوں حرکات کو صحیح مان لینا چاہیے (محبت و مسرت۔ مسرت، مسرت)۔

• چنگ بہ فتحین کہنا غلط ہے۔ (قاموس)۔

اصفیہ میں بھی ت پر جزم لگا ہوا ہے (چنگ)۔ اردو میں یہ لفظ اصل حرکات کے ساتھ ساخ، بے فسح دوم بھی مستعمل ہے؛ اس لیے

اس لفظ کو دونوں طرح سے ماننا چاہیے۔

تو ر میں پہلے تو یہ لکھا گیا ہے ”الف فتح صحیح“ و بہ فتح اول و دوم غلط، لیکن اردو میں بیگمات کی زبان پر یہ فتح اول و دوم ہی ہے۔ ”پھر بہ فتح دوم کی سند میں واجد علی شاہ کا یہ شعر لکھا ہے :

محمکوں نے ہم پر منسج پائی کیا کیا ہم نے چٹک اٹھائی
ان اسناد کے بعد یہ لکھنا کہ ”بہ فتح اول و دوم غلط“ ہے، یا یہ لکھنا کہ ”بہ فتح دوم (صرف) بیگمات کی زبان پر ہے، کیوں کہ صحیح ہوگا۔ بہ ہر صورت، اردو میں زبانوں پر اکثر بہ فتح دوم اور کم تر بہ سکون دوم ہے۔ دونوں صورتیں قابل تسلیم ہیں۔

مہوس، مرغن، ملتب، مفرور : مہوس غلط ہے۔ ہوس سے بنایا ہے۔
جیسے روغن سے مرغن، (تاموس)۔ مفرور، غلط ہے۔ عربی میں مفرور کی جگہ فزو
فار آتا ہے، جو فارسی و اردو میں متعل نہیں ہے مفرور کی جگہ، فرار شدہ کہہ سکتے ہیں (تاموس)،
غیبت ہے کہ مولفین تاموس نے فرار شدہ ہی بولنے کی فرمائش کی۔ اگر یہ لکھ
دیتے کہ مفرور کی جگہ ”فز“ یا ”فار“ ہی بولنا چاہیے، تو کوئی کیا کر سکتا تھا! مرغن، روغن
سے، اور مہوس، ہوس سے بنالیے گئے ہیں اور اس طرح کے الفاظ کی ایک طویل فہرست
پیش کی جاسکتی ہے جو عربی الفاظ کے قیاس پر فارسی میں یا اردو میں بن گئے ہیں۔ مثلاً
فلک سے فلاکت اور مفلوک، فارسی میں بنالیے گئے ہیں، اسی طرح روغن سے مرغن،
اردو میں بن گیا ہے۔ کسی طرح کی تفریق کے بغیر یہ سب لفظ، اردو کے مستعمل اور قطعا
صحیح اور فصیح لفظ ہیں۔

آصفیہ میں ”مفرور“ اور ”ملتب“ کو عربی لکھا گیا ہے۔ یہ درست نہیں۔ ”مرغن“
اُس میں موجود ہی نہیں، البتہ ”مہوس“ کو گیمیاگر کے معنی میں اردو لکھا گیا ہے اور یہ

درست ہے، کیوں کہ کیا اگر کے معنی میں یہ اردو نثر اور ہے۔ "تور میں مہوس" کو صحیح طور پر "اردو" لکھا گیا ہے، البتہ "مفرور" کو اس میں بھی عربی لکھا گیا ہے۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے یہ درست نہیں۔ "ملتب" کے ذیل میں مولف "تور" نے لکھا ہے: "فصلے متاخرین اس جگہ باب" ہی فصیح سمجھے ہیں۔ یہ قید بھی غیر مناسب ہے۔ مدتیغ اور معتوب اور مقروض کی طرح، اسے بھی عام الفاظ میں شامل سمجھنا چاہیے۔ مہوس کی بعض اسناد پیش کی جاتی ہیں، "تور" و "آصفیہ" میں اسناد موجود نہیں:

لے مہوس جولی خاک دریچا ناں کی ایک چٹکل میں مسِ قلب ہے گندن کیا

سبا (دیوان ص ۳۸)

بے تاب دل کو مری کیا سمجھے مہوس اس نسخے سے ہم کرتے ہیں سیاب گفتہ

انشاء (کلام انشا ص ۱۸۹)

اہتوں سے بڑے دل کے بنالیتے میں جوڑا مکار مہوس میں زمانہ ہے غسل کا

نور (ریاض البحر ص ۱۳)

اکسیر پر مہوس: اسناد ناد کرنا بہتر ہے کیا سے اپنا گداز کرنا

میر تقی (دیوان، مکتبہ جامعہ دہلی ص ۱۵)

سنا جائے ہے اک مہوس کا حال کہ رکھتا ستائنت کیمیا کا خیال

قائم

قدم یار تلک پہنچوں تو پاس ہوں میں لے مہوس! تجھے اکسیر مبارک دے

میر تقی

مزیب، مزلف، ملتب: یہ سب الفاظ استعمال کیے گئے ہیں:

وہ چھوٹے چھوٹے خورد و خوراک میں تنگ بڑا سے اُن قدوں پر مزیب سلاج جنگ

غلام عظیم آبادی درمائی شاعر، اول ص ۱۳۱

سادگی سے سبزو رخسار انسب ہو گیا کیا مزلف ہوتے ہی چہرہ مزین ہو گیا
(رفق (جموہ وادین رشک ص ۷۷)

نگِ ستغنا ہے، ہوں منت کش ساقی اگر شیشہ دل میں لمبتب بارہ خوباب ہے
نفاں (دیوان ص ۱۲۹)

مؤلف رسالہ اصلاح نے لکھا ہے: متلاشی پر معنی تلاش کنندہ، مرغن پر معنی
روغن دار، یا اس قسم کے دوسرے الفاظ جن کا مادہ عربی نہیں، مگر ان کا اشتقاق
پر طور عربی ہوا ہے، اور عام طور پر لو لے جاتے ہیں؛ ان کا استعمال میرے نزدیک کچھ
مضائق نہیں (رسالہ اصلاح، ص ۳۰)۔

ذو معنی: اس کے متعلق لکھا ہے: عوام کہتے ہیں، کتب معتبرہ میں نہیں
پایا گیا (قاموس)۔ غیبت ہے کہ صاف صاف غلط نہیں کہا، ذکر شرعہ جہالت بتایا۔
اردو میں ”ذو معنی“ بالکل صحیح لفظ ہے، کتب معتبرہ میں ہوا نہ ہو۔ اصل لفظ ”ذو معنیین“
اردو میں بہت کم مستعمل ہے۔ چند خاص قسم کے پڑھے لکھے لوگوں کے سوا، اب شاید ہی
کوئی بولتا یا لکھتا ہو۔ بعض شعرا نے جو ”ذو معنیین“ نظم کیا ہے، وہ استعمالِ عام کے ذیل میں
نہیں آتا۔ عام طور پر ”ذو معنی“ ہی مستعمل ہے۔ دو مثالیں کتب معتبرہ کے ذیل میں آنے
والی دو کتابوں سے پیش کی جاتی ہیں: (۱) ”کہ مکرئی میں عورتوں کی زبان سے ”ذو معنی
بات بیان کی جاتی ہے“ (مقدمہ فرنگِ آصفیہ، جلد اول، ص ۶۱)۔ (۲) ”ذو معنی
مشققات مصدر کے استعمال کو بعض حضرات حسنِ کلام کا موجب سمجھتے ہیں (دخترِ موانی۔
رسالہ معانی سخن ص ۵۴)۔ اس فصل کا عنوان ہے: ”ذو معنی مشتقات مصدر کا
استعمال“۔ یہی نہیں، امانت لکھنوی نے اس کی جمع ”ذو معنیان“ بھی
نظم کی ہے:

بولے ذومعنیٰ اس ڈھب کی کڑھاجائے پھبتی ایسی وہ کہے گرم کر تجھ پر چا جائے
(داسوخت، المکت، بندہ ۱۳، مجمع الاشعار ہندی، مطبوعہ مطبعہ حیدری، ممبئی)

تو رہیں ذومعنیٰ کے ذیل میں "باسنی، ضد ہل کا" لکھا گیا ہے۔ یہ لحاظ اصل تو یہ درست ہے، مگر استعمال عام میں ذومعنیٰ "اس مفہوم میں استعمال نہیں کیا جاتا۔ اس کی جگہ "باسنی" کہتے ہیں۔ اردو میں ذومعنیٰ "ایسے لفظ یا بات کو کہتے ہیں جس میں پہلو داری ہو، دو معنوں تکلتے ہوں۔ اصلاً اس معنی میں ذومعنیٰ "تھا، مگر استعمال عام میں اس کی جگہ ذومعنیٰ نے لے لی ہے۔ آصفیہ میں صحیح طور پر ذومعنیٰ کے صرف یہی استعمال اردو معنی لکھے گئے ہیں :
"ذومعنی ... وہ بات ہے جس میں کئی پہلو یا معنی تکلتے ہوں" مگر مولف نے اس لفظ کو اس معنی میں عربی لکھا ہے۔ یہ محلی نظر ہے۔ اردو لکھا چاہیے تھا۔ عربی کے لحاظ سے اس معنی میں ذومعنیٰ ہے۔ اس "ذومعنیٰ" نہ آصفیہ میں ہے نہ توری میں۔

حسین : لغات و کتب عربیہ میں حسین کا لفظ نہیں پایا گیا، صرف صاحب منتخب نے لکھا ہے ! لہذا خوب صورت، جمیل، حسن والا کے معنی میں مہشد ہے۔ (قاموس)۔

یہ لفظ المنجد میں بھی موجود ہے۔ نیاز فتح پوری نے غالباً موقعین قاموس کے اسی قول سے متاثر ہو کر سیلاب اکبر آبادی کے ایک مصرعے میں "خواجہ حسین" کی ترکیب پر یہی اعتراض کیا تھا (استعارات، اول، ص ۱۵۵)۔ المنجد میں اس لفظ کا موجود ہونا، موقعین کے اس قول کی تردید کے لیے کافی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ سائدہ اردو نے اس لفظ کو بہ ترکیب نظم کیا ہے اور اس کی جمع "حسیناں" بھی بنائی ہے :

شرم یاں لگ ہے کہ اچھے خط سے وہ دعا کر لے ہاتھوں سے نہ لے لیں حسین کا پردہ

جرات (تذکرہ سرود، ص ۱۹۰)

آخر مے گھر آ ہی گیا وہ بُہت حسین کچھ شک نہیں ہے قدرت پروردگار میں
 جلیل مالک پوری
 ہر طرف گل ہائے دنگار گلشن میں کھلے جیسے صبح عید یک جا ہوں حسیناں جہاں
 امیرینائی (مرآۃ الغیب)
 مئی آلودہ سراغِ شبنمِ حسیناں لکھے داغِ طرفِ جگر عاشقِ شہیدا کہے
 غالب
 نور و آصفیہ دونوں میں یہ لفظ موجود ہے، البتہ سند مذکور نہیں۔

دُشَق، خُسرُو، عَفْو، کُنِیت، مَوْتَفِینِ قَامُوس نے دُشَق کو کسرِ اول لکھا ہے۔ لغت میں بھی یہی صورت ہے۔ اردو میں بالعموم بہ فتح اول و کسرِ ثانی (اُدُشَق) مستقل ہے، اور اردو میں صرف یہی تلفظ قابلِ تسلیم ہے۔ نور و آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ ہاں، غیاث اللغات میں بہت تفصیل کے ساتھ یہ لکھا گیا ہے کہ تم کی حرکت میں ذرا سا اختلاف ہے، اُس کو بالفتح اور بالکسر، دونوں طرح کہا گیا ہے۔ یعنی ارباب لغت کے نزدیک یہ دُشَق "بھی ہے اور دُشَق "بھی۔ دال پر بہ ہر طور زیر ہے۔ اس سارے اختلاف کو فارسی و عربی سے متعلق سمجھنا چاہیے، اور اردو میں اس کو صرف بہ فتح اول و کسرِ ثانی (دُشَق) ماننا چاہیے۔

قَامُوس میں خُسرُو کو بہ فتح را لکھا گیا ہے (خُسرُو)۔ یہی رائے مَوْتَفِینِ نور اللغات کی ہے: "بالضم و فتح را"۔ آصفیہ میں اس کو بہ کسرِ اول و فتح سوم (خُسرُو) لکھا گیا ہے۔ اس لفظ کی حرکات میں خود فارسی کے ارباب لغت نے اختلاف کیا ہے۔ خانِ آرزو کی کتاب میں یہ کسرِ اول ہے۔ صاحبِ بہارِ نظم کی رائے میں بہ ضمِ اول و سوم ہے اور مَوْتَفِینِ غیاث نے بہ ضمِ اول کو غلط اور بہ کسرِ اول و فتح سوم کو مرعج بتایا ہے۔ یہ تفصیل بہارِ نظم

اور غیاث اللغات میں موجود ہے۔ اردو میں صورت یہ ہے کہ زبانوں پر ہضم اول و دوم (خُسرُو) ہے، نظم میں اس کو بہ فتح سوم، ضو، وغیرہ کا ہم تانیہ کیا گیا ہے۔ گویا حرف اول پر ہر حال میں پیش رہتا ہے اور حرف سوم پر اکثر پیش اور کم تر نہ برآتا ہے (ضرورت شعری کے نتیجے میں)۔ اردو میں اسی صراحت کے ساتھ، اس لفظ کی ان دونوں صورتوں کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ یہ کسر اول جیسا کہ آصفیہ میں لکھا گیا ہے، اردو میں مستعمل نہیں، اس کو فارسی سے متعلق سمجھنا چاہیے۔

”حنو“ کے متعلق لکھا گیا ہے: بہ فتح اول و ضم فاصح نہیں، ”قاموس“ — یہ قول درست نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ عربی میں یہ لفظ بہ سکون فاق ہے (عَفُو) مگر فارسی میں اس کو بہ ضم فابھی نظم کیا گیا ہے؟ فارسیاں بہ ضم تانیہ استعمال کردہ اندہ (ابہا برعم)۔ صاحب غیاث اللغات کے الفاظ میں بہ ضم دوم ”نوسے از تقریس است“ بہ ضم دوم کی سند میں یہ دو شعر لکھے گئے ہیں:

عضوِ کرم ازوے عملہامی زشت بہ فضلِ خودش آوردم در بہشت
(سعدی)

اگر سہوے بود دروے، حنفو کن دریدہ پردہ کارم، رفو کن
(ناصر خسرو)

اردو میں اس لفظ کو بہ سکون دوم اور بہ ضم دوم، دونوں طرح استعمال کیا گیا ہے۔ مثالیں کور میں موجود ہیں۔ جناب آثر لکھنوی مرحوم نے میرے خط کے جواب میں لکھا تھا: ”لکھنؤ میں بہ فتح اول و ضم دوم زبانوں پر ہے، مگر دادو معروف کے بدلے، دادو مجہول کے ساتھ بولتے ہیں“ — اردو میں اس لفظ کو بہ سکون دوم اور بہ ضم دوم، دونوں طرح صحیح ماننا چاہیے: عَفُو، عَفُو — یہ بات کہ دادو معروف ہے یا مجہول، اہم کو بولنے والے پر چھوڑ دینا چاہیے۔ اہل لکھنؤ ایسے بعض الفاظ کو بہ دادو مجہول ہی بولتے ہیں۔

• عنون کے متعلق اثر صاحب کی رائے اور پیش کی جا چکی ہے؛ اسی وزن کا ایک لفظ ہے: **عمو**، اس کے متعلق مولانا ظفر جالبائی نے لکھا ہے: ”میر عمو علی خاں، میر انیس کے ایک شاگرد تھے، انھوں نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے عمو کو بہ وادِ معروف پڑھا، تو میر صاحب نے منع کیا“ [اردوئے معلّٰی، بابت فروری و مارچ ۱۹۷۷ء]۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ کے لوگ اس کی پیروی کریں۔ کچھ لوگ بہ وادِ معروف بولیں گے اور کچھ بہ وادِ مجھول۔ اس سلسلے میں کوئی پابندی عائد نہیں کرنا چاہیے، یہی مناسب صورت ہوگی۔

کنیت کے متعلق لکھا گیا ہے: ”بہ تشدید نوون محسوس (کنیت) کہنا غلط ہے (قاموس)“ اور لغات میں بھی یہی لکھا گیا ہے: ”بالعم وفتح سوم صحیح، و بہ کسر نوون مشدّد غلط“۔ دونوں کتابوں کے مؤلفین نے جن حرکات کو صحیح بتایا ہے، وہ عربی کے متعلق ہیں، مگر اردو میں اس کو بہ کسر نوون مشدّد ہی بولا جاتا ہے۔ یہ تلفظ خواہ عربی و فارسی لغات کے اندر جاتے کے خلاف ہو، مگر اردو کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے۔ آصفیہ میں اس کو ”کنیت“ (بہ نوون مشدّد) لکھا گیا ہے۔ اردو میں یہی تلفظ ہے، البتہ موافق نے بہ نوون مشدّد کو عربی لکھا ہے؛ یہ درست نہیں۔ یہ صراحت ضروری تھی کہ بہ نوون مشدّد، اردو کا تصرف ہے۔

مؤلفین قاموس نے تفتیح کو بھی غلط بتایا ہے۔ یہ تحسّیک ہے کہ یہ لفظ عربی میں نہیں پایا جاتا، فارسی والے بھی اس سے واقف نہیں؛ یہ لفظ اردو میں بنا ہے، اور اردو میں بنے ہوئے ایسے بہت سے لفظوں کی طرح، بالعموم مستعمل ہے۔ لیسق احمد اور لیسقہ، بطور نام بھی مستعمل ہیں۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ نور میں ہے، مگر یہ بھی لکھا گیا ہے کہ: ”فصحا اس جگہ لائق“۔ بولتے ہیں ”غالباً فصحا لیسق احمد“ اور لیسق الرحمان کو بھی لائق احمد اور لائق الرحمان کہتے ہوں گے! اردو میں یہ لفظ بالکل صحیح ہے اور پوری طرح قابل قبول ہے، اُسی طرح جس طرح ”مشکیل“ اور عادی ”قابل قبول بل کہ واجب قبول“

ہیں۔۔۔۔۔ اِس، اَمفیہ میں لیتق "تو موجود نہیں، مگر لائق" کے ذیل میں اُس کے مرادف کی حیثیت سے اِس نے جگہ نکال ہی لی ہے، "لائق" ... واجب، سزاوار، ... ذی جوہر، ذی ہنر، لیتق، گمنی ...۔ اِس سے استعمال عام کا بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

گھائل : اِس لفظ کے متعلق لکھا گیا ہے کہ "بکسریا غلط" (قاموس) مؤلفین کو غلط اور نادرست کہنے کی ایسی نکت پڑ گئی ہے کہ الفاظ کے تعلقات کو بھی نظر انداز کر بیٹھے ہیں۔ اِس لفظ کی صورت یہ ہے کہ اصل کے لحاظ سے تو یہ لفظ بہ فتح یا ہے، اُڑیل اور مڑیل اور مڑیل کی طرح "گھائل" بھی اسی قبیلے کا لفظ ہے۔ یں "کالا حقہ" اس میں بھی ہے؛ اِس بنا پر بعض اساتذہ نے اِس کو بفسج یا صحیح قرار دیا ہے، مگر استعمال کا حال یہ تھا کہ متقدمین اور متوسطین کے ردِ اوین میں یہ لفظ اکثر اُٹل اور سائل کا ہم قافیہ بنا ہے اور کم تر پھل اور بادل کے تالیف میں آیا ہے۔ اساتذہ متاخرین یعنی امیر و جلال کے زمانے میں یہ لفظ بھی معرض بحث میں آیا۔ آج کے شاگردِ دتھر کسنوی نے اِس لفظ کی اصل پر نظر رکھتے ہوئے، اِس کو بفسج یا صحیح قرار دیا، مگر اُس زمانے کے اکثر اساتذہ نے اِس فیصلے کو تسلیم نہیں کیا اور متقدمین کی طرح، اِس کو سائل کا ہم قافیہ سمجھتے رہے۔ گویا کثرتِ استعمال نے لفظ کی اصلیت پر ترجیح حاصل کی۔ امیرِ منائی نے ایک خط میں اِس پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے؛ اِس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُس کو یہاں پر نقل کر دیا جائے :

"گھائل کو قدما میں اکثر شعرا نے بہ فتح یا موزوں کیا ہے۔۔۔ مگر متوسط طبقہ شعرا نے بکسریا موزوں کیا۔ البتہ اِس طبقہ میں بحرِ مروج نے بفسج یا کہا ہے، اور بحرِ سے بالمشابہہ یہ ذکر کیا کہ وزن سے لوگوں کو دھوکا ہو گیا ہے، درحقیقت ہندی لفظ ہے، بہ فتح یا۔ اُس جہت میں اسیرِ مروج بھی موجود تھے، اُن کے نزدیک بکسریا ہی رہا، اور انھوں نے فرمایا کہ طبقہ متوسطین میں جمہور شعرا نے

پاکسریا کہا ہے، تقلید انھی کی مناسب ہے۔ اور خود وہ، اور اُن کے اتباع سے میں بھی، پاکسریا استعمال کرنا بہتر اور رائج سمجھتا ہوں۔

(مکتوبِ امیرِ عثمانی بنام حافظ سید عبدالحلیم مارہروی - تاریخِ نثرِ اردو، ص ۵۵۳)

جلاں نے بھی یہی لکھا ہے :

”جناب شیخ امداد علی تحریر مغفورہ کہ ارشد تلامذہ میں سے جناب شیخ ناسخ مرحوم کے تھے، وہ اس لغت کو اسے تختانی کے فتح سے صحیح فرماتے تھے، اور مندر، محل وغیرہ کے تالیف میں لاتے تھے، لیکن اتفاقِ جمہور فصحاء لکھنؤ کا لفظ مذکور میں اسے تختانی کے کسرے ہی پر ہے، یعنی کسور پڑھتے ہیں اور دل بہن کے تالیف میں لاتے ہیں۔“ (سراپہ زبانِ اردو)

شوقِ نیوی نے رسالہ اصلاح میں اس بحث کو تفصیل سے لکھا ہے اور فوارے عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک اساتذہ متاخرین نے ہر فتح یا کو مرغج سمجھا ہے۔ مگر اُن کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ جیسا کہ امیر و جلاں کی تصریحات سے ثابت ہے، اکثریت نے اس کو سائلِ ثانی کا ہم قافیہ قرار دیا ہے۔ مولفِ آصفیہ کی تحریر سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ دہلی و لکھنؤ کے شعرا کی اکثریت، اس کو سائل کے وزن پر استعمال کرتی رہی ہے۔ اُن کی عبارت یہ ہے :

”اس لفظ کے تلفظ کے سلسلے میں ذرا سا جھگڑا ہے، وہ یہ کہ حضرت ناسخ اور اکثر شعراء لکھنؤ دہلی تو اس کو سائل و سائل کے وزن پر، دل، محل، مشکل، بیسمل، قائل وغیرہ کے ساتھ قافیہ باندھنا فصیح سمجھتے ہیں، مگر بعض اہلِ دہلی اور ہندوی لغات والے ہر فتح تختانی صحیح اور فصیح خیال کرتے ہیں۔“

اس عبارت میں میں ایک کمی ہے اور وہ یہ کہ بعض اہلِ دہلی کے ساتھ ”بعض اہلِ لکھنؤ“ بھی ہونا چاہیے تھا۔ ہر صورت، ہر فتح یا ماننے والوں کی تعداد بعض کے ذیل میں آتی ہے،

دہلی و لکھنؤ دونوں جگہ ۔

ہاں ، یہ صراحت ضروری ہے کہ جب یہ لفظ پھل اور بادل کا ہم تافید ہوگا تو اس کو سی سے لکھا جائے گا ، جیسے :

گماں کیوں کر نہ ہو غلبہ بریں کا صحنِ قتل پر تصدق ہوتی ہیں حواریں ، تھے خنجر کے گھیل پر اور جب یہ دل ، بسمل ، سائل وغیرہ کے ساتھ آئے گا تو اس کو ہمزہ سے لکھا جائے ، مثلاً :

واجاب کی تیغ احساں سے گماں نہ بیٹے سے طالب ، نہ جو سی سائل
لغت میں اس لفظ کی دونوں صورتوں کو صحیح اور مستعمل لکھا جائے گا ، مگر مندرجہ
بالا تفصیل کے ساتھ ۔

گروہ ، گوارا ، گواہ : موفقیں قاموس نے ان تینوں لفظوں کو بہ ضم اول صحیح مانا ہے اور یہ نری فارسی کی تقلید ہے ۔ فارسی میں یہ لفظ بہ ضم اول ہیں ، مگر اردو میں یہ صورت نہیں ۔ آصفیہ میں بھی ان لفظوں میں گاف براہتمام کے ساتھ پیش لگایا گیا ہے ؛ مثلاً ”گواہ ، گواہی ، گواہی دینا وغیرہ ۔ یہ فارسی کی پیروی ہے ۔ اردو میں ”گواہ“ اور ”گواہی“ کوئی نہیں بولتے ۔ نور میں ”گواہ“ اور ”گوارا“ کے ذیل میں تو بجا طور پر یہ صراحت کی گئی ہے کہ یہ دونوں لفظ ، اردو میں زبانوں پر بہ فتح اول ہیں ، مگر ”گروہ“ کو صرف بہ ضم اول لکھا گیا ہے ۔

اردو میں گواہ اور گوارا تو صرف بہ فتح اول مستعمل ہیں اور اب ان لفظوں کی صرف یہی صورت قابل تسلیم ہے ۔ بہ ضم اول کو اردو سے قطعاً غیر متعلق سمجھنا چاہیے ۔ اور ”گروہ“ کو اکثر لوگ بہ کسر اول بولتے ہیں اور بعض لوگ بہ فتح اول بھی کہتے ہیں ، مگر بہ ضم اول کوئی نہیں بولتا ۔

غمی، طمانینت، فضا؛ موثقین قاموس نے ”غی“ کو چھوڑ کر ”غم“ بولنے کی تاکید کی ہے۔ کیا فرماتے ہیں موثقین محسن کا کوروی کے اس شعر کے متعلق؛
مراغضہ، آتش، سستی ہو گئی جہنم کے گھر میں غمی ہو گئی

(کلیات نعت، نامی پریس، ۱۹۸۸ء)

اس میں جو مفہوم ”غمی“ سے ادا ہو رہا ہے کیا وہ ”غم“ سے ادا ہو سکتا ہے موثقین یہ بھول گئے کہ یہ دو مستقل لفظ ہیں۔ اردو میں ”غمی“ ”غم“ کا مرادف نہیں، بل کہ وہ دوسرے معنی میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ فارسی میں ”غمی“ ”غمیں“ کا مرادف ہے (جیم) مگر اردو میں موت، ماتم، رنج کے مفہوم میں آ رہا ہے۔ آصفیہ و نور دونوں میں یہ لفظ موجود ہے۔

”فضا“ کو بالکسر خط بتایا گیا ہے (قاموس) یہ قول بھی محلی نظر ہے۔ تبادلہ لحاظ بات یہ ہے کہ ”فضا“ کے اصل معنی ہیں: فراخی اور کھلا ہوا میدان۔ بہار، رونق اور کیفیت کے معنوں میں یہ ہند ہے۔ پھر جب ایک لفظ کے معنوں میں تصرف کیا جا سکتا ہے تو اُس کی حرکات میں تصرف کیوں نہیں ہو سکتا؟ موثقین قاموس کو معلوم نہیں کہ ”فضا“ (پہ کسر اول) کو اردو میں جائز ہی نہیں، مرتفع بتایا گیا ہے۔ صاحب نور نے پنتچ اول لکھ کر مزید لکھا ہے کہ: اردو میں زبانوں پر پہ کسر اول ہے۔ جلیل، ایک پوری کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:

”فضا، بالفتح، مگر اردو بول چال میں بالکسر مستعمل ہے۔ اگر کوئی صاحب محنت کے خیال سے واضح کہیں، تو مضائقہ نہیں“

(مکتوب جلیل، مادہ نامہ التوا دلاہور، نومبر ۱۹۷۵ء)

ہاں، آصفیہ میں اس کو صرف پنتچ اول لکھا گیا ہے — اس لفظ میں حرف اول کی دونوں حرکات قابل تسلیم ہیں۔

۱ طمانیت کے ذیل میں لکھا گیا ہے: طمانیت کہنا، سخت غلطی ہے۔ (قاموس)
 حالاں کہ اردو میں صرف طمانیت "مستعلیٰ ہے۔ یہی بات صاحب نور نے لکھی ہے۔ طمانیت"
 کو تو اردو لغات میں لکھنا ہی نہیں چاہیے۔ تعجب ہے صاحب آصفیہ پر جنہوں نے اردو میں
 بھی طمانیت "کو صحیح اور طمانیت" کو غلط بتایا ہے۔ اُن کی عبارت یہ ہے: "یہ لفظ جس
 طرح بفتح طاء (غیر منقوط و یک نوں مکسور مشہور ہے، غلط ہے۔ صحیح بضم اول و
 کسر نوں اول و رائے معروف و فتح نوں ثانی، بمعنی سکون قلب تصور کرنا چاہیے، گو صراح
 سے ایک نوں کے حذف کا جواز ظاہر ہوتا ہے۔ یہ عجیب منطق ہے۔ طمانیت" اردو میں
 تو کوئی بولتا ہی نہیں۔ اس قدر ثقیل لفظ رائج ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے علاوہ جب
 صراح سے ایک نوں کے حذف کا جواز ملتا ہے، تو پھر اُسے کیوں نہانا جائے؟ لغت پرستی
 بھی عجیب چیز ہے کہ بعض اوقات خوش مذاقی بھی اُس کے سامنے اندر پڑ جاتی ہے۔ اردو
 میں ط کا زیر ہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ یہ ہر صورت، اردو میں اب صرف ایک لفظ
 ہے طمانیت۔ ط مفتوح، اور ن مکسور، آگے آیت۔

سغلی، سنسلی، خیز، دن بہ دن :

قاموس میں "سغلی" کو عربی کی رعایت سے بضم اول لکھا گیا ہے۔ عربی میں
 ضرور یہ بضم اول ہے (الفتح)، مگر اردو میں زبانوں پر کسر سین (سغلی) ہے۔ اردو
 میں اس لفظ کے صرف اسی تلفظ کو صحیح ماننا چاہیے، اور بضم اول کو عربی کے لیے
 چھوڑ دینا چاہیے۔

آصفیہ میں "سغلی" لکھا ہوا ہے، یعنی س پر پیش بھی ہے اور زیر بھی، مطلب یہ ہوا
 کہ اردو میں یہ لفظ دونوں طرح مستعمل ہے، مگر اس کے بعد سغلی عمل "میں سین" پر
 صرف زیر لگا ہوا ہے؛ اس سے استعناہ نام کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ نور میں صرف "سغلی"

لتا ہے اور اردو کے اعتبار سے یہی صورت صحیح اور فصیح ہے۔

موتفین نے سنسنی خیز ”کو بھی غلط بتایا ہے۔ اور دون پر دن“ کو بھی غلط ٹھہرایا ہے۔ اردو میں معلوم نہیں کتنے ایسے لفظ ہیں جن کا ایک جز فارسی یا عربی ہے اور ایک جز ہندی ہے، جیسے: پھول دار، تھانے دار، لٹھ باز، چوکی دار وغیرہ؛ کس کس کو نکالا جائے گا۔ ذرا اس شعر کو دیکھیے:

اک بسنتی پوش سے آغوش رنجیں کیجیے
جی میں ہے، اس مصرع موزوں کو قضاں کیجیے

یا مثلاً یہ شعر:
بہی جھینکنا کوہ کو، گھر بہ گھر ہے _____ پسر کو ٹھکانا، نہ بیٹی کو برہے
اور ایسی ہی بے شمار مثالیں۔ موتفین قاموس ہوں یا کوئی اور بزرگ ہاں اس طرح کے اقوال قابل التفات نہیں۔

یگانگت، یکسانیت:

موتفین قاموس نے ”یگانگت“ کو غلط بتایا ہے اور ”یکسانیت“ کو بھی اسی کے ساتھ نادرست قرار دیا ہے۔ اردو لکھنوی نے بھی ”یگانگت“ کو ترک کرنے کی فرمائش کی ہے: ”یگانگی کی جگہ یگانگت بولنا صحیح نہیں ہے“ (نظام اردو، ص ۴۶)۔ موتفین آصفیہ نے بھی یہی کہا ہے: ”یہ لفظ غلط ہے، یگانگی صحیح ہے۔“ یہی رائے مولانا قلم طہ بیلانی کی تھی (معائب سخن، ص ۴۸)۔

زبان میں قواعد کی پابندیاں ٹوٹی رہتی ہیں اور اس کے نتیجے میں بہت سے نئے لفظ بھی بن جاتے ہیں اور نئے لفظوں کے اضافے سے زبان کا دامن وسیع ہوتا ہے۔ اردو میں تو بہت سے لفظ اسی طرح بنے ہیں۔ اگر قاعدوں کی پابندی ہی کی باقی رہتی

تو یہ ذخیرہ عالم وجود میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ جب کوئی لفظ بن جائے اور رواج پا جائے، تو اسے قبول کر لینا چاہیے۔ قواعد کی خاطر، ارتقائے زبان پر پابندیاں نہیں لگائی جاسکتیں۔ بل کہ زبان کی خاطر، قواعد کو چمک دار بننا پڑے گا۔ مولفِ آصفیہ نے کیا نگت کے بجائے صحیح لفظ "یگانگی" بولنے کی فرمائش کی ہے۔ فرمائش کرنے کی حد تک تو یہ قول پختہ معلوم ہو سکتا ہے، جب اس پر عمل کیا جائے گا تب اندازہ ہوگا کہ یہ مشورہ کس قدر غلط ہے مثلاً مولانا سید سلیمان ندوی کی اس عبارت میں "یگانگت" کے بجائے "یگانگی" ہی پیوند لگا کر دیکھیے، خود اندازہ ہو جائے گا :

انگریزی کے سہارے یگانگت کا خیال، پرانے ال پر دولت مند
بننے کی آرزو ہے۔ (نقوشِ سلیمانی، ص ۹۹)

ذیل کے جملوں میں یہی بات پائیے گا :

کہتے ہیں کہ سلطانِ مصر نے بادشاہِ روم سے طرح یگانگت کی ڈالی

میرامن (گنجِ خوبی، ص ۴۵)

سو مسلمانوں میں یگانگت دین و مذہب کی کفایت کرتی ہے

میرامن (گنجِ خوبی، ص ۱۹۷)

مصطفیٰ کے اس شعر کو بھی دیکھیے :

اعتقادِ یگانگت بھی تھا اتحادِ موانست بھی تھا (شوقِ بزمِ محبت میں)

مصطفیٰ نے تو اس کو بہ ترکیبِ فارسی نظم کیا ہے : اب کیا فرماتے ہیں فصحاء کرام !

"یگانگت" کی طرح یکسانیت "بھی" استعمالِ لفظ ہے اور اب بالکل صحیح ہے۔ اس

سے بحث نہیں کرتا کہ کیا کہتا ہے۔ قاعدے کی رو سے تو "مقبوب" اور "شکیل" بھی لفظ ہیں

اور مشکور بھی اسی ذیل میں آتا ہے، وغیرہ وغیرہ : کیا ان سب کو چھوڑا جاسکتا ہے ؟ آصفیہ

تو یہ دونوں میں "یکسانیت" موجود نہیں۔

مشترک الفاظ

اردو میں مشترک الفاظ انہی خاصی تعداد میں ہیں مشترک الفاظ سے، وہ لفظ ملو ہیں جن کی تذکیر و تانیث میں اختلاف ہے۔ یہ اختلاف کئی طرح کا ہے: کچھ لفظ تو دہلی و لکھنؤ کے دبستانی اختلاف کے تحت آتے ہیں۔ کچھ لفظوں کی صورت یہ ہے کہ ایک ہی مکان کے بعض لوگ مذکر کہتے ہیں اور بعض مؤنث۔ یا کین صورت یہ بھی ہے کہ ایک لفظ ایک زمانے میں مثلاً مذکر تھا، رفتہ رفتہ اُس کی تانیث کی طرف رجحان بڑھتا گیا، یا اس کے برعکس۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ لغات میں یا متعلقہ کتابوں میں ایسی بہت سی تفصیلات موجود نہیں؛ اور اس وجہ سے بعض اوقات، الجھن کے ساتھ ساتھ، غلط فہمی سے کئی دوچار ہونا پڑتا ہے بہت سے لفظوں کی صورت یہ ہے کہ شروع میں ان کی تذکیر و تانیث کا تعین نہیں ہو سکا، استعمال میں دونوں طرح آتے رہے؛ کچھ دنوں کے بعد کسی نے ایک صورت کو قبول کر لیا، کسی نے دوسری صورت کو اور نتیجہ ہوا کہ کسی کتاب میں ایک قول کو ترجیح دی گئی اور کسی میں دوسرے قول کو درج کیا گیا۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم نے لکھا ہے:

”جنس یا تانیث و تذکیر کا اختلاف ہر دور میں رہا ہے، اور یہ اختلاف مکان اور زمان دونوں پر مبنی ہے۔ بعض صورتیں ایسی بھی ہیں کہ زمان و مکان کا

تفاوت نہیں، پھر بھی اختلاف موجود ہے۔ ایک ہی شاعر ایک لفظ کو کسی موٹٹ، کبھی مذکر کہہ جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اردو نے مختلف اور متعدد زبانوں سے لفظ لیے ہیں؛ جب کوئی نیا لفظ آیا، اگر اُس میں اردو کی دُوسرے کوئی علامت تائید یا تذکیر کی نہ تھی، تو ایک مدت تک اُس کی جنس معین نہ ہو سکی، اور اسی لیے اکثر لفظوں کا فیصلہ آج تک نہ ہو سکا۔ جنس ہی کے معین ہونے پر جمع کی صورت کا انحصار ہوا کرتا ہے؛ اسی لیے اردو میں جنس اور عدد، دونوں سیال حالت میں ہیں؛ (مقدمہ کلیات، ولی، طبع دوم، ص ۳۳)

ان کے علاوہ دو صورتیں اور ہیں؛ ایک تو یہ کہ کسی شاعر نے غلطی سے ایک جگہ کسی لفظ کو رواج عام کے خلاف مذکر یا موٹٹ نظم کر دیا؛ اُس استعمال کو قبول عام تو حاصل نہیں ہوا، مگر بعض لغت نویسوں نے اُس کو سند کے طور پر قبول کر کے، اُس لفظ کو مختلف فیہ الفاظ کے زمرے میں شامل کر دیا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جن اشعار کو یا کسی ایک شعر کو کسی لفظ کی تذکیر یا تائید کے لیے بطور سند پیش کیا گیا؛ اُن اشعار کو یا اُس شعر کو اصولاً بطور سند قبول کیا ہی نہیں جاسکتا تھا، بعض غلط فہمی کا کرشمہ تھا؛ لیکن اُس سے ایک غلط اندراج کا اضافہ ہو گیا اور بعد والوں کے لیے وہ ایک اختلافی مسئلہ بن گیا۔

اس طرح کے الفاظ کا جائزہ، ایک دل چسپ اور مفید کام ہو گا اور اُس سے بعض غلط فہمیوں کے ازالے میں مدد ملے گی۔ ذیل میں ایسے چند الفاظ کو ضروری تفصیلات کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ اس تحریر میں ان الفاظ پر گفتگو کی گئی ہے؛ آب، صا، الاپ، ایجاد، آغوش، املا۔۔

آب :

یہ لفظ حقیقی معنی کے لحاظ سے "پانی" کا مرادف ہے اور بالاثاق مذکور ہے۔ مجازاً،

کتاب اور آب داری کے معنوں میں بھی آتا ہے اور ان معانی میں موثق ہے۔ اور اولیٰ میں بھی اس کو ان معانی میں موثق ہی لکھا گیا ہے؛ لیکن جلال نے اپنے رسالہ تذکیر و تانیث مفید الشعراء میں اس لفظ کو مختلف فیہ الفاظ میں شامل کیا ہے (اگرچہ موثق کو مرتج لکھا ہے) اور مذکر کی سند میں، آتش کا ایک شعر اور ایک مصرع، اور تحت علی کا لے حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی، متوفی ۱۲۹۷ھ ذکرہ کا طاب رام پور کا یہ قابل قدر رسالہ پہلی بار ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) میں شائع ہوا تھا۔ اُس وقت اس کا نام کارآمد شعراء تھا۔ نظر ثانی کے بعد یہ مفید الشعراء کے نام سے شائع ہوا۔ اس رسالے کے کچھ مندرجات سے اختلاف کیا گیا ہے؛ مگر اس کو ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے اور مستند سمجھا گیا ہے۔ جلال کے سب سے بڑے مخالف مولوی سید ظہیر حسن شوق نیوی نے مختلف رسائی تذکیر و تانیث کا ذکر کرتے ہوئے، اس رسالے کے متعلق ایک جگہ لکھا ہے:

ان میں مفید الشعراء جناب جلال کی ایفادات سے ہے..... یہ رسالہ اعتبارِ حجم اگرچہ چھوٹا ہے اور سند کے اشعار بھی بہت کم ہیں؛ مگر الفاظ اس میں سب رسالوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ چونکہ اس کا مولف نامی اساتذہ لکھنؤ سے ہے، اور زبان حال لکھی ہے؛ اگرچہ بعض جگہ پر متغضائے بشریت فاحش لغزش بھی ہے، مگر پھر بھی اس کو ترجیح ہے، کیوں کہ دوسرے رسالوں کی بنا صرف تتبع پر ہے، زبان قدیم و جدید و شاذ و غیرہ کی کیفیت اُن سے ظاہر نہیں ہوتی۔ ترشحات مفید میں اس کی کوشش کی گئی ہے؛ مگر وہ بات جو مفید الشعراء میں ہے، نہیں؟

(حاشیہ رسالہ اصلاح، ص ۲۱)

لے شیخ امداد علی بھر لکھنوی، تلمیذِ تاسخ (تذکرہ نادر)، تحقیق الفاظ میں، رشک کے بعد تاسخ کے شاگردوں میں بھی ممتاز تھے (آب بقا، ص ۱۴۲) ان کا مطبوعہ دیوان موجود ہے، جس کا نام روضا البحر ہے۔ قوام زبان و لغت پر مشتمل ایک رسالہ بھی مرتب کیا تھا جس کا خطوط (لکے ملے پر)

ایک شعروش کیا ہے۔ جلال کی تقلید میں، رثعاتِ صغیر اور ارمغانِ اجانبے میں بھی اس لفظ کو مختلف فیہ لکھا گیا ہے، اور مذکر کی سند میں آتش کا وہی شعر درج کیا گیا ہے، جس کو جلال نے لکھا ہے۔ لیکن جلال کا یہ فیصلہ محلِ نظر ہے۔ جلال نے مذکر کی درج ذیل اسناد پیش کی ہیں:

لے ہی میں یا الہی سے کشوں کو موت ہے کیا گہر کی قد، جب آب گہر جا آ رہا
(آتش)

(بقیہ صفحہ گذشتہ) رضا لاہوری رام پور میں محفوظ ہے، اس کا نام بحر البیان ہے۔ کتابوں میں بحر کا سال ۱۲۸۵ھ لکھا ہوا ہے۔ غالب سب سے پہلے صغیر پگرا می نے جلوہٴ خسرو میں اس سہ کو لکھا تھا۔ بعد کو اسی کو نقل کیا جاتا رہا۔ امیر پٹائی کے ایک شاگرد مولوی مہدی علی خاں ممتاز علم پوری نے ایک مجموعہٴ قطعاتِ تاریخ وقات مرتب کیا تھا جس کا مخطوط رضا لاہوری میں محفوظ ہے، اس کا نام تاریخِ لطیف ہے، اس میں امیر کا کہا ہوا قطعہٴ تاریخ وقات بحر موجود ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بحر کا انتقال ۱۲۸۵ھ (مطابق ۱۸۶۸ء) میں ہوا تھا۔ اس قطعے کا شعر آخر یہ ہے:

ساختم فکر بہ تاریخ وقاتش چو اسیر گفت دل "بحریک موج بحر بر رسید"
یہ واضح رہے کہ امیر کا انتقال ۱۲۸۵ھ میں ہوا ہے۔

۱۷ سید فرزند احمد صغیر پگرا می متوفی ۱۲۸۵ھ (تلاذہٴ غالب اس ۱۲۸۵ھ) کی معروف تالیف ہے۔ میر کے سامنے اس کتاب کا وہ اڈیشن ہے جو تصنیف کی نظر ثانی کے بعد، مطبعِ احمدی، پٹنہ سے شائع ہوا تھا۔

۱۸ مولدہ نقی قادر علی صفی پوری، ملازمِ ریاست بھوپال۔ یہ رسالہ مطبعِ شاہ جہانی (بھوپال) میں ۱۲۸۵ھ میں چھپا تھا۔ اچھا خاصہ رسالہ ہے، البتہ تحقیق سے کم کام لیا گیا ہے۔

۱۹ کتابِ آتش، طبعِ دوم اس ۱۲۸۵ھ۔ یہ نکلیات کا ذخائر علی بخش خاں ڈکنٹر میں چھپا تھا۔ پہلا دیوان فخرت علیہ میں اور دوسرا دیوانِ جلاوی لاواوی ۱۲۸۵ھ میں مکمل ہوا تھا۔ صفحات کے نمبر مسلسل ہیں۔

ع : ڈڈوں گائیں، ڈبوئے گا آب گہر مجھے (آتش)
 جب کہ مجھے زندگی، مرنا چہ شمشیر بار اپنے حق میں آبِ حیات، آبِ آہن ہو گیا
 (بحسب)

اس سلسلے میں کئی باتیں قابلِ توجہ ہیں :

۱۔ ”آب“ پر معنی تاب و آب داری مونس ہے، لیکن جب یہ مرتب ہو، جیسے : آبِ گہر
 آبِ آہن، آبِ تیغ وغیرہ، اور اس کو مذکر استعمال کیا جائے؛ تو وہاں درحقیقت
 آبِ حقیقی سے استعارہ ہوتا ہے، لفظ ”آب“ کے مجازی معنی (آب داری) مراد نہیں
 لیے جاتے۔ ایسے مقامات پر آبِ حقیقی کے لوازم مذکور ہوتے ہیں؛ اس لیے ان مرکبات
 کو لازمہ مذکر استعمال کیا جائے گا۔ اس سے مفرد لفظ ”آب“ (پرمی آب داری) کی
 تانیث پر کچھ اثر نہیں پڑے گا، جیسا کہ اسیر مینائی نے لکھا ہے :

شعر آبِ گہر یا آبِ تیغ کو مذکر باندھتے ہیں، تو وہ آبِ حقیقی سے استعارہ
 ہوتا ہے، اور لوازم آبِ حقیقی کے ثابت کرتے ہیں۔ جیسا کہ تحر کے اس شعر میں
 گتوں تک یا گلو تک ہونا، آبِ حقیقی کے لازم سے ہے :

کوچے کٹواتے ہیں میرے : بارہ پر ہے آبِ تیغ آج گتوں تک ہوا، کل تا گلو ہو جائے گا

(امیر القنات، جلد اول، ص ۱۳)

آتش کے مصرعے اور تحر کے شعر میں آبِ آہن اور آبِ گہر کی یہی صورت ہے کہ

لے پورا شعر یوں ہے، جب دیکھتا ہے بار، تو ہے دانت پستا : ڈڈوں گائیں ڈبوئے گا
 آبِ گہر مجھے۔ (ایضاً ص ۱۷۲)

لے ریاض البحر، ص ۲۸۔

لے یا جیسا آتش کا یہ شعر، تشنگی کرتی جو محتاج دمِ مخبر مجھے : آبِ آہن، شمشیر و ایک طراوت

انگشا (کتاب آتش، جلد دوم، ص ۷)

معمول شعرا کے مطابق، دونوں جگہ آب حقیقی سے استعارہ کیا گیا ہے، اور آب حقیقی کے لوازم موجود ہیں؛ اس لیے ان دونوں مثالوں کو مفرد لفظ آب (یعنی آبِ حقیقی) کی تذکیر کی سند میں کسی طرح پیش نہیں کیا جاسکتا۔

۲۔ آتش کے شعر (نئے ہی میں یا الہی...) میں آب گہر ضرور اس طرح آیا ہے کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہاں اُن سے تسامع ہوا، اور انھوں نے بے خیالی میں "آب گہر" کو اس طرح نظم کر دیا جیسے آب حقیقی سے استعارہ کیا گیا ہو۔ حالاں کہ یہاں لفظ "آب" مجازی معنی میں آیا ہے۔ اس خیال کی تائید کئی طرح ہوتی ہے:

(الف) آتش کے کلیات میں، زیر بحث شعر کے علاوہ، جہاں بھی یہ لفظ اس طرح آیا ہے، آب حقیقی کے لوازم کے ساتھ آیا ہے، مثلاً:

کلیاں آب گہر کی بھی جو خوش روز کرتے تیرے دانتوں کی نہ دانتوں میں صفائی ہوتی
(کلیات، طبع دوم، ص ۲۲۱)

ہائے اشک کے قطرے میں ماضی آب گہر ہے بھرا ہے جو باقی وہ صنم چادرِ خداں میں
(، ، ، ، ص ۱۳۱)

روح کو تفریح اُن دانتوں کے دیکھے سے ہوئی آب گوہر سے، ہرادل کا صنوبر ہو گیا
(، ، ، ، ص ۶۲)

الہی! باز و قافل میں زورِ دستِ قدرت ہے روانی ہے اسی کے دم سے آبِ خشکِ نخبِ زمیں
(، ، ، ، ص ۱۲۹)

(ب) آتش نے مفرد لفظ آب کو مجازی معنی میں کہیں اور نہ کر نظم نہیں کیا، البتہ ایک جگہ موتِ ضرور دکھا ہے، شعر یہ ہے:

جلے بر مجھے تن، اے کاش میں گردن رکھتا آب، ابرو کے ہر اک بال میں، تلوار کی تھی
(، ، ، ، ص ۱۸۳)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آتش و حقیقت اس کی تائید ہی کے قائل تھے۔
 (ج) آتش اور اُن کے علاوہ کے یہاں (زیر بحث شعر سے قطع نظر) آب گہر
 (مولیٰ کی آب کے معنی میں) کہیں ذکرِ نظم نہیں ہوا ہے، البتہ تائید کی مثالیں مل سکتی ہیں،
 مثلاً:

چاہیے انسان کو بھی پاسِ حفظِ آبرو یاد رکھے، جا کے پھر آبِ گہر ملتی نہیں
 (رند و دیوان مطبوعہ نول کشور پریس، ص ۱۸۳)
 (د) آتش کے زیر بحث شعر کو، مفرد لفظِ آب کی تذکیر کی سند کے طور پر، جلال
 اور اُن کی تقلید میں مولفِ ارغوانِ احباب کے علاوہ، اور کسی نے تسلیم نہیں کیا؛ بل کہ اور
 لوگوں نے یہ مراحت کر دی ہے کہ آتش نے یہ خلافِ جمہور کہا ہے، صغیر بلگرامی جنہوں
 نے جلال کی تحریر کے پیشِ نظر، اس لفظ کو مختلف فیہ لکھ دیا ہے، لکھتے ہیں:

”بعض الفاظ جن میں سب شعرا و فصحاء شغف میں، مگر ایک دو شاعروں نے
 اُن کے خلاف باندھا؛ تو ہم کو جمہور کی تقلید کرنی ہوگی۔ جیسے: ”آبِ گہر“ کو جو
 قواعد کی رو سے بھی موثق ہے، اور فصحاء کا بڑا دیکھی ہے؛ اُس کو آتش
 مذکور باندھ گئے ہیں۔“ (مشحبات صغیر، ص ۲۹)

شوقِ نیوٹنی نے رسالہ اصلاح میں: ”آب“ پر معنی آب داری کو موثق لکھ کر لکھا ہے:

”مولوی سید ظہور حسن شوقِ نیوٹنی، تلمیذِ شمس و لکھنوی، اپنے زمانے کے معروف
 اہلِ علم میں تھے۔ جلال پر بہت سے اعتراض کیے تھے اور انہی خاص معرکہ آرائی ہوئی تھی۔ اس کی کچھ تفصیل
 اُن کی کتاب یادگارِ وطن میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ متوفی ۱۳۳۷ھ (۱۹۱۹ء)۔ شوقِ سنور“
 مادہ ۳۲ رتبہ وفات ہے۔ اُن کی مشنوی سوز و گداز کے آخر میں قطعاتِ تاریخ وفات بھی شامل ہیں۔
 ایک قلم میں اُن کی تصانیف کے نام بھی ہیں (مشنوی سوز و گداز، مطبوعہ نظامی پریس پٹنہ)۔ اُن کا
 رسالہ اصلاح، اُس زمانے میں مقبول ہوا تھا۔ میرے سامنے وہ ادیشن ہے جس کو (باقی اگلے صفحے پر)

”بعضوں نے جو اس کو مذکر استعمال کیا ہے، وہ جمہور شعرا کے خلاف ہے“ (ص ۲۱) یہ حقیقت ایراد ہے جلال کے اُس قول پر کہ یہ لفظ، مشترک الفاظ میں سے ہے۔۔۔۔۔ اسی ذیل میں شوق نے مزید لکھا ہے: ”ہاں جہاں پانی کی رعایت کی گئی ہو، وہاں مذکر بھی استعمال کرنا درست ہے“ اور مثال میں ناسخ کا ایک مصرع اور تخر کا وہی شعر لکھا ہے جس کو جلال نے ”آب“ (بمعنی آب داری) کی تذکیر کی سند میں پیش کیا ہے۔ یہ بھی درحقیقت ایراد ہے اس پر کہ جلال نے سند میں صحیح شعر پیش نہیں کیا، اور لوازم آب حقیقی“ والے نکتے سمک اُن کی نظر نہیں پہنچی۔

موقف معین الشعرا نے ”آب“ بمعنی آب داری کو موثق لکھ کر حاشیے میں لکھا ہے: ”خلاف جمہور کے ایک جگہ آتش نے مذکر بھی لکھا ہے“

(۷) تخر کا جو شعر جلال نے مذکر کی سند میں درج کیا ہے؛ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، اُس کو لفظ ”آب“ کی تذکیر کی سند میں نہیں پیش کیا جا سکتا، اور نہ جلال کے سوا کسی نے اُس کو پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ تخر نے ہر جگہ ”آب“ بمعنی آب داری کو موثق ہی نظم کیا ہے۔ اُن کے دیوان مطبوعہ

(بقیہ صفحہ گزشتہ) مولانا حسرت موہانی نے، اردو پریس علی گڑھ سے شائع کیا تھا۔ یہ رسائل دو رسائل کا مجموعہ ہے، ایک فارسی رسالہ اذاعۃ الافلاط، جو لغت کے موضوع پر ہے، اور دوسرا اصلاح، جس میں مختلف قواعد زبان و شاعری جمع کیے گئے ہیں۔ اس رسالے کے حواشی کا نام انھوں نے ایضاح رکھا تھا، یہ گویا ایک ضمنی رسالہ ہوا۔ کار آمد رسالہ ہے۔

۱۔ مولانا منشی غلام حسین آفاق بناری، شاگرد جلیل انکاپوری دہلوی، ۱۹۲۲ء (مقدمہ معین الشعرا)۔ تذکرہ و تائید کے موضوع پر غالباً سب ضمیمہ الیف ہے، بل کہ اچھا خاصہ لغت ہے۔ اسناد کے ساتھ، ہر لفظ کے اعداد بھی لکھے دیے ہیں۔ یہ کتاب مولف کے انتقال کے بعد، مدتی یک ڈیڑھ لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ رسائل طبع درج نہیں مسند تجلید الیف ۱۳۳۱ھ (۱۹۲۲-۲۳ء) ہے۔ اچھی خاصی کتاب ہے۔

میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ہے جس میں یہ لفظ بہ تذکیر آیا ہو۔ بطور مثال، موثق کی چند اسناد اُن کے دیوان سے نقل کی جاتی ہیں،

جو آبِ کنے کی جائے، ہم مکتد ہوں وہ کون ہیں، جو کسی کی ہیں آبرو لیتے
(ریاض البحر، ص ۲۰۰)

مٹائی موتیوں کی آبِ اُس کے دانتوں نے اڑا دیالِ رنگیں نے رنگ لالوں کا
(ریاض البحر، ص ۱۲)

گرد و بادلِ دو کج و بچے، زند واپہو پیا پئے پھر ایک قطرہئے، موتی کی آب ہوگا
(ریاض البحر، ص ۲۰)

نیز بحر کے دیوان میں آبِ گہر یا اس نوع کا کوئی مرکب، جس میں آبِ حقیقی سے استعارہ نہ ہو، بل کہ آبِ داری کے معنی مراد ہوں؛ مذکر نظم نہیں ہوا ہے۔

(۱) اردو کے کسی لغت نگار نے لفظ "آب" کے معنی آبِ داری کو ذکر نہیں لکھا، سب نے صرف موثق لکھا ہے۔ نیز آبِ گہر، آبِ آہن، آبِ تیغ جیسے مرکبات کو، جن میں آبِ داری کے معنی ہوں، صرف موثق لکھا ہے۔ اسی طرح، جن رسالوں میں تذکیر و تانیث کا ذکر آچکا ہے، اُن کے علاوہ دوسرے قابل ذکر رسائل میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے، مثلاً: رسالہ بسیط اور رسالہ جلیل۔

لے یہ رسالہ غیر مطبوعہ ہے۔ اس کا خطوط دہلاکھیری (رام پور) میں ہے۔ مؤلف: آغا محمد علی عرف آغا جو ہندی کھنوی، اہل محمد علی خاں، اہل نواب شجاع الدولہ (تذکرۃ انتخابیہ) اور اہل دارالامان پور سے متعلق تھے۔ یہ خطوط، فہرست کتب خانہ کی مراحت کے بموجب، موثق کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں الفاظ کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، مذکر، موثق، مشترک، مشترک الفاظ اس کی بھی مراحت کر دی گئی ہے کہ موثق کی رائے میں ترجیح کسے ہے۔ رسالے کا سالِ اتمام ۱۲۹۳ھ ہے۔ موثق کی شخصیت کے لحاظ سے بھی یہ رسالہ قابل ذکر ہے۔ سنہ ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۳ء) میں انتقال ہوا (آرٹھج لطیف) (باقی اگلے صفحے پر)

مختصر یہ کہ مفرد لفظ ”آب“ بمعنی تاب و آب واری، شفق طیبہ موقوف ہے۔ اس کے مرکبات، جن میں آب حقیقی سے استعارہ ہو، مذکور آتے ہیں۔ جن میں آب واری کا مفہوم ہوا وہ موقوف آتے ہیں۔ آتش کے اُس ایک شعر کی حیثیت شاذ کی ہے، یہ آتش کا تسارع ہے؛ اس لیے اُس شعر کی بنا پر اس کو مختلف فیہ الفاظ میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ جلال نے آتش کے جس مصرعے، اور بحر کے شعر کو، تذکرہ کی سند میں پیش کیا ہے، اُن دونوں میں، ایسے دوسرے اشعار کی طرح، آب حقیقی سے استعارہ کیا گیا ہے؛ اس لیے اُن کو ”آب“ بمعنی آب واری کی بحث میں پیش ہی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ جلال کا تسارع ہے۔

صار :

عربی کے حروف تہجی میں چودھواں حرف ہے، آنکھوں کو بھی اس سے تشبیہ دیتے ہیں، صبح یا منظور ہونے کی علامت بھی ہے؛ ان سب معانی میں اس کو مذکور استعمال کیا گیا ہے۔ اسناد لفظ میں موجود ہیں۔ لیکن ایک غلط فہمی کی بنا پر اس کو بھی مشترک الفاظ میں شامل کر لیا گیا، معلوم نہیں اس غلط فہمی کا آغاز کس طرح ہوا، البتہ یہ معلوم ہے کہ بیش تر ارباب لغت و رسائل اس میں مبتلا ہوئے۔ ایک ایسے شعر سے اس کی تائید پر استدلال کیا گیا، جس کو تائید کی سند میں پیش کیا ہی نہیں جاسکتا تھا؛ مگر نقل قول کو کیا کہا جائے کہ رفتہ رفتہ اس کا مختلف فیہ ہونا مسلم ہو گیا۔ جلال نے مفید الشعرا میں اس کو صرف ذکر لکھا ہے اور یہ بالکل صحیح ہے، مگر موقوف آصفیہ نے اس کو ”اسم ذکر و موقوف“ لکھ کر، مثال میں مثنوی گہرا در نسیم کا یہ شعر لکھا ہے :

”صاد آنکھوں کی دیکھ کر پسری مینائی کے چہرے پر نظر کر“

حافظ جلیل حسن جلیل تک پوری دہلیذ و باشعیر امیر شانی، الی تالیف۔ اس کا نام صادق ذکر و تائید ہے۔ سال ترتیب طبع ۱۳۱۵ھ ہے۔ آخر ذکر پریس حیدرآباد میں چھپا تھا۔

اور اس شعر کے نیچے مزید صراحت کی ہے کہ: "تانیث کی مثال بھی اس شعر سے ثابت ہے۔"

تور اللغات، رثعات اور ارمغان احباب میں بھی نسیم کے اسی ایک شعر کو تانیث کی سند میں لکھا گیا ہے۔ اس طرح "صدا" بھی مختلف فیہ الفاظ میں شامل ہو گیا، حالاں کہ نسیم کے اس شعر سے تانیث ثابت نہیں ہوتی۔ اثبات تانیث کے لیے یہ ضروری ہے کہ مصرعِ اول کو یوں لکھا جائے: "صدا آنکھوں کی دیکھ کر پسری"؛ لیکن یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اس مصرعے میں "آنکھوں کی" کے بھانے آنکھوں کے نہیں ہے؟

اب سے پہلے یا سے معروف و مجہول کی کتابت میں امتیاز ملحوظ نہیں رہتا جاتا تھا؛ اسی لیے اُس زمانے کی کسی تحریر میں اگر کوئی لفظ برائے معروف یا برائے مجہول لکھا ہوا ہو، یا چھپا ہوا ہو؛ تو اُس کتابت کی بنا پر، اُس لفظ کی تذکیر یا تانیث کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، اور نہ ایسے کسی شعر کو سند کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے، اور یہ مسئلہ قاعدہ ہے۔ مثنوی گزرا نسیم کا پہلا اڈیشن ۱۳۱۷ھ میں، مطبع حسن میر حسن رضوی سے شائع ہوا تھا۔ اُس میں، اُس زمانے کے رواج کے مطابق، برائے معروف و مجہول کا امتیاز نہیں ہے؛ یہ مصرع اُس میں اس طرح چھپا ہوا ہے: "صدا آنکھوں کی دیکھ کر پسری" لطیفہ ہوا کہ مشاعرہ میں چکبست نے اس مثنوی کا جو اڈیشن چھاپا، اُس میں بھی "صدا آنکھوں کی" ہے۔ جن لوگوں نے پہلے اڈیشن کو یا نسخہ چکبست کو دیکھا اور اس بات کو ملحوظ نہیں رکھا کہ یہاں کی "یا شے" میں سے کیا مرع ہو سکتا ہے؛ یا یہ کڑی "ہو یا شے"، اس سے نہ تانیث پر استدلال کیا جاسکتا ہے نہ تذکیر پر؛ انھوں نے "صدا آنکھوں کی" پڑھا اور اس کتابت کی بنیاد پر یہ فرض کر لیا کہ نسیم نے اس کو مؤنث نظم کیا ہے۔ اللہ یہ دونوں اڈیشن اب کم باب ہیں۔ رضا انجمن بری رام پور میں یہ دونوں اڈیشن موجود ہیں اور میں نے انہی سے استفادہ کیا ہے۔

شروع میں ایک لغت نویس نے اس غیر صحیح بات کو لکھا: دوسروں کے لیے محض اُس لغت نویس کا لکھنا آیت و حدیث ہو گیا۔

مجھے۔۔۔ اس پر ہے کہ صفیر کہ امی نے رِشحات میں اس شعر کو تانیث کی سند میں کیسے قبول کر لیا اور اس طرح اس کو بھی مشترک الفاظ میں شامل کر دیا؛ جب کہ انہوں نے اپنا اس کتاب میں کئی جگہ یہ مراحت کی ہے کہ جن اشعار میں غلط الکاتب کا احتمال ہو، یا محض "کی" یا "کے" پر سند کا انحصار ہو، تو ایسی اسناد کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔ یہی نہیں، انہوں نے دوسروں پر اس سلسلے میں اعتراض بھی کیا ہے۔ مثلاً جلال نے مفید الشعرا میں لفظ "مشتري" کی تانیث کی سند میں یہ دو شعر لکھے ہیں:

تقدیر جاں لائی ہے، تالے مول فوراً اُس ماہ سے مشتري رکھا ہے نام اپنے لیے بر صیص کا
(ناسخ)

تیرا غلام کچھ نہ کنتاں فقط نہیں کہتی ہے مشتري بھی، میں تیری خریدہ ہوں
صفیر نے ان اسناد پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے: (ناسخ)

"موت کہتا ہے کہ کار آمد شعرا کی ان مثالوں سے موت ہونا کچھ ضرور نہیں کثابت ہو کیوں کہ کتابت کی غلطی بھی ہو سکتی ہے یعنی نقد جاں لایا ہے۔" اور کہتا ہے
مشتري "بھی کہہ سکتے ہیں: (رِشحات صفیر، ص ۴۷)

جلال نے طوطی "کی تانیث کی سند میں رِشک کا یہ شعر بھی لکھا ہے:

طوطی سبزہ خط صاف یہی کہتی ہے میں وہی عارض آئینہ جاناں اب تک
صفیر نے اس پر بھی یہی اعتراض کیا ہے:

"اور رِشک کے شعر کی جو سند دی گئی، اس کو ماننا مشکل ہے کیوں کہ طوطی سبزہ خط صاف یہی کہتا ہے "بھی ہو سکتا ہے۔" از روئے غلطی کتابت، یہ مثال کافی نہیں، حضرت جلال ایسی ہی مثالیں دیا کرتے ہیں: (رِشحات صفیر، ص ۶۸)

ایک طرف تو یہ احتیاط کہ افعال میں بھی غلطی کتابت کے احتمال کی بنا پر اسناد کو قبول نہ کرنا؛ اور دوسری طرف یہ صورت کہ جس سند کی بنا محض کی "اودھے" کے قریب انداز کتابت پر ہے، اُس کو بے تکلف قبول کر لیا !!

بہر صورت، "مادہ" مذکور ہے جن لوگوں نے غلط تائیم کے زیر بحث شعر کی بنا پر اس کو موقف فرض کر کے، اس کو مختلف فیہ الفاظ میں شامل کر دیا، اُن سے غلطی ہوئی۔ اس شعر میں "مادہ" آنکھوں کے پڑھا جائے گا، کیوں کہ یہ مذکور ہے اور اب تک اس کی تائید کی کوئی قابل قبول سند نہیں ملی ہے۔ بالفرض، کوئی صاحب اس قرائت کو مزید مانیں؛ تب بھی اصولاً اس شعر کو تائید کی سند میں نہیں پیش کیا جاسکتا۔ اور جب تک تائید کی کوئی مثال نہ ملے، اُس وقت تک اس کو مختلف فیہ بھی نہیں کہا جاسکتا۔

الاب :

جہاں نے مفید الشعرا میں "الاب" کو مشترک الفاظ میں شامل کیا ہے، مگر بہر حال نہیں کی کہ ترجیح کسے ہے۔ البتہ آغا جتوہند کی نے رسالہ بسیط میں مذکور ترجیح لکھا ہے۔ جہاں نے مذکور کی سند میں ایک شعر لکھا ہے، اور موقف کے متعلق لکھا ہے کہ اس کی سند کلام اساتذہ میں نہیں ملی۔ اُن کی عبارت یہ ہے :

"الاب، مختلف فیہ ہے۔ مذکور موقف دونوں طرح بولا جاتا ہے، چنانچہ قدرت نے مذکور کہا ہے :

ایک ہی پردے کے، تم بھو، تو میں یہ سب الاب
گر مدائے بانگ ہے، در نغمہ تا قوس ہے

اور موقف کی کوئی مثال موقف کو کلام اساتذہ میں ملی نہیں، الا یاد پڑتا ہے کہ موقف بھی کہا گیا ہے "مفید الشعرا"

جہاں نے مذکور کی سند میں جو شعر درج کیا ہے، وہ شاہ قدرت اللہ قدرت کا ہے۔

تذکرہ میر حسن، تذکرہ ہندی اور سخن شعرائں یہ انہی کے نام سے ملتا ہے۔ یہ اُن کی مشہور غزل کا شعر ہے، جن میں وہ معروف قلم بھی شامل ہے، جس کا پہلا شعر یہ ہے:

کل ہوس اس طرح سے ترفیٹ پی تھی مجھے کیا ہی ملکِ روم ہے، کیا مرز میں ہوس ہے
مگر اصولاً قدرت کے اس شعر کو تذکرہ کی سند میں پیش نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ تذکرہ کا انحصار کے پر ہے، اور یہاں کی بھی ہو سکتا۔ یہ بات پہلے لکھی جا چکی ہے کہ ایسے اشعار کو سند کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا جن میں کی "یا" کے "پر سند کا انحصار ہو۔ جن تذکروں کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے، اُن میں اس شعر کے متن کی صورت یہ ہے:

ایک ہی پرے کی گر بھو تو ہے یہ سب لاپ گرمداے باگ ہے، ورنہ نازاوس ہے
(تذکرہ میر حسن)

ایک ہی پرے کے یہ سب کچھ تو ہیں لاپ گرمداے باگ ہے، ورنہ نازاوس ہے
(تذکرہ ہندی)

ایک ہی پرے کی گر بھو تو یہیں سب لاپ گرمداے چنگ ہے، یا نازاوس ہے
(سخن شعرا)

تذکرہ میر حسن کے مطبوعہ نسخے کے ساتھ ساتھ، اُس کا ایک غلط نسخہ مختصر و رضا لاہوری رام پور بھی پیش نظر ہے: دونوں میں اس شعر کا متن یک سا ہے، اور اس طرح یہ شعر تانیث کی گواہی دے سکتا ہے۔ مگر مینا اگر ابھی کہا گیا ہے: اس شعر کو (اور اس قبیل کے اور اشعار کو بھی) تانیث کی سند کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے، اس سے تذکرہ کا استناد کیا جاسکتا ہے۔

اب صورت یہ ہے کہ مفید الشعر، رسالہ بسیط اور دشحات صغیر میں اس کو مختلف نام لکھا گیا ہے۔ جلال نے تذکرہ کی سند میں قدرت کا جو شعر درج کیا ہے، وہی دشحات میں بھی منقول ہے۔ گویا تذکرہ کی سند میں مرثیہ ایک شعر پیش کیا گیا ہے، اور وہ شعر ایسا ہے جس کو

از روئے قاعدہ، بطور سند پیش نہیں کیا جاسکتا۔

آصفیہ، نور، امیر اللغات، رسالہ جلیل اور معین الشعراء، اس لفظ کو صرف موثق لکھا گیا ہے۔ نور میں تائید کی سند میں واجد علی شاہ اختر کا یہ شعر لکھا ہوا ہے:

”طلول پہ لگیں وہ پڑنے تھاپیں بہنچیں گردوں پہ وہ اٹاپیں“

یہی شعر میں شعراء میں منقول ہے۔ آصفیہ میں میر حسن کی مثنوی سحر الیاس کا یہ شعر، تائید کی سند میں لکھا گیا ہے:

”وہ رقصہ رنماں، اور وہ ستمری الہاں وہ گوری کی تانیں، وہ طلول کی تھاپ“

یہی شعر امیر اللغات میں ہے۔ صاحب بہار ہند نے بھی تذکرہ تائید کی مراجعت کے بغیر، اسی شعر کو درج کیا ہے۔ لیکن قدرت کے اس شعر کی طرح میر حسن کے اس شعر کو بھی سند کے طور پر نہیں پیش کیا جاسکتا۔ ستمری الہاں بھی ہو سکتا ہے۔ اختر کے شعر سے تائید ضرور نظر آ رہی ہے۔ میں فی الوقت یہ کہنے سے قاصر ہوں کہ یہ شعراء کی کس مثنوی کا ہے، اور یہ کہ اصلاً اسی طرح ہے۔ اگر اس شعر کا متن صحیح ہے اور یہ اختر کا ہے، تو اشیا تائید کے کام آسکتا ہے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ اس سند سے، یہ کسی طرح لازم نہیں آتا کہ یہ لفظ صرف موثق ہے۔ جیسے رشک کے اس شعر سے:

”موتو مرزا محمد مرزا، عرف پنجویک عاشق لکھنوی۔ اور وہ پنج من ستم ظریف کے نام سے لکھا کرتے تھے یہ لغت جن مشہور میں بطبع شوکت جعفری لکھنؤ میں چھاپا تھا۔ بوقت کی مراجعت کے مطابق اس کو بارجلدوں میں شائع کرنے کا ارادہ تھا، لیکن صرف حصہ اول چھپ سکا۔ یہ حصہ، صرف حرف الف پر مشتمل ہے۔ بوقت لکھنؤ کے ارباب اخبار میں سے تھے؛ اگر یہ لغت مکمل ہو جاتا تو بہت مفید ہوتا، بقول ملکیت: لکھنؤ کی زبان اور محاوروں کی جتنی تحقیق مرزا سے مرحوم کو تھی، اس کا اندازہ اس کی مشہور تالیف بہار ہند کے دیکھنے سے ہو کر کیا جاسکتا ہے۔ افسوس ہے کہ مکمل اس لغت کی کاپی قدرت کی دوزخ اگر اس کے ہاتھ میں تھی، تو اردو زبان کی اصطلاحوں اور محاوروں کا ایک عجیب مجموعہ مرتب ہو جاتا۔“

(معاذ اللہ، ص ۲۴۵)

فناذ میرے عشق کا، ہے جا بہ جا غلط
لفظیں غلط، حروف غلط، مدعا غلط
(بحرہء دوادین رنگ، ص ۵۵)

یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ لفظ صرف موثق ہے۔

ہندی کے متعدد اساتذہ سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ سنسکرت اور ہندی میں ”الاب“ مذکر ہے۔ لغات میں بھی صرف مذکر لکھا ہوا ہے، ملاحظہ ہو۔

ہندی مشہد ساگر (شائع کردہ انگریز پریس چارنی سبھا)، برہت ہندی کوش
(شائع کردہ گیان مینڈل بنارس)، سنسکرت مشہد ارتھ کوستبھ (مرتبہ
دوارکا پریشاد اشرمہ)

یہ لفظ موسیقی کی ایک اصطلاح ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس فن سے
تعلق رکھنے والے حضرات سے استصواب کیا جائے۔ اس سلسلے میں، میں نے شاہد احمد دہلوی
(مرحوم) سے رجوع کیا تھا۔ مرحوم اس فن کے جاننے والوں میں تھے۔ ان کے مکتوب کا
اقتباس درج ذیل ہے :

”پیشہ دروں کی زبان پڑا اب“ مذکر ہے اور کتابوں میں بھی، اس لیے میں بھی
مذکر ہی بولتا ہوں۔

(۱) سادات الثقات معتقد تھے کہ نوآب علی خاں، جو اردو کی واحد مستند کتابچہ،
اس میں بھی مثنیٰ پر یہ عبارت درج ہے، ”آج کل الاب بھی، دھڑک کی طرح چاند
حصوں پر تقسیم کر دیا گیا ہے“

(۲) آج کل کے موسیقی خیز مطبوعہ آگست ۱۹۹۷ء کے ص ۵۹، کالم راہِ سطر
میں کہا گیا ہے کہ ”دھڑک کا الاب یا بین کار کا جوڑ وہ ماحول پیدا کرتا ہے جو دوسری
گائیکیوں یا باج نواز بھی تک پیدا نہیں کیا ہے۔“ مضمون نگار میں استاد
رحیم اللہ خاں ڈاگر، جن کا کام ہی الاب کنا اور دھڑک گانا ہے۔

(۳) کتاب اسرارِ کرامت، عرفِ نقباتِ محبت، مطبوعہ مفتی احمد، ص ۱۰۷،
 ص ۹۹، ہر راگ کے الپ کے واسطے تین نے مقرر کی گئی ہیں۔ یہ کتاب
 نعمت اللہ خاں نے لکھی تھی اور اس کی تکمیل ان کے بیٹے کرامت اللہ خاں نے
 کی تھی۔ نعمت اللہ خاں، دربارِ نیپال کے گلریک تھے۔

”الپ مذکور ہی بولا جاتا ہے، مگر غیر پیشہ وردوں سے موثق بھی سننا ہے۔ لغت
 میں شاید اسی وجہ سے دونوں طرح درج کر دیا گیا ہو۔“

اس عبارت سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ لفظ دونوں طرح مستعمل رہا ہے۔ اس شخص کے
 ساتھ کہ فی موسیقی سے تعلق رکھنے والے عام طور پر اس کو مذکور استعمال کرتے رہے ہیں (اور
 غالباً یہ ہندی کا اثر ہے)۔ دوسرے لوگ موثق کہتے رہے ہیں، اور اسی لیے اکثر ارباب
 لغت نے اس کو صرف موثق لکھا ہے۔ مولانا حالی کے کلام میں ایک جگہ یہ لفظ بہ تانیث
 نظم ہوا ہے، اور ایک جگہ اس کی جمع الپیں ”آئی ہے۔ شعر یہ ہیں :

کائن کو اپنی ہی بھاتی تھی الپ — سرورِ مناکرتے تھے ہم آپ ہی آپ

(نظم تعصب و انصاف، مجموعہ نظم حالی، ص ۵۸)

”اپیں مطربوں کی جستیں چپ لگ گئی سب کو بہت عوامِ حاضر غائبین کو خوش نوائی کا

(خواجہ ابٹ حالی، ص ۱۱۶)

ان دو مثالوں سے اس قیاس کی مکمل طور پر تائید ہوتی ہے کہ فی موسیقی سے متعلق
 اصحاب کے علاوہ، شعرائے اس کو بہ تانیث استعمال کیا ہے۔ واجد علی شاہ اختر کا ایک شعر
 پہلے آچکا ہے، اور اس طرح اس کی تانیث کا ثبوت مکمل ہو جاتا ہے۔ حالی و اختر کا
 استعمال، تانیث کی ترجیح کے لیے کافی ہے، تاہم کہ دوسرے شعرا کے یہاں مذکور کی
 مثالیں دلیں، اس لفظ کی تانیث مرزج رہے گی۔

اختر اور حالی کے اشعار کے بعد، سرورِ سخن کی اس عبارت کو بھی، تانیث محض کی جگہ

قبول کیا جاسکتا ہے، شہانے میں کانڑے کی آلاپ، بھنگر دوں کی صدا، جھلے کی تھاپ :-
(سرکوش سخن، طبع پانزدہم، نول کشور پریس، ص ۱۵)

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ یہ لفظ واقعتاً مختلف فیہ ہے، مگر اس تفصیل کے ساتھ کہ فن موسیقی سے تعلق رکھنے والے اس لفظ کو، اصل کی رعایت سے، مذکر استعمال کرتے ہیں، اور شعرانے اس کو مؤنث باندھا ہے۔ اب نثر و نظم میں تو استعمال شعر کی پیروی کی جائے گی، فن موسیقی کی تصانیف اور تحریروں میں اس کو مذکر لایا جاسکتا ہے، اور اس فن کی ایرانی تصانیف میں اس کو مذکر ہی مانا جائے گا۔

اصل بحث کے بعد، ایک ضمنی بات کہنا ہے :

مولفِ آصفیہ نے "آلاپ" (بہ الفِ ممدودہ) لکھا ہے، اور اُس کے آگے "عوام (الآپ)" لکھا ہے۔ اس سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں پر مولف نے قیلن کی تقلید کی ہے۔ قیلن کے لغت میں بھی یہی صورت ہے کہ اُس میں اصل لفظ "آلاپ" ہے بسنکرت میں یہ "آلاپ" ہے، بہ الفِ ممدودہ (سنسکرت انگلش ڈکشنری، مولفہ دی، ایس، آپٹے)۔ ہندی میں "آلاپ" اور "الآپ" دونوں صورتیں ہیں (ہندی شبد ساگر) اور اردو میں صرف "الآپ" ہے۔ تو درمیں صحیح طور پر اس کو "الآپ" لکھ کر، قوسین میں نشان دہی کی گئی ہے کہ ہندی اور سنسکرت میں "آلاپ" ہے۔

ایجاد :

اس لفظ کی واسطہ ان خاصی دل چسپ ہے۔ اساتذہ و بلی و لکھنؤ نے بالعموم (اور بالاتفاق) اس لفظ کو مذکر استعمال کیا ہے، لیکن متعدد تصریحات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تذکیر و تانیث کسی نہ کسی حد تک معروض بحث میں رہی ہے، اگرچہ تانیث کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ (کچھ لوگوں کی) بول چال میں بتانیث آجاتا ہوگا، چون کہ جملہ اساتذہ اس کو مذکر مانتے رہے ہیں، اس لیے بتانیث

نظم کرنے کی جرات نہیں کی جاسکی۔ پھر یہ ہوا کہ جس لفظ کو دونوں دبستانوں کے ساتھ متفقہ طور پر مذکر مانتے آئے تھے؛ رفتہ رفتہ اُس کی تانیث کی طرف رجحان بڑھتا گیا، یہاں تک کہ آج کل عام طور پر اس کو مؤنث استعمال کیا جاتا ہے۔

نفید الشعر، ارمغانِ احباب، امیر اللغات، اور آصفیہ میں اس کو صرف مذکر لکھا گیا ہے اور اختلاف کا مطلق ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ صفیر نے بھی دشحات میں اس کو مذکر ہی لکھا ہے، اور اس صراحت کے ساتھ کہ: "مؤلف کہتا ہے کہ ایجاد" جو مؤنث مشہور ہے، اس کی سند مجھے ابھی تک نہیں ملی" (ص ۱۵۱)۔ اسی کتاب میں انہوں نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ: "عوام میں ایجاد" کا لفظ مؤنثِ ستعل ہے، حالانکہ مذکر ہے" (ص ۲۲۳)۔ تو میں بھی اس کو مذکر لکھا گیا ہے، مگر اس صراحت کے ساتھ: "بعض حضرات کی زبان پر یہ لفظ مؤنث ہی ہے"۔ مطلب یہ نکلا کہ تانیث کا گردِ محض گنگو تک تھا، خواص اس کو مذکر ہی مانتے تھے اور نظم میں مذکر ہی لایا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تانیث کی کوئی سند پیش نہیں کی جاسکی، اور صفیر کو یہ لکھنا پڑا کہ: "ایجاد جو مؤنث مشہور ہے، اُس کی سند مجھے ابھی تک نہیں ملی"۔

مؤلف معین الشعر نے "ایجاد" کو مذکر لکھ کر حاشیے میں یہ بھی لکھا ہے کہ منشی امیر اللہ تسلیم نے اسے مؤنث بھی نظم کیا ہے، اور سند میں تسلیم کا یہ شعر لکھا ہے: "رُکبِ اعداے کیا تسلیم خستہ کو شبید" دیکھیے ایجاد اُس ترکیبِ ستمِ ایجاد کی" لیکن مؤلف کا یہ خیال صحیح نہیں۔ مخدومی مولانا امتیاز علی قریشی (زاو مجد) کے خط سے معلوم ہوا کہ اس غزل کی روایت کی "کے بجائے کا" ہے، یعنی دوسرا مصرع یوں ہے: "دیکھیے ایجاد اس ترکیبِ ستمِ ایجاد کا"۔ یہ غزل اُن کے دیوانِ موسوم بہ "نظمِ دل افروز" میں ص ۳۰۹ پر ہے۔ اس طرح یہ واضح ہوتا ہے کہ اس لفظ کی تانیث کی کوئی سند نہیں ملی تھی۔

امیر مینائی نے امیر اللغات میں تو اختلاف کی طرف اشارہ نہیں کیا، البتہ ایک خط میں اس کا ذکر کیا ہے :

”ایجاد“ مذکور ہے۔ اس لفظ کی تذکیر و تانیث میں بحث چھڑی ہوئی ہے۔ سنا جاتا ہے کہ نواب مرزا خاں صاحب داغ کا قول ہے کہ دلی میں موت سنا جاتا ہے، مگر کلام میں موت کا پتا نہیں چلتا۔ اگر ایک معتبر شاعر نے بھی موت کہا ہوتا تو کہا جاتا کہ تختہ فیہ ہے۔ اور بغیر کلام میں آئے ہوئے کہیں کہیں بول چال میں ہونا کافی نہیں۔ (مکاتیب امیر مینائی، طبع دوم ص ۱۳۲)

امیر نے اور جو کچھ لکھا ہے، وہ سب صحیح ہے، مگر انہوں نے داغ سے جس قول کو منسوب کیا ہے، وہ قطعاً درست نہیں۔ یہ روایت بالکل غلط ہے کہ داغ اس لفظ کو موت کہتے تھے۔ صورت حال اس کے برعکس ہے۔ داغ کے کسی شاگرد نے اپنی غزل میں ”ایجاد“ کو موت لکھ دیا، اور وہ غزل چھپ بھی گئی؛ اس پر داغ نے برہمی کے عالم میں مولانا احسن مارہروی کو لکھا تھا :

”ایک اشتہار اس گل دستے میں آپ چھاپ دیجیے۔ اکثر آستانوں کے شاگرد ہاے خود آستانہ بن کر، اپنی غزلیں بے اصلاحی چھپوا دیتے ہیں، اس میں غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ کسی شخص نے لفظ ”ایجاد“ اور ”ارشاد“ کو موت باندھا، حالانکہ اہل بدلی کی زبان پر دونوں لفظ مذکور ہیں۔“ (انشائے داغ، ص ۱۳۳)

اسی سلسلے میں، مولانا احسن مارہروی نے، داغ کے ایک خط کے جواب میں لکھا تھا :

”میری غزل میں ”ایجاد“ کہیں موت نہیں ہے اور نہ میں نے لکھا؛ غالباً حق نے ملاحظہ نہیں فرمایا۔ میاں احسن شاہ جہاں پوری نے موت لکھا ہے جس کی اگلے پرچے میں صحت ہو جائے گی۔ مولوی عبداللہ بیجو نے ”ایجاد“ کو موت

لکھا ہے۔ خدا جانے کیا بات ہے کہ ایسے کہہ نہ مشق بھی ایسی فاش غلطیاں کرتے ہیں؟ (انشاء داغ، ص ۱۳۶)

مختصر یہ کہ بعض لوگوں کے علاوہ، دہلی دکنوں کے مستندین اس لفظ کو بالاتفاق مذکور مانتے رہے ہیں، مگر رفتہ رفتہ اس لفظ کی تائید کی طرف رجحان بڑھتا گیا۔ مولانا احسن مارہروی کے خط کا اقتباس درپیش کیا گیا ہے، جس میں انہوں نے اس لفظ کو موثق نظم کرنے کو فاش غلطی بتایا ہے، اور اپنی طرف سے استاد (داغ) کو یقین دلایا ہے کہ مجھ سے یہ غلطی نہیں ہوئی؛ یہی مولانا احسن، ایک زملہ کے بعد، اپنی کتاب تاریخ نثر اردو میں لکھتے ہیں:

”لفظ ایجاد“ کہ اس کو تمام یا بہ کثرت شعرا سے دہلی دکنوں نے ذکر استعمال کیا ہے، لیکن اب چند شعرا کے سوا اس کی تذکیر ہر شخص کو تاہل ہے یہی حال لفظ ”نہم“ وغیرہ کا ہے۔ (تاریخ نثر اردو، ص ۲۵۸)

آج کل عام طور پر یہ لفظ بہ تائید سننے اور دیکھنے میں آتا ہے۔ جیسے: امریکہ کی ایک نئی ایجاد۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ: امریکہ کا ایک نیا ایجاد۔ یا جیسے: زبانوں کا سیکھنا سکھانا، نسبتاً جدید زمانے کی ایجاد ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب (قواعد اردو، ص ۳) حضرت آثر لکھنوی نے میرے استفسار کے جواب میں لکھا تھا: ایجاد اور اپیل، میری زبان پر موثق ہیں، مگر اس کے برخلاف بھی سنا ہے۔ تذکیر و تائید کے لحاظ سے مختلف فیہ کہنا مناسب ہو گا؟ (مکتوب بنام راقم الحروف)۔

مناسب یہ ہے کہ فی الحال اس لفظ کو مختلف فیہ مان لیا جائے، اس صراحت کے ساتھ کہ اب عام طور پر بہ تائید، استعمال میں آتا ہے۔ کثرت استعمال کو دیکھتے ہوئے کہا لے اگرچہ اب سے پہلے اسی طرح لکھا جاتا تھا، جیسے: چونکہ پہلا ایجاد تھا، اس لیے تعریف کی آوازیں دو رنگ پہنچیں۔ محمد حسین آزاد (آب حیات، ترجمہ میر خلیق)

جاسکتا ہے کہ کچھ دنوں کے بعد استعمال عام میں صرف موتھ مانا جائے گا۔

اں، یہ بات لکھنے سے رہ گئی کہ اس سے پہلے امیر خود امیر اللغات (جلد دوم ص ۴۹) میں داغ کا یہ شعر ایجاد کی تذکیر کی سند کے طور پر لکھ چکے تھے،

ایجادِ بستم سے ہمیں برباد کریں گے گر تیس دن ایسے ہی وہ ایجاد کریں گے

یہ شعر گلزارِ داغ میں ہے (ص ۲۲۶)۔ اس کے بعد، داغ کے متعلق امیر کو یہ بدگمانی ہونا نہیں چاہیے تھی کہ وہ ایجاد کو موتھ کہتے ہوں گے، یا یہ کہتے ہوں گے کہ دہلی میں موتھ ہے۔

آغوش :

جلاک نے مفید الشعرا میں لکھا ہے : ”آغوش، بعضوں کے منہ پر، گو د کے قیاس پر، موتھ ہے، حالاں کہ یہ قیدِ نظم مذکر پایا جاتا ہے۔“ انھوں نے مذکر کی سند میں آتش و زندہ کا ایک ایک شعر پیش کیا ہے۔

جلاک کی عبارت سے صحیح صورت حال سامنے نہیں آتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اساتذہ دہلی نے اس لفظ کو موتھ مانا ہے، اور اساتذہ لکھنؤ نے مذکر کہا ہے۔ اساتذہ لکھنؤ میں سے صرف میر علی اوسطا رشک کا ایک شعر عام طور پر تائید کی سند میں پیش کیا گیا ہے، شعر یہ ہے :

شبِ فرقت کی آمد پا کے، آغوشِ محمدِ یحییٰ

قضا کی مہربانی ہے، اجل سرگرم احساں ہے (مجموعہ دواوین رشک، مکتبہ)

رشک کے مجموعہ دواوین میں اور کہیں یہ لفظ اس طرح مجھے نہیں ملا کہ تذکیر یا تائید کے متعلق کوئی فیصلہ کن بات کہی جاسکے، مثلاً :

منظور الہی تھی، ہم آغوشِ جاں شبِ تو مری آغوشِ تمنا کو بنایا (ص ۸۰)

آغوشِ زمیں تو ہاتھ آئی گو ہم مردودِ آسماں ہیں (ص ۱۲۳)

دونوں شعروں میں مری "اور آئی" کو یہ آئے محمول بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ اس طرح رشک کے اس شعر کی حیثیت، اساتذہ لکھنؤ کے عام طرز عمل کے مقابلے میں، شاذ کی سی قرار پاتی ہے۔

جلال کا یہ لکھنا کہ "بقیہ نظم مذکور یا جا آ ہے" صرف اس حد تک صحیح ہے کہ اساتذہ لکھنؤ نے عموماً اس لفظ کو مذکور باندھا ہے۔ لیکن اساتذہ دہلی نے اس کو موثق باندھا ہے اور اس کی مثالیں مام ہیں۔ اسی طرح کی عدم صراحت امیر اللغات میں بھی ہے، موقوف نے لکھا ہے کہ؟ شعرا نے مذکور بھی کہا ہے اور موثق بھی استعمال کیا ہے، چنانچہ مثالوں سے پیدا ہے، مگر موقوف کے نزدیک اس کی مذکور کو ترجیح ہے" (امیر اللغات)۔

صحیح صورت حال یہ ہے کہ لکھنؤ سے متعلق حضرات میں سے بیش تر نے اس لفظ کو یا تو صرف مذکور لکھا ہے (تخصیص مغل)۔ رسالہ بسیط، یا مذکور کو مرخ بتایا ہے (امیر اللغات، مفید الشعرا، معین الشعرا، رسالہ اصلاح)۔ صغیر نے مضمحات میں اس کو متضاد لکھا ہے مگر صراحت نہیں کی کہ ترجیح کسے ہے۔ صرف نور میں موثق کو مرخ لکھا گیا ہے اور رشک کے علاوہ دیگر اساتذہ لکھنؤ نے عموماً اس کو مذکور نظم کیا ہے۔

دہلی سے متعلق حضرات نے اس کو صرف موثق مانا ہے۔ ابتداء فرنگ صغیر میں "آغوش" مذکور چھپا تھا۔ اس کے متعلق موقوف اختلاف اللسان نے لکھا تھا،

لے تصنیف کلب حسین خاں نادر، تلمیذ ناسخ کتاب کا نام تاجی ہے، جس سے سال تصنیف (یا تکمیل تصنیف) مشتق ہو سکتا ہے۔ اسی سال یہ مطبع منشی رام سروپ واقع بمبئی فتح گڑھ میں چھپی تھی۔ کل ۱۵۰ صفحے میں موزونات، تذکیر و تانیث، عروض وغیرہ کے مختصر بیانات ہیں، بعض اقتدار کے یہ کتاب اہم حیثیت رکھتی ہے۔

لے مولفہ منشی وجاہت حسین وجاہت جمہنی انوس، تلمیذہ داغ، سال طباعت ۱۲۸۵ھ مطبوعہ رفاہ مام سٹیٹ پریس لاہور۔ موقوف کے الفاظ میں اس کتاب میں دہلی اور لکھنؤ کی رہائی لکھے صفحہ پر،

۔ آغوش، لکھنؤ میں ذکر لولا جاتا ہے..... منشی سید احمد صاحب دہلوی نے
فرہنگِ آصفیہ میں آغوش کو ذکر لکھا ہے۔ اس کے تعلق معاصیہ صیغہ لفظات
نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ یا تو کتاب کی غلطی ہے، یا حقیقت میں اہل دہلی
بھی اس لفظ میں اختلاف رکھتے ہیں۔ حضرت استاد مرحوم (فیض الملک
داغ دہلوی) نے فرہنگِ آصفیہ میں آغوش کو ذکر چھپا دیکر، قافیہ و
روایت کے لحاظ سے یہ لفظ موثق کہا ہے :

مفتا ہی نہیں وہ جُبت سے نوش ہماری

خالی ہے شبِ وصل بھی آغوش ہماری

اہل دہلی "آغوش" کو عموماً موثق ہی بولتے ہیں۔ فرہنگِ آصفیہ میں جو اس
کو ذکر لکھا ہے، تو یہ یقیناً کتابت کی غلطی ہے، کیوں کہ ایسی غلطیاں کتاب
ذکورہ میں اکثر پائی جاتی ہیں؟ (اختلاف اللسان، ص ۲)

اختلاف اللسان کے مولف کا خیال صحیح تھا، اور یہ کتابت ہی کی غلطی تھی، کیوں کہ اس
کے بعد جو جلد اول باضابطہ شائع ہوئی تو اُس میں یہ لفظ موثق ہی ہے، لیکن اس
تبدیلی یا تصحیح کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا گیا ہے۔

مختصر یہ کہ یہ لفظ مختلف ذیل الفاظ میں سے ہے اور یہ اختلاف، دبستانی حیثیت
رکھتا ہے، کہ عموماً اربابِ لکھنؤ نے اس کو مذکر کہا ہے، (فرہنگ کے ایک شعر کے علاوہ) اور
اساتذہ دہلی نے مشفق طور پر اس کو موثق مانا ہے۔ یہ اختلاف، اب بھی سلفے میں آتا رہتا
ہے اور تحریر میں بھی دکھائی دے جاتا ہے۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) زبان کے الفاظ اور محاورات کا فرق بیان کیا گیا ہے۔ ص ۴۴ صفحہ کار سار
ہے مگر بہت سی کار آمد باتیں اس میں پائی جاتی ہیں۔ مولف نے سرورق پر زبان دہلی کو اردو سے
مطلقاً اور زبانِ لکھنؤ کو اردو سے مطلقاً لکھا ہے۔

دو مضمونی باتیں لکھی جاتی ہیں :

۱۔ آصفیہ میں آغوش کے ذیل میں آغوش کھول کر لینا ”بھی لکھا ہوا ہے، اور مولف نے اس کی سند میں تعلق کا یہ شعر لکھا ہے :

ہو گئی ہے قرار تو ہر موج دوڑی آغوش کھول کر ہر موج

صاف ظاہر ہے کہ یہ شعر آغوش کھول کر لینا کی سند نہیں ہو سکتا۔ امیر اللغات و نور اللغات میں آغوش کھول کر لینا موجود ہی نہیں، ہاں آغوش کھول کر لینا ضربہ درج ہے اور سند میں ناسخ کا یہ شعر لکھا ہوا ہے :

بسان ساحل دریا ہو مشکل چھوٹا ناسخ
لیٹ جاؤں اگر میں کہوں کہ آغوش جاناں

۲۔ امیر المقاتلینؑ آغوش سے نکلتا، کی مسند میں داع کا ایک شعر لکھا ہوا ہے، جس میں یائے معروف کے بجائے یائے مجہول کے آنے سے، اس لفظ کی تائید، تذکیر سے بدل گئی ہے۔ غالباً یہ غلطی کتابت ہے۔ شعر یہ ہے:

جس طرح تو مرے آغوش سے نکلائے شوخ یوں ہی ہاتھوں سے نکلتی ہے طبیعت میری
 ”مرے آغوش“ کی جگہ ”مری آغوش“ ہونا چاہیے؛ اس لیے کہ دیگر اساتذہ دہائی کی
 طرح، داغ بھی اس لفظ کو حتمی طور پر مؤثر نہ مانتے تھے۔ حوالہ اور آچکا ہے۔



جلاں نے مفید شعرا میں اس کو مختلف فیہ لکھا ہے :

املا مختلف فیہ ہے، یعنی مذکور موش دونوں طرح بولا جاتا ہے، لیکن مذکور بیش تر اور موش کم تر۔ جیسا کہ رشک مغفور موش فرماتے ہیں :

نامہ جاناں ہے کیا لکھا مری تقدیر کا خط کی انشا اور ہے، لکھنے کی املا اور ہے
 الا، موافق اس کی تندگیہ ہی کا قائل ہے :

اس کے برخلاف، موافق فصیح اللغات نے اس کو مذکر لکھ کر صراحت کے ساتھ اس کی نفی کی ہے کہ فصحا اس کو دونوں طرح بولتے ہیں۔ اُن کی عبارت یہ ہے :

لے۔ دآخ کے عزیز شاگرد مولانا احسن مارہروی نے اس لغت کی ترتیب کا کام شروع کیا تھا بقول مولانا احسن : اول اول تو حضرت مہرورد کو اس کتاب سے کوئی خاص لکھا ہی نہیں ہوئی، مگر رفتہ رفتہ جب میرے شوق اور غلو میں حقیقت کا اندازہ فرمایا تو اس کتاب کی طرف متوجہ ہوئے اور ایسی تو ترقی فرمائی کہ اچھے بیٹھنے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، احسن ہے اور فصیح اللغات، فصیح اللغات ہے اور اس کی تالیف ؟ (مقدمہ یا دگار دآخ)

دآخ کا خیال یہ تھا کہ اس طرح زبانِ دہلی کا ایک صحیح لغت مرتب ہو جائے گا۔ فرنگیہ کتب خانہ میں زبانِ دہلی کا تجذیب ہے؛ مگر موافق تصفیہ کے متعلق دآخ کی جو رائے تھی وہ مولوی عبد الرزاق کانپوری (مصنف البراکہ) کے بیان سے معلوم ہوگی۔ مولوی صاحب نے دہلی و بارہ کے موقع پر دآخ سے ملاقات کی تھی، اُس کا حال لکھتے ہوئے، انھوں نے لکھا ہے :

میں نے دریافت کیا کہ مولوی حمید احمد لمبوی نے کس سال کی محنت میں فرنگیہ تصفیہ لکھی ہے۔ تحقیقات لغات اور محاورات اور زبان کی حیثیت سے اس کتاب کی نسبت جناب کی کیا رائے ہے ؟ فرمایا کہ حمید احمد، عرب سرائے کے باشندے تھے۔

اور یہ کہ کمر خاموش ہو گئے۔ بکتر سوال کرنا، میں نے بھی ادب کے خلاف سمجھا۔ یوں ہیام ص ۴۵ یہ بات پیش نظر رہنا چاہیے کہ عرب سرائے پرانی دہلی کے باہر ہے۔ اس سے دآخ کی رائے کا برخلاف اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ مولوی صاحب کو مستند اہل زبان میں سے نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے یہ ہے کہ بیانت (فصیح اللغات) مکمل نہیں ہو سکا۔ حمید آباد کے کسی طبقے میں اس کے کچھ اجزا چھپے تھے، لیکن معلوم نہیں کہ وہ سب کیا ہوئے۔

مولانا احسن نے مئی ۱۹۱۷ء سے رسالہ فصیح الملک جاری کیا (مقدمہ یا دگار دآخ) اُس لغت کے کچھ اجزا اس میں شائع ہوئے تھے۔ اب اس رسالے کے سب ٹکڑے بھی باقی لکھ سطر ہیں۔

یہ لفظ ناوا تفلوں کی بول چال میں بہ حالت تذکیر و تانیث، دونوں طرح
مستعمل ہوتا ہے، مگر اب تک شعراے متقدمین و متاخرین میں، رشک
لکھنوی کے سوا، اور کسی کے کلام میں "املا" کی تانیث نہیں پائی گئی ہے
(رسالہ فصیح الملک، ص ۱۹۹)

سفیر نے رشحات میں، ترجیح کی صراحت کے بغیر، صرف مختلف فیہ لکھا ہے۔
مولفین امیر اللغات، نور اللغات، معین الشعرا نے اس کو مذکر لکھ کر، یہ صراحت کر دی
ہے کہ رشک نے مونث لکھا ہے۔ رشک کے لغت نفس اللفظ کے دیباچہ نگار
نے بھی یہی بات لکھی ہے: "یہ لفظ عموماً زباؤں پر تذکیر کے ساتھ ہے۔۔۔ لیکن رشک نے
مونث باندھا ہے" (دیباچہ نفس اللفظ) مولف آصفیہ نے اس کو صرف مذکر لکھا ہے، اور
واقعہ فوگڈشت، ایک جا شادی میں، مولف پبلک البکر پوری رام پور میں اس کے کئی سال کے شاہی
مخلوط ہیں۔ داغ اس لغت کے لیے سند کے شعر خاص طور پر کہا کرتے تھے۔ اس کا التزام کیا گیا
تھا کہ اس لغت میں سند کے شعر صرف داغ کے کہے ہوئے ہوں گے۔ اگر یہ مکمل ہو جاتا تو واقعی
ایک عمدہ ذخیرہ ہوتا۔

یہ رشک کا لغت ہے۔ نام تاریخی ہے۔ اس کا صرف حصہ اول، اُن کی موت کے بعد،
نیر بریں لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ یہ حصہ حرف ت پر ختم ہو جاتا ہے۔ باقی حصوں کا پتا نہیں چلتا۔
امیر مینائی نے ایک خط میں لفظ "املا" کے ذیل میں، اس لغت کی عبارت لکھی ہے: اس
سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لغت کم سے کم حرف ام تک تو ضرور مکمل ہو چکا تھا، اور اُس کا
مخلوط امیر کی نظر سے گزرا تھا۔ امیر مینائی کا یہ خط مکاتیب امیر مینائی، مرتبہ احسن اللہ خاں
حائب میں شامل ہے۔ نفس اللفظ کے حصہ اول کا دیباچہ شعر لکھنوی نے لکھا ہے،
جس میں بہت سی کام کی باتوں کو یک جا کر دیا ہے۔ میسر اخیال ہے کہ یہ لغت مکمل
ہو چکا تھا۔

اختلاف کا ذکر نہیں کیا ہے۔ رشک کے مجموعہ دو اوتچ میں یہ لفظ اور کہیں اس طرح نہیں آیا ہے کہ تذکیر یا تانیث کے متعلق کوئی فیصلہ کن بات کہی جاسکے۔

صاحب فصیح اللغات کا یہ لکھنا کہ یہ لفظ نادانوں کی بول چال میں بہ حالت تذکیر و تانیث آتا ہے، صحیح نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اکثریت تذکیر کی قائل ہے اور بالعموم اساتذہ نے اس کو ذکر استعمال کیا ہے، لیکن بعض ارباب نظر اس کی تانیث کے بھی قائل رہے ہیں اور انھوں نے اس کو بہ تانیث استعمال بھی کیا ہے۔ اوپر یہ لکھا جا چکا ہے کہ صغیر نے رخصت میں اس کو مختلف فیہ لکھا ہے اور ترجیح کا ذکر نہیں کیا ہے، مگر ان کے ذکر سے جلوہ خضر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تانیث کے قائل تھے۔ جلوہ خضر کی پہلی جلد میں، ص ۸ پر ایک جملہ یوں چھپا ہوا ہے: "کوئی کہتا ہے اس کے الما غراب ہے"۔ کتاب کے غلط نامے میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس کے الما "غلط ہے، اس کی جگہ اس کی الما" لکھا جائے۔ اس انداز سے قطعی طور پر اس کا تعین ہوتا ہے کہ صغیر اس لفظ کو مونث مانتے تھے۔

غالب نے اپنے رسالے تیغ تیز میں ایک جگہ لکھا ہے: "جو علما و شعرا ایران سے آئے، لہجہ ان کا ہندی نہیں ہوا، املا اہل ہند کی املا کے موافق رہی جو تیغ تیز، مطبوعہ اکمل المطابع، ص ۲۴۔ نیز قاطع برہان و رسائل متعلقہ، مرتبہ قاضی عبدالودود صاحب ص ۲۸۵۔ اس سے معلوم ہوا کہ دہلی والوں میں سے مرزا غالب، اس کی تانیث کے قائل تھے۔

سید میر علی اوسط رشک گھنوی، تلخیص ناسخ، متوفی ۱۳۵۷ھ (تکلیات منیر شکوہ آبادی)، جہد ناسخ اور ناسخ سے مشوب بہت سی اصلاحات زبان و قواعد کے واضح دراصل رشک تھے۔ (لاحظہ ہو مقدمہ انتخاب ناسخ، شائع کردہ مکتبہ جامعہ، دہلی۔ آب حیات، بہ ذیل ترجمہ ناسخ، تلخیص علی رشک کے دو دیوان ایک ہی جلد میں چھپے تھے، ایک کا نام نظم مبارک اور دوسرے کا نام نظم گرامی ہے۔ دونوں تاریخی نام ہیں۔ یہ مجموعہ ان کی زندگی ہی میں (باقی اگلے صفحہ پر)

آغا جتوہندی لکسنوی نے، رسالہ بسیط میں، اس لفظ کو مختلف فیہ لکھ کر موثق کو مرجع لکھا ہے۔ ہندی کا شمار لکسنو کے مستندین میں کیا جاتا ہے۔ ان مثالوں کے بعد، رشک کے مندرجہ بالا شعر کو بھی ”املا“ کی تائید کے ثبوت میں بلا حلف قبول کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح لکسنو کے دو مستند استادوں کے یہاں ”املا“ کی تائید کی اسناد ملتی ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ لفظ ”املا“ درحقیقت مختلف فیہ ہے، مگر اس طرح کر دہی و لکسنو کے اکثر اساتذہ نے اس کو مذکور استعمال لیا ہے، اور کم لوگوں نے اس کو موثق مانا ہے۔ موثق ماننے والوں میں مرزا غالب، صغیر بلگرامی، رشک لکسنوی اور آغا جتوہندی لکسنوی کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں۔ البتہ آج کل اس لفظ کو بالعموم مذکور استعمال کیا جاتا ہے، اور اب شاید ہی کوئی شخص اس کو بہ تائید استعمال کرتا ہو، ہم از کم میری نظر سے ایسی کوئی مثال نہیں گزری۔

اصل بحث کے بعد، بعض ضمنی باتیں بھی جاتی ہیں :

مہذب اللغات میں ”املا“ کو ذکر لکھا گیا ہے۔ مولف نے یہ صراحت بھی کی ہے کہ : ”رشک اور اختر (شاہ اورہ) نے موثق بھی نظم کیا ہے، لیکن موجودہ دور میں مذکور ہی ہے۔“۔ مولف نے تائید کی سند میں رشک کا وہ شعر لکھا ہے جس کا حوالہ پر آچکا ہے، اور واجد علی شاہ اختر کا یہ شعر پیش کیا ہے :

”مگر یہ بھی نکلا سرا پا غلط تھی انشا غلط اور املا غلط“

مولف مہذب اللغات کا یہ خیال ہرگز صحیح نہیں کہ اختر کے اس شعر سے ”املا“ کی تائید

(بقیہ صفحہ ۱۸۵) علامہ اعلیٰ چیمپا تھا۔ ایک دیوان حوض میں ہے، اور ایک حاشیہ پر تیسرا دیوان جو ان کی زندگی ہی میں مرتب ہو چکا تھا (دیوانچہ فصوص اللغز) شائع نہیں ہو سکا۔ اس کا ایک نسخہ پاکستان میں ہے، اور ایک آزاد لاہور پریس علی گڑھ میں محفوظ ہے۔

(حاشیہ تذکرہ ابن امین اللہ طوفان، ص ۴۴)

ثابت ہوتی ہے۔ اس شعر سے نہ تائید ثابت ہوتی ہے نہ تذکیر۔ مصرع ثانی میں یہ لازم نہیں کہ نقلی کا اطلاق "املا" پر بھی ہو۔

مولف نے اسی ذیل میں مزید لکھا ہے: اسطے کی کاپی، اسطے کا نظم، وغیرہ رائج میرؔ لفظ "املا" میں امالہ روا نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ مولف مہذب اللغات انٹے کی کاپی سلکھنے پر تیار نہیں ہوں گے۔ جس طرح "انٹے کی کاپی" نہیں لکھا جاسکتا، اُسی طرح اسطے کی کاپی" بھی نہیں لکھ سکتے۔ عربی کے جو مصادر باب افعال سے آتے ہیں اور اردو میں مستعمل ہیں، اُن میں امالہ نہیں ہوتا۔

۲۔ ارمغانِ احباب میں ایک نل چسپ صورت یہ ہے کہ اُس میں مفرد لفظ "املا" موجود نہیں، البتہ "املا و انشاء" لکھا ہے، گویا یہ مرکب استراحتی ہے؛ مولف نے اس مرکب کو موتھ لکھ کر مسند میں رشک کا زیر بحث شعر درج کیا ہے؛ اور انھوں نے اس لفظ کی تذکیر کا مطلق ذکر نہیں کیا ہے۔

۳۔ مفید الشعرا میں رشک کے مذکورہ شعر کا مضرع اول اس طرح چھپا ہوا ہے: "نامہ جاناں ہے کیا لکھا مری تقدیر کا"۔ اس رسالے کے جواڈیشن میری نظر سے گزرے ہیں، اُن میں یہ مصرع اسی طرح ہے۔ رشک کے دیوان میں "یا لکھا مری تقدیر کا" ہے (مجموعہ دوادین رشک، ص ۲۵۵)۔ ہاں نور میں صحیح طور پر "یا لکھا" لکھا ہے۔

۴۔ جلاک، صفیر، مولف ارمغانِ احباب، مولف نور، صاحب فصیح اللغات اور مولفین امیر اللغات د معین الشعرا نے رشک کے جس ایک شعر سے "املا" کی تائید کی سہل ہے، کیا اُس کو قبول کیا جاسکتا ہے؟ یہ بات واضح کر دی جائے کہ غالب، ہمدانی اور صفیر کے حوالوں کے بعد رشک کا شعر بھی بلا تکلف قابل قبول ہے اور اب اُس میں کسی طرح کا شک نہیں کیا جاسکتا، مگر جلاک اور صفیر نے تذکیر و تائید کی اسناد کو قبول کرنے کے لیے جو شعر ادا رکھی ہیں؛ اُن کے پیش نظر، یہ دونوں حضرات رشک کے صرف اس شعر

سے فائدہ استناد حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ ان دونوں صاحبوں نے صرف رشک کا ہی ایک شعر تانیث کی سند میں پیش کیا ہے، اور کوئی دوسرا حوالہ ان کے سامنے نہیں تھا۔ اس لیے، اپنے ہی نامے ہوئے اصول کے تحت، یہ دونوں حضرات اس شعر کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔

جلاں نے لفظ "رقم" کے ذیل میں، اس اصول کی مراحت اس طرح کی ہے،
 "ہندسے کے معنی پر رقم" کو جناب مرزا والا جاہ مرحوم نے ذکر فرمایا ہے۔

ہمارے رزق کا ہے فرقہ قسمت میں رقم غالی
 ہمیشہ صفر کے اندر رہتا ہے شکم غالی
 حالانکہ رقم" پر معنی مذکورہ بالاتفاق موقوف ہوا جاتا ہے۔ پس موقع مستہام کہتا ہے کہ جب نہیں ہے کہ اصل میں یہاں "کی" ہو اور کاتب نے "کا" لکھ دیا ہو۔

مطلب یہ نکلا کہ جن اشعار میں صرف "کی" یا "کا" پر تذکرہ یا تانیث مبنی ہو، ان میں غلط الکاتب کا احتمال رہتا ہے۔ رشک کے شعر میں بھی تانیث کا انحصار صرف لفظ "کی" پر ہے (ع، خط کی املا اور ہے، لکھنے کی انشا اور ہے) یہاں بھی وہی احتمال پیدا ہو سکتا تھا کہ شاید اصل خط کا املا "ہو"۔

صغیر نے بھی اسی اصول کو مانا ہے، مانا ہی نہیں، دوسروں پر اعتراض بھی کیا ہے۔
 حرف "واو" کی تذکرہ و تانیث کے بیان میں انہوں نے لکھا ہے:

"واو کی سند کے لیے اگرچہ مرزا و تیر صاحب کا یہ بند موجود ہے،

خیر النساء کالال اوصروہ شقی اوصروہ

اور پنج میں وہ گزرتاں بارالہند جس طرح واو عطف کا امین خیر و شر

مگر میرے اصول کے خلاف ہے، کیوں کہ حلف کا "کی جگہ" مفق کی بھی

ہو سکتا ہے۔ (درشحات ص ۱۳۷)

یہی نہیں، افعال پر انھوں نے اسی طرح کے اعتراض کیے ہیں، مثلاً جلاکر نے
مطلوبی کی تائید کی سند میں رشک کا یہ شعر لکھا ہے:

"مطلوبی سبزہ خط صاف ہی تھمتی ہے" ہیں وہی عارضی آئینہ جاننا۔ جنگا

صغیر نے اس پر اس طرح اعتراض کیا ہے:

"اور رشک کے شعر کی سند جو دی گئی، اُس کو ماننا مشکل ہے، کیوں کہ

مطلوبی سبزہ خط صاف ہی کہتا ہے۔" بھی ہو سکتا ہے۔ اردو سے نقلی کتابت

یہ مثال کافی نہیں۔ حضرت جلال ایسی ہی مثالیں دیا کرتے ہیں: (درشحات ص ۶۸)

اصول پرستی اور اصول پسندی کے اس انداز کے بعد، فقط اصلا کے سلسلے

میں رشک کے اُس شعر کو، ان دونوں حضرات کو، کسی قید کے بغیر، قبول نہیں کرنا

چاہیے تھا۔



لُغَت اور استعمالِ عام

اردو، بہت سی زبانوں کے لفظوں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں عربی و فارسی کے لفظوں کی تعداد اتنی خاصی ہے۔ یہ لفظ کسی اعتبارات سے اہمیت رکھتے ہیں۔ عربی کے اکثر لفظ، اردو کو فارسی کے واسطے سے ملے ہیں۔ یہاں کے بڑے لکھے لوگ عربی سے واقف تو ہوا کرتے تھے، مگر عربی کو یہ مرتبہ کبھی حاصل نہیں ہو سکا کہ وہ ہندوستان میں دفتری زبان بن سکے، یہ شرف فارسی کے حصے میں آیا اور اسی لیے فارسی کے اثرات، عربی کے مقابلے میں ہر گزیر رہے۔ ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ مختلف و مجروح بنا پر، ایرانی تہذیب اور زبان کو، عربی تہذیب اور زبان کے مقابلے میں ہندوستان سے قریب کی نسبت تھی، اور حکم راں خاندان بھی عموماً اُسی طرف سے آتے رہے۔ یہ خاندان آئے ہوں کسی علاقے سے، مگر ایرانی اثرات اُن کے ساتھ آئے۔ ایرانی تہذیبی اثرات تھے ہی اس قدر طاقتور، ہر گزیر اور ہر جہت۔ فارسی زبان کا مزاج بنیادی طور پر عربی سے مختلف ہے۔ یہ دونوں زبانیں، زبانوں کے دو مختلف خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ عربی اثرات بہت طاقتور تھے، مگر ایرانی مزاج نے اُن کو کبھی حکم راں نہیں بننے دیا۔ فارسی کے مقابلے میں عربی زبان کہیں کو سنیج اور باقاعدہ تھی، مگر دوسری طرف ایرانی تہذیب مجموعی طور پر کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھی، اور اُس نے لسانی سطح پر بھی عربی کے اثرات کو اس طرح غالب نہیں ہونے دیا کہ فارسی کی اپنی خصوصیات دب جائیں

یا فنا ہو جائیں۔ سیاسی اثرات کی بنا پر یہ لازم تھا کہ عربی کے لفظ فارسی میں اپنی جگہ بنائیں اور ایسا ہوا۔ بے شمار عربی لفظ فارسی زبان کا حصہ بن گئے، مگر فارسی نے بہت سے لفظوں کو اس طرح قبول کیا کہ وہ اس کے مزاج سے ہم آہنگ ہو گئیں۔ حرکات اور بناوٹ بل کما فی میں بھی بہت سے تصرفات کیے اور بہت سے لفظوں میں قوافی تزیینات کو بھی شامل کر دیا۔ ان تصرفات کے اثر سے عربی کے لفظ فارسی زبان کا جزو معلوم ہونے لگے۔ یہی صورت عرض کی ہوئی جو فارسی کی بدولت فنگلی کے بہت سے اجزاء سے روشناس ہوا۔ ایرانی آہنگ نے کچھ اوزان کو جو اس کے لہجے سے میل نہیں کھاتے تھے، قبول نہیں کیا۔ دوسری طرف بہت سے مترنم اوزان کا اضافہ کیا۔ طاقت در زبانوں کی ایک پہچان یہ بھی ہوا کرتی ہے۔

جس طرح عربی کے بہت سے لفظوں کو فارسی میں تصرفات سے دوچار ہونا پڑا تھا، وہی صورت اردو میں رونما ہوئی کہ عربی فارسی کے بہت سے لفظوں کو یہاں کے تقاضوں کے تحت تصرفات سے دوچار ہونا پڑا اور یہ ہونا ہی تھا۔ ہر زبان کا مزاج اور لہجہ مختلف ہوتا ہے۔ عربی کے بہت سے لفظوں کا صحیح تلفظ ہمارے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ فارسی کے کچھ لفظوں کا بھی یہی حال ہے۔ مثلاً "عیال" عربی کا لفظ ہے اور پکسر اول ہے (عیال) اردو والا اس کو "عیال" کہے گا تو لہجہ بگڑ جائے گا۔ یا جیسے فارسی میں "فرشتہ" کی ف پر زیر ہے مگر اردو میں سب "فرشتہ" کہتے ہیں، اگر اس کو اردو میں "فرشتہ" کہا جائے تو دہن بگڑنے کا احتمال ہوگا۔ یا جیسے عربی کے متعدّد ایسے لفظ ہیں جن کے اعراب میں کوئی اختلاف نہیں، مگر تلفظ میں ہے۔ اور یہ فرق ہندوستانی لہجے کا فریدہ ہے۔ مثلاً احمد، محمود، مشر و ضرہ، کہ یہ عربی میں پہلے عرب اول ہیں، اردو میں ان کو پہلے عرب اول ہی مانا جاتا ہے، مگر فتح کا تلفظ وہ نہیں ہوتا جو اول عرب کا خاصہ ہے، بل کہ ایسے الفاظ کے تلفظ میں ایک طرح کی امالے والی کیفیت پائی جاتی ہے۔ بعض لوگ ایسے الفاظ کو اصل کی پابندی کے زعم میں، اسی قاریاد لہجے کے ساتھ بولتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اردو کے لحاظ سے

یہ تلفظ قطعاً غیر فصیح ہے۔ جیسے "احمد" اصلاً بروزن "افضل" ہے، لیکن اردو میں الف کے ذہر میں ترجمان در آتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے "احمد" "غیر" کے ذہر پر زبان سے ادا ہوا ہے۔ یا جیسے "مل" (اے معنی قصر) کی ح پر ذہر ہے، لیکن ہمارے تلفظ میں ذہر کی آواز ذہر کی آواز سے مشابہ ہو کر نکلتی ہے۔ اردو میں اسی تلفظ کو فصاحت کی سند حاصل ہے۔ [مل بہ لام مشدود، جیسے، مل استعمال، اس کی صورت مختلف ہے، اس کو ذہر میں رکھنا چاہیے] اسی قبیل کے ہندی کے بھی کچھ امثال ہیں، جیسے بہل گیا، بہک گئے، بہک اٹھا، دہک گیا وغیرہ؛ ان میں ہائے ہوز مفتوح ہے، لیکن فتح کی آواز، کسرے سے قریب ہو کر نکلتی ہے۔ تالیف میں بہل "مل" کے ساتھ آتا ہے اور بہک "بھک" کے ساتھ آئے گا؛ مگر تلفظ میں وہی امالائی کیفیت رہے گی۔

اشتقاق، تلفظ، معانی اور املا کے لحاظ سے عربی و فارسی لفظوں میں بہت سی تبدیلیاں ہوتی ہیں، اور یہ ضروری ہے کہ ایسے سب تغیرات کا جائزہ لیا جائے اور ان تغیرات کو بہ خوشی قبول کیا جائے۔ اس مضمون میں اختصار کے ساتھ صرف تلفظ کے تغیرات پر گفتگو کی جائے گی، اور اس کا مقصد یہ ہوگا کہ اس اہم موضوع کی طرف باضابطہ توجہ کو منعطف کرایا جائے۔ اردو میں اب اگر کوئی مفصل لغت مرتب ہو (اور ہونا چاہیے)، تو اُس میں ایسے تغیرات کی نشان دہی لازم ہوگی، اور ضروری ہوگا کہ ایسے لفظوں میں تلفظ کے تغیرات کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ اردو کے تلفظ کو اب معیاری حیثیت دی جائے۔ کچھ لفظوں کے متعلق متفرق طور پر یہ لکھا بھی گیا ہے، مگر ایسے الفاظ کی پوری فہرست نہیں بنائی گئی ہے۔ عربی فہرست کے ایسے لفظوں کی تعداد انہی خاص ہے جن میں اعراب کی تبدیلی ہوتی ہے یہاں اُن سب کا املا کرنا مقصود نہیں، مقصد صرف یہ ہے کہ بطور مثال ایسے الفاظ کی ایک فہرست مرتب کی جائے اور تفصیلات کے بغیر، مثلاً الفاظ میں تبدیلی حرکات کا ذکر کیا جائے۔ لغت نویس کے لیے اس فہرست کی حیثیت ایک اشارہ نما کیس ہوگی۔ اس سے اتفاق

کیا جائے گا کہ یہ موضوع ہماری خصوصی توجہ کا مستحق ہے، اور یہ کہ اس سلسلے میں ابھی تک باخابطہ کام نہ ہونے کے برابر ہوا ہے۔ لغت میں الفا کے بعد دوسری بنیادی حیثیت تلفظ کی ہوتی ہے اس لیے یہ از بس ضروری ہے کہ ایسے لفظوں کے تلفظ کا قیاس طویل اور کچھ طور پر تعین کیا جائے۔ اس کے بغیر کوئی لغت مکمل نہیں ہو سکتا۔

زبان پہلے بنتی ہے، قواعد و لغت کی کتابیں بعد کو مرتب کی جاتی ہیں۔ اس طرح اصولی طور پر ہونا تو یہ چاہیے کہ ہر لفظ (عام طور پر) جس طرح بولا جاتا ہے، اُس کو اُس طرح درج لغت میں کیا جائے، یا کوئی اور صورت ہے تو اُس اختلاف کی نشان دہی کی جائے، مگر اردو لغات میں اکثر لفظوں کے متعلق اس سلسلے میں ناتمامی پائی جاتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ایک ذائقے تک عربی فارسی لغات سے اختلاف کرنا کچھ اچھا نہیں سمجھا گیا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ کچھ لفظوں میں تلفظ کا اختلاف اس قدر نمایاں تھا کہ اُس کو نظر انداز کیا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو لغات میں کچھ لفظوں کے ذیل میں اختلاف یا تغیر کا ذکر ملے گا اور کچھ لفظوں کے ذیل میں نہیں ملے گا۔ یا یہ کہ ایک لغت میں ایک اختلاف کا ذکر ہو گا اور دوسرا اُس سے خالی ہو گا۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ لفظ کو لغت میں تو ”معیاری“ مرکبات کے ساتھ ہی لکھا جائے، خواہ بول چال میں وہ کچھ اختلاف کے ساتھ آتا ہو۔ اور ”معیار“ کا تصور غیروادخ ساقا۔ کہیں تو اُس سے اصل زبان کے لغات یا قواعد کی مطابقت مراد ہوتی تھی، اور کہیں اُس سے اہل علم و ادب اعتبار کے مدد و طبیعت کا طرز عمل مراد لیا جاتا تھا، اور کہیں اہل زبان کے اختارات سے مراد لی جاتی تھی۔ اس غیروادخ صورت حال کا یہ نتیجہ ہونا بھی تھا کہ اس سلسلے میں انتشار باقی رہے، اور مختلف مقامات پر مختلف صورتیں رونما ہوں۔

دوسری وجہ یہ ہوتی کہ شعر میں لفظ کی حرکت کا تعین بالعموم قافیے میں کیا جاتا ہے۔ قافیے کے علاوہ ساکن و متحرک حروف کا تعین تو بعض اوقات شعر میں قافیے کے علاوہ

ہو سکتا ہے، مگر دیر ذریکاتین نہیں ہو پاتا۔ قافیے میں رو کی و ما قبل رو کی حرکات مسوب ہوتی ہیں۔ اس طرح جو لفظ سحرئی و چار حروفی وغیرہ ہوتے ہیں، ان کے حروفِ اولیں کی حرکات کا تین شعر میں نہیں ہو پاتا۔ چون کہ لغت میں عموماً اسناد میں شعر پیش کیے جاتے رہے ہیں، اور الفاظ کی حرکات کا بھی اکثر تین ان کے واسطے سے ہوتا رہا ہے، اس لیے اولین حروف کی حرکات کا تین مشکل تھا۔ مثلاً شعر کی مد سے لفظ ”عیال“ یا ”عیال“ کی عین کی حرکت کا تین نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے برخلاف مثلاً ”گھائل“ میں ما قبل رو کی حرکت کا تین کیا جاسکتا ہے۔ اب ”عیال“ یا ”عیال“ کے حرفِ اول کی حرکت کا تین کس طرح ہو؟ تو اسان طریقہ یہی تھا کہ لغت کی طرف رجوع کیا جائے، اور اُس میں اس کو ”بکسر حرفِ اول“ لکھ دیا جائے، تو اُسی کو نقل کر لیا جائے۔ ورنہ اور سند کہاں لے گی؟ یہی وجہ ہے کہ عموماً تین حروفی، چار حروفی وغیرہ الفاظ کے حروفِ اولیں کی حرکات کے تین میں زیادہ اختلاف ملتا ہے اور نامتائی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ اور یہ بات اہم ہے کہ تلفظ کی اکثر تبدیلیاں مختلف الفاظ میں شروع کے دو حروف میں ہوتی ہیں، جیسے، فرشتہ، بہشت، عیال، نفی، میت، مسید، حرکت، قلند، کلمہ، ارنی، غلظت، قلنی وغیرہ۔ اردو میں عربی و فارسی (وغیرہ) کے جن لفظوں میں حرکات کی تبدیلی ہوتی ہے، تو وہ تبدیلی، یہاں کے لہجے کا تقاضا تھا۔ ہر زبان میں یہی ہوتا ہے کہ دوسری زبانوں کے لفظ (اکثر و بیش تر) اُس زبان کے سانچے میں اس طرح داخل جاتے ہیں کہ اجنبیت کا شائبہ بھی نہیں رہتا۔ حرکات کی تبدیلی پہلے زبانوں پر اپنی جگہ بناتی ہے، اور پھر لغت میں جگہ پاتی ہے۔ یہ ذریعائی وقف (یعنی زبانوں سے نکل کر لغت میں جگہ پانا) خاما صبر آدما ہوتا ہے۔ اس میں زیادہ الجھن اس لیے ہوتی ہے کہ استعمالِ عام کی سطحیں مختلف ہوتی ہیں۔ یہ مسلمات میں سے ہے کہ غالباً قبولِ تبدیلیوں کا تین ذرا دیر میں ہو پاتا ہے۔ جب تک کوئی تغیر استعمالِ عام کی اُس سطح تک نہ پہنچ جائے جہاں پہنچ کر اُس کو اعتبار کی سند ملتی ہے، اُس وقت تک وہ

لغت کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس میں قیاس ساتھ نہیں رہتا۔ یعنی اس بنا پر کہ ایک لفظ میں حرکت کا تغیر قابل تسلیم ہے، یہ لازم نہیں کہ اُس انداز کے دوسرے الفاظ میں بھی وہی تغیر روا ہوا ہو، یا قابل تسلیم ہی ہو۔ مثلاً "نفس" میں اصلاً ساکن ہے، مگر یہ اردو میں کسر دوم مستقل ہے اور یہ استعمال اُس سطح تک پہنچ چکا ہے جہاں سے استفادہ کی حدیں شروع ہو جاتی ہیں؛ اس لیے اس کو کسر دوم بھی قبول کیا جائے گا، مگر اس کے قیاس پر اس کے ہم وزن الفاظ کو لازماً شامل نہیں کیا جاسکتا، جیسے "خفت" کو "خفت" کی صورت میں نہیں مانا جائے گا، جب کہ استعمال کی ایک سطح پر یہ تلفظ ملتا ہے، مگر قابل قبول سطح تک یہ ابھی نہیں پہنچ سکا ہے۔ اور یہی وہ فرق ہے جس کو قدما نے اور لغت نویسوں نے "غلط العام" اور "غلط العوام" کے ناموں سے موسوم کیا ہے۔ "غلط العوام" کو آپ جو بھی حیثیت دیجیے، شوق کے ساتھ سنیے بھی، مگر اُس کو لغت میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ "نظم" کو کچھ لوگ "نظم" کہنے لگیں اور اُن میں دو چار مبتدئ پڑھے لکھے بھی ہوں؛ تب بھی اس کو قابل قبول نہیں قرار دیا جائے گا۔ میں اس امکان سے انکار نہیں کرتا کہ کسی زمانے میں یہ قابل تسلیم ہو سکتا ہے؛ مگر وہ زمانہ کب آئے گا، اس کا مجھے علم نہیں۔ مقصود یہ ہے کہ استعمال عام کی پہلی سطح پر تلفظ میں جو مختلف قسم کی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، وہ سب لازماً قابل قبول نہیں ہوتیں۔ اُن تبدیلیوں کو قابل قبول سطح تک آنے کے لیے اور اپنی جگہ بنانے کے لیے ایک طریق وقفے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہت سی تبدیلیوں میں سے کچھ تبدیلیاں ہی قابل قبول سطح تک پہنچ کر اپنی جگہ بنا پاتی ہیں اور اُسی صورت میں وہ لغت کے لیے قابل قبول ہو سکتی ہیں۔ اس بات کو ضرور پیش نظر رہنا چاہیے۔

ایک دوسری بات یہ ہے کہ بہت سے لفظ ایسے ہیں کہ ہل چال کی حد تک اُن میں تبدیلی نمایاں ہو چکی ہے، مگر نظم میں اور فارسی ترکیب میں وہ عموماً اصل کے مطابق ہی

آتے ہیں۔ اس ذیل میں ساکن الاوسط الفاظ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مثلاً "شع" اور "جمع" میں اسلام ساکن ہے لیکن اردو کی بول چال میں یہ عموماً بفتح آتے ہیں اور یہ صورت قابل قبول سطح پر اپنی جگہ بنا چکی ہے؛ مگر شعر میں اور فارسی ترکیب کی صورت میں یہ پسکون آتے ہیں۔ شعر میں اگر "شع" باندھا جائے تو فوراً غیر مناسب معلوم ہوگا اور گفتگو میں اگر "شع" کہا جائے تو اچھا نہیں لگے گا۔ ایسے الفاظ کے متعلق یہ خیال رکھنا جائے گا کہ نظم میں تو یہ اُسی طرح رہیں گے جس طرح اب تک رہے ہیں، اور دوسری طرف بول چال میں بھی اُن کی مروج صورت محفوظ رہے گی۔ ضرورتِ شعری اور روایتِ شعری اور بول چال کے ضابطے اپنی اپنی جگہ پر رہیں گے اور دونوں مقامات پر ان ضابطوں کے تحت ہی الفاظ اپنے کو نمایاں کرتے رہیں گے۔ اس امتیاز کو لازماً برقرار رہنا چاہیے اور اس کو ختم کرنے کی کوشش ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ بے امتیازی یوں بھی بہت بڑا عیب ہے، پھر یہ بات بھی ہے کہ ادبی زبان اور بول چال کی زبان میں کچھ نہ کچھ فرق تو رہتا ہی ہے اور رہے گا بھی، اور یہ بھی مسلمات میں سے ہے۔

اردو میں لغت نویسی کی روایت خاص پرانی ہے اور خاص بات یہ ہے کہ مختلف ادوار میں اس کا تسلسل ملتا ہے۔ آخری مفصل لغت تو نور اللغات تھا، مگر اُس کے بعد بھی اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کام ہوتا رہا ہے۔ ان لغات کے مرتبین نے (جن میں مولف نور اللغات خاص طور پر قابل ذکر ہیں) تغیر حرکات کا ذکر کیا ہے، مگر بہت سے لفظ اُس سے محروم رہے ہیں اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ایسے الفاظ کا تفصیل کے ساتھ ہمارے یہاں جائزہ نہیں لیا گیا؛ اب ضروری ہے کہ اس ضروری کام کو مکمل کیا جائے، کیوں کہ اس کے بغیر لغت کی تکمیل نہیں ہو سکے گی، اور پرانے لغات میں تلفظ کی حد تک جس نامتائی کا احساس ہوتا ہے، وہ صورت حال اُسی طرح باقی رہے گی۔ اس ذیل میں قابل قبول تغیرات کا تعین اصل کام ہوگا۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، بہت سے

لفظوں میں مختلف سطحوں پر طرح طرح کے تغیرات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، مگر وہ سب لازماً قابل قبول نہیں ہو سکتے۔ زبان کی شایستگی اور اعتبار بڑی چیز ہے، اور لغت اُس کا آئینہ دار اور امین ہوتا ہے۔ جس طرح عربی و فارسی لغات کی آنکھیں بند کر کے تقلید نہیں کی جاسکتی، اُس طرح استعمال عام کے نام پر ہر خوب و ناخوب کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں الفاظ کی فہرست مرتب کرنا ہوگی اور نہایت احتیاط کے ساتھ اُس کی غور کر کے، ہر لفظ کے متعلق الگ الگ فیصلہ کرنا ہوگا۔ لغات میں ایسے کچھ لفظوں میں اختلافِ حرکات کا ذکر ملتا ہے، اُس کو بھی مثال کے طور پر سامنے رکھا جاسکتا ہے۔ اس مضمون کا مقصد یہی ہے کہ ایسے الفاظ کی پہلی فہرست پیش کی جائے، اور ان تغیراتِ حرکات کی نشان دہی کی جائے جو مضمون نگار کی رائے میں لغت کے لیے ہر اعتبار سے قابل قبول ہیں۔ اس سلسلے کے کچھ لفظ ایک اور "ون" صحتِ الفاظ میں زیر بحث آئے ہیں، ان کو بھی اس فہرست کا جز سمجھنا چاہیے۔ اس مضمون میں نور اللغات کے لیے نمونہ اور فرہنگِ آصفیہ کے لیے آصفیہ بہ طور مختلفات استعمال کیے گئے ہیں۔

آصف : اصلاً ص مفتوح ہے، مگر اردو میں زبانوں پر اکثر بہ کسر صاؤ ہے۔ نور اللغات میں یہ لفظ موجود ہے، مگر ضبطِ حرکات کے بغیر البتہ ایہ اللغات میں ص پر زیر لگا ہوا ہے، "صَف" اور فرہنگِ آصفیہ میں ص پر زیر لگا ہوا ہے۔ اس لئے، دونوں حرکات قابل تسلیم ہیں، اس صورت کے ساتھ کہ بہ کسر صاؤ اردو کا تصرف ہے اور اب اکثر اسی طرح بولا جاتا ہے۔ اچار : آصفیہ میں اس کو "آچار" لکھا گیا۔ "آچار" کو عوام سے متعلق کیا گیا ہے۔ آچار بنانا، آچار ڈالنا، آچار کرنا، آچاری سب کو الفِ ممدودہ کے

ساتھ ہی لکھا گیا ہے۔ اردو میں "اچار" بولا اور لکھا جاتا ہے اور اردو کے لحاظ سے یہی صورت صحیح اور فصیح ہے۔ "اچار" کو فارسی سے مخصوص قرار دینا چاہیے۔ احدی : اصلاً ح پر زیر ہے۔ اردو میں کابل اور کئے آدمی کو کہتے ہیں اور اس میں یہ یہ سکون ح مستقل ہے۔

ارجمند : فارسی میں ج ساکن ہے۔ صاحب غیاث اللغات نے خاص طور پر حرت کی ہے کہ ہر ضم جیم غلط ہے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ نور میں ہے اور اُس میں بھی پنجم جیم کو غلط بتایا گیا ہے۔ البتہ امیر اللغات میں ج پر کش بنا ہوا ہے : اَرْجَمَنْدہ اردو میں یہ لفظ اسی طرح مستقل ہے بگفتگو میں ج کا ضمہ نمایاں رہتا ہے اور یہ سکون جیم، اردو کے لہجے سے میل نہیں کھاتا۔

اسفندیار : فارسی میں یہ کسر اول ہے، مگر اردو میں زبانون پر یہ فتح اول ہے اور اب یہی حرکت مزعج ہے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ نور اور امیر اللغات میں اس کو فارسی حرکات کے مطابق (اسفندیار) لکھا گیا ہے۔

اسلمہ : عربی کے لحاظ سے آل پر زیر ہے۔ بول چال میں یہ یہ فتح لام (اَسْلَمَ) بھی آتا ہے۔ اس لفظ کی دونوں حرکات قابل تسلیم ہیں۔ یہ فتح لام کو اردو کا نصر مانا جائے گا۔ اردو لغات میں اس کو عربی کے مطابق لکھا گیا ہے۔

اصفہان : فارسی میں یہ کسر اول ہے مگر اردو میں یہ فتح اول زیادہ مستقل ہے۔ آصفیہ میں یہ موجود نہیں۔ امیر اللغات و نور اللغات میں اس کو اصل کے مطابق کسر اول ہی لکھا گیا ہے۔ اس لفظ کی دونوں حرکات کو لغت میں درج کرنا چاہیے، اس صراحت کے ساتھ کہ اردو میں زبانون پر عموماً یہ فتح اول ہے۔

افق : اصلاً ہفتین ہے (أَفَقٌ)۔ آصفیہ، نور اور امیر اللغات میں اس کو

اصل کے مطابق پختیں ہی لکھا گیا ہے۔ اردو میں اس کا ایک تلفظ ”اُفت“ بھی ہے (پختیم اول فتح ثانی)۔ اس تلفظ کو بھی مان لینا چاہیے اور درج لغت کرنا چاہیے۔

اکسیر : یہ لفظ لغت کسبر اول ہے۔ آصفیہ، نور، امیر اللغات؛ سب میں اس کو کسبر اول لکھا گیا ہے، بل کہ مولف نور نے مراحت بھی کر دی ہے کہ بالغ غلط ہے۔ اردو میں زبانوں پر فتح اول بھی ہے اور ”اکسیر“ کے مقابلے میں ”اکسیر“ زیادہ سُخنے میں آیا ہے۔ بہر صورت اس لفظ کے دونوں تلفظ درج لغت ہونا چاہیے، اس مراحت کے ساتھ کہ فتح اول اردو کا تصرف ہے اور اکثر اسی طرح سُخنے میں آتا ہے۔

الماس : اصلاً حرف اول مفتوح ہے (الماس)۔ اردو میں زبانوں پر کسبر اول بھی ہے، اور اب پیش تر اسی طرح سُخنے میں آتا ہے۔ اردو لغات میں اس کو اصل کے مطابق صرف فتح اول لکھا گیا ہے۔ اس لفظ کو دونوں طرح تسلیم کر لینا چاہیے۔ کسبر اول اردو کا تصرف ہوگا۔

ایوان : اردو میں یہ لفظ صرف فتح اول مستقل ہے اور اسی طرح ماننا چاہیے۔ خیث اللغات میں اختلاف حرکت کا ذکر کیا گیا ہے (ایوان، آیوان) مگر اردو میں اس اختلاف کا گزن نہیں۔ نور میں یہ لفظ موجود ہے مگر حرکات کی مراحت کے بغیر ————— فرہنگ آصفیہ میں اور امیر اللغات میں یہ لفظ موجود ہے اور ان میں الف پر زبر لگنا ہوا ہے۔

باقر : یہ لفظ لغت ق مکسور ہے (باقر) نور میں بھی اس کو اصل کے مطابق کسبر سوم لکھا گیا ہے۔ اردو میں اس کو کسبر ثانی شاید ہی کوئی بولتا ہو، سب لوگ ”باقر“ کہتے ہیں۔ باقر ثانی بھی فتح سوم مستقل ہے۔ اردو میں اب اس لفظ کو صرف فتح سوم ماننا چاہیے۔ آصفیہ

میں "باقر" موجود نہیں، البتہ "باقرقانی" ہے اور اُس میں قاف پر زبر لگا ہوا ہے۔
 نور میں "باقرقانی" اعراب یا صراحت کے بغیر ہے۔

بہر : آصفیہ میں "بَیْر" لکھا ہوا ہے۔ تو سین میں لکھا ہے "صحیح، بَیْر" صاحب نور اللغات نے
 اختلاف حرکت کا ذکر کیا ہے، مگر یہ بھی لکھا ہے کہ "اُردو میں زبانوں پر وزن لگ کر ہے"۔
 فارسی میں یہ پسکون دوم ہے۔ بہاؤِ نجم میں اس کو ہفتی دوم بھی لکھا گیا ہے مگر
 یہ صراحت بھی کر دی گئی ہے کہ فارسی والے پسکون دوم استعمال کرتے ہیں۔ بہر طور
 اردو میں یہ لفظ صرف ہفتین مستعمل ہے، اور اردو کے لیے اب یہی صورت مرتج
 ہے۔ یہ نظم میں پسکون دوم آسکتا ہے۔

برادر : غیاث اللغات میں اس کو ہفتی اول لکھا گیا ہے۔ آصفیہ میں بَ پر زبر
 اور زیر دونوں حرکات لگائی گئی ہیں، "برادر" یعنی مولف کے نزدیک یہ لفظ
 دونوں طرح مستعمل اور صحیح ہے۔ نور میں غیاث اللغات کی عبارت کا ترجمہ کر دیا
 گیا ہے مگر یہ بھی لکھا ہے کہ "یہ لفظ زبانوں پر کسرا اول ہے"۔ بول چال میں یہ لفظ صرف کسرا
 اول ہے اور اردو میں اس لفظ کو صرف کسرا اول ماننا چاہیے۔

برقع : عربی میں قاف پر زبر بھی ہے اور پیش بھی (صراح) اردو میں یہ صرف ہفتی سوم
 مستعمل ہے۔ بہنیم سوم کو عربی سے مخصوص سمجھنا چاہیے اور اردو سے غیر متعلق۔
 برہنہ : یہ لحاظ اصل حرف اول مفتوح ہے۔ اردو میں اس طرح بھی استعمال کرتے
 ہیں اور کسرا اول بھی بولتے ہیں۔ یہی صورت "برہن" کی ہے کہ اصلاً
 حرف اول مفتوح ہے، مگر گفتگو میں کسرا اول بھی آتا ہے۔ اس کو اردو کا
 تصرف قرار دے کر شامل لغت کر لینا چاہیے۔

بشارت : اصلاً بَ پر پیش اور زیر ہے۔ اردو والے صرف ہفتی اول استعمال
 کرتے ہیں۔ آصفیہ میں "بشارت" لکھا ہوا ہے۔ مولف نے مزید لکھا ہے،

”بول پال میں ہر فتح مودہ، محم بہ ختم یا کسر با“ اسی طرح کے اندراجات غلط فہمی پیدا کرتے ہیں۔ اردو میں بشارت ”لکھنے کا مطلق جواز نہیں۔ یہی صورت بشارت“ کی ہے۔ اردو میں اب صحیح صورت ”بشارت“ ہے اور اس لفظ کو صرف اسی طرح ماننا چاہیے۔

بقراط : نور میں یہ لفظ موجود نہیں۔ آسفیہ میں بقراط ”بر فتح اول“ ہو موقوف نے صراحت بھی کی ہے : ”محم بہ فتح مودہ“ اور زبان زد خاص و عام حضرت مودہ : ”جب زبان زد خاص و عام بہ ختم حرف اول ہے، تو پھر بقراط“ لکھنے کا جواز کیا ہے ؟ اردو میں اب اس لفظ کو صرف بہ ختم اول ماننا چاہیے اور بہ فتح اول کو اردو سے غیر متعلق سمجھنا چاہیے۔

بنفشہ : نور میں اس کو ”بر فتح با و نون و شین“ لکھا ہے، اردو میں اسی طرح بولتے ہیں، مگر موقوف نے اس تلفظ کو فارسی سے بھی متعلق بتایا ہے۔ یہ درست نہیں۔ فارسی میں بہ فتح اول و نون اور بر خشتین ہے۔ آسفیہ میں ”بنفشہ“ لکھا ہوا ہے، مگر اُس میں بھی یہ وضاحت نہیں کہ یہ اردو کا تفسر ہے۔ اس سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ فارسی میں جو بھی صورت ہو اردو میں یہ صرف بہ فتح اول و دوم و چارم مستقل ہے، اور اردو کی حد تک اسی کو صحیح ماننا چاہیے۔

بہادر : لغات میں اس کو بہ ختم دال لکھا گیا ہے۔ یہ لفظ اس طرح بھی مستقل ہے اور اس کا ایک تلفظ بہ فتح دال بھی ہے۔ اس تلفظ کو بھی تسلیم کر لینا چاہیے۔ یہ اردو کا تصرف ہو گا۔

بہزاد : بہ لحاظ اصل یہ لفظ کسر اول ہے (بہزاد) مگر اردو میں (بازوں) پر مونا بہ فتح اول ہے، اور اردو کے لحاظ سے یہی فیہ معلوم ہوتا ہے۔ آسفیہ میں

یہ لفظ موجود نہیں۔ تَوْر میں ہے اور اُس میں اصل کے مطابق کسپر اول ہی لکھا گیا ہے۔

بہشت : تَوْر میں اس کو کسپر تین لکھا گیا ہے، مگر اردو میں کسپر اول و دوم کوئی نہیں ہوتا۔ اُردو میں اس لفظ کو ہر فتح اول کسپر دوم بھیج لکھنا چاہیے۔
 بیاباں : فارسی میں حرفِ اول کو مفتوح بھی بتایا گیا ہے اور مکسور بھی۔ اردو میں یہ عموماً زبانون پر کسپر اول ہے، تَوْر میں اس لفظ کے اعراب کا ذکر نہیں کیا گیا۔ دونوں حرکات قابلِ تسلیم ہیں (بیاباں، بیاباں)

پروردگار : اصل کے لحاظ سے دال موقوف ہے، نور اللغات میں بھی اسی طرح ملتا ہے، مگر گفتگو میں دال مکسور ہو جاتا ہے۔ اگر اصل کے مطابق کوشش کر کے دال کو موقوف رکھا جائے اور ”پُروردگار“ کہا جائے تو گفتگو کی روانی پر اچانک حرف آجائے گا۔ یہ صورت اس لفظ سے خاص ہے۔ جیسے ایک اور لفظ ہے ”خداوندگار“، اُس کی یہ صورت نہیں، اُس میں دال موقوف ہی ہے۔
 پریشاں : فارسی میں حرفِ اول مکسور بھی ہے اور مفتوح بھی، اسی رعایت سے مولف تَوْر نے اس کو دونوں طرح لکھا ہے، اور اُن کی تحریر سے یہ متبادر ہوتا ہے کہ فارسی کی طرح اردو میں بھی حرفِ اول مکسور اور مفتوح ہے۔ مگر یہ ٹھیک نہیں۔ اُردو میں یہ صرف ہر فتح اول مستقل ہے۔ کسپر اول کو فارسی سے متعلق قرار دینا چاہیے۔

پڑمردہ : فارسی میں حرفِ اول مکسور بھی ہے اور مفتوح بھی۔ اردو میں یہ صرف ہر فتح اول مستقل ہے۔

پنجرہ : آصفیہ میں اس کو ”پنجرہ“ لکھا گیا ہے، یعنی تَوْن ساکن اور جیم موقوف۔ اس کے برخلاف تَوْر میں ”پنجرہ“ ہے، یعنی جیم مفتوح۔ مولف نے

فوسین میں یہ بھی لکھا ہے، "اردو میں ہر سکونِ جیم بھی مستقل ہے۔" اس اندازِ نگارش سے مترشح ہوتا ہے کہ موافق کی رائے میں اردو میں یہ لفظ دونوں طرح مستقل ہے۔ ہر حرکتِ جیم کی سند میں تیز کا یہ شعر لکھا گیا ہے،

جوشِ جنوں ہمیشہ ہے دل ہائے چاک میں
شیروں سے خالی ایک گھڑی بجز نہیں

مگر استعمالِ عام میں یہ لفظ صرف پہلے موافق آتا ہے۔ ہر حرکتِ جیم کو از جیم شاذ اور بے متروک سمجھنا چاہیے، اور اس کی مراحت کی جانا چاہیے۔

پوچ : فارسی میں "آو" معروف ہے۔ اس رعایت سے "آو" میں بھی "آو" پر معروف ہونے کی علامت ملتی ہے (پوچ)۔ بولِ حال میں عام طور پر یہ ہر "آو" مجہول سُٹنے میں آتا ہے، ہر "آو" معروف شاید ہی کوئی بولتا ہو۔ اردو میں ہر "آو" مجہول کو مریخ قرار دینا چاہیے۔ آصفیہ میں معروف و مجہول کی مراحت نہیں ملتی۔

تشنہ : آصفیہ میں "تشنہ" اور "تشنگی" کی ت پر زیر لگا ہوا ہے۔ اس کے برخلاف "آو" میں اس کو پہلے فتح اول لکھا گیا ہے اور کسرا اول کو غلط بتایا گیا ہے، "پہلے تائیم" ہے، کسرا تا غلط، "فارسی میں جو بھی صورت ہو" اردو میں زبانوں پر یہ دونوں لفظ عموماً کسرا اول ہیں، اور یہی تلفظ مریخ ہے۔ ان لفظوں کی دونوں حرکات کو درج لغت ہونا چاہیے، مگر اس مراحت کے ساتھ کہ اردو میں مستقل کسرا اول ہیں، اور یہ اردو کا تقرب ہے، اور صحیح دونوں طرح ہیں۔

تغلق : غیاث اللغات میں اس کو پہلے اول و سوم (تغلق) لکھا گیا ہے اور مراحت کر دی گئی ہے کہ "از لغاتِ ترکی نوشتہ شد" اردو میں یہ لفظ پہلے اول و پہلے سوم (تغلق) مستقل ہے، اور اردو کے لیے اس کی یہ صورت

صحیح مانے گی۔ آصفیہ و نور میں یہ لفظ موجود نہیں۔

تلمیذ : صاحب نور اللغات نے لکھا ہے، "تلمیذ ع۔ یہ لفظ عربی میں بالفتح، فارسی میں بالکسر ہے۔" یہ برعکس بات ہے۔ یہ لفظ عربی میں کسرِ اول ہے (التلمیذ) یہ صراحت بھی کر دی گئی ہے کہ شاید یہ فارسی کے لفظ "تلمیذ" پر فتحِ اول کی تقریب ہے، تلمیذ بالکسر، شاگرد، تلامذہ جمع۔ و ظاہر فارسی است و عربی فصیح نیست، ولہذا صاحب قاموس نیا درودہ، انا تحقیق آن است کہ معرب تلمیذ است بالفتح "منتخب اللغات"۔ مطلب یہ ہوا کہ فارسی میں یہ فتحِ اول ہے۔ اور عربی میں کسرِ اول۔ اردو میں صرف یہ فتحِ اول مستقل ہے۔ کسرِ اول کو عربی سے متعلق سمجھنا چاہیے۔

تیمور : آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ نور میں اس کو اصل کے مطابق پرواز "ذی نور" لکھا گیا ہے، مگر اردو میں عموماً زبانوں پر یہ فتحِ اول ہے۔ اور کبھی کبھار کسرِ اول دیا جے بھول بھی سُسنے میں آجاتا ہے۔

جبروت : اصلاً یہ فتحِ اول و دوم ہے۔ اردو میں یہ پہلے کون دوم بھی مستقل ہے، اور یہ اردو کا تصرف ہے۔ اس لفظ کی دونوں صورتیں تسلیم کر لینا چاہیے۔ **فرہنگ آصفیہ اور نور اللغات** میں یہ لفظ اصل کے مطابق صرف یہ فتحِ اول و دوم ہے۔

جدہ : عربی میں یہ فتحِ اول و والِ مشدّد مفتوح کے معنی ہیں، مادرِ مادر و مادرِ پدر (منتخب اللغات)۔ اور معروف بندرگاہ کے معنی میں کسرِ اول اور بر نیمِ اول و دونوں طرح ہے (غیاث اللغات)۔ اردو میں ان دونوں معانی میں یہ لفظ صرف یہ فتحِ اول و والِ مشدّد مفتوح مستقل ہے، اور اردو میں اس طرح سمجھ مانا جائے گا۔

جرح : اردو میں یہ لفظ یکسر اول و فتح دوم بھی بول چال میں آتا ہے ، اور اس کی یہ صورت بھی قابل تسلیم ہے۔ آصفیہ کے اندراج سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قانونی معنی میں بالفتح پڑھنا چاہیے۔ یعنی مولف کے نزدیک اس کی صرف دو صورتیں ہیں ، جرح ، جرح۔ مگر ”جرح“ (ہضم اول و سکون دوم) تو اردو میں مطلقاً مستقل نہیں۔ اس کو مرئی سے مخصوص سمجھنا چاہیے۔ ترکیب کی صورت میں مونا یہ ہر سکون دوم آتا ہے ، جیسے ، جرح و تعدیل۔ سچ کو عموماً زیر کے ساتھ ہی بولا جاتا ہے ، ممکن ہے کہ کچھ لوگ یہ صورت ترکیب اس کو بہ فتح اول بھی بولتے ہوں ، مگر مفرد لفظ ”جرح“ یکسر اول و فتح دوم ہی گفتگو میں آتا ہے۔ ”جرح کرنا“ میں بھی اس لفظ کی یہی صورت رہتی ہے۔

جسارت : اصلاً بہ فتح اول ہے۔ بول چال میں یہ یکسر اول بھی آتا ہے۔ اس لفظ کی دونوں حرکات مان لینا چاہیے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ نور میں ہے اور صرف بہ فتح اول۔

جعفر : (ایک علم کا نام) اصلاً ہر سکون دوم ہے۔ اردو میں بہ فتح اول و دوم مستقل ہے ، اور اردو کے لحاظ سے یہ مرتب ہے چون کہ نظم میں یہ پہل کے مطابق ہر سکون دوم استعمال کیا گیا ہے ، اس لیے اس لفظ کو دونوں طرح سمجھ ماننا چاہیے ، مگر اس مراحت کے ساتھ کہ اردو میں اب مستقل بہ فتح ہے۔

جمع : اصلاً یہ لفظ ہر سکون دوم ہے۔ اس طرح استعمال میں بھی آتا ہے۔ ترکیبوں میں تو صرف اسی طرح استعمال کیا جاتا ہے اور اسی طرح استعمال بھی کرنا چاہیے ، البتہ گفتگو میں عام طور پر یہ بہ فتح دوم آتا ہے ، جیسے ، بہت مال جمع ہو گیا ہے۔ اس مراحت کے ساتھ اس لفظ کو بہ فتح دوم بھی درست مان لینا چاہیے ، اور یہ اردو کا تقریباً ہوگا۔ ترکیب میں یہ بہ دستور ہر سکون دوم رہے گا۔ (تو یہی)

اضافی، مطلق، کوئی سی بھی ترکیب ہو)۔

جنازہ : عربی میں حرفِ اول مکسور بھی ہے اور مفتوح بھی (مثنوی اللغات)۔
اردو میں صرف پہنچ اول مستقل ہے۔

جنوب : اصل میں ج پر زبر ہے۔ اردو میں جہنم دوم استعمال ہوتا ہے، اور اب یہی مرغ صورت ہے۔ لغت میں دونوں حرکات کا اندراج ہونا چاہیے، مگر مراحت کے ساتھ۔

چراغ : فارسی میں حرفِ اول کو مفتوح بھی کہا گیا ہے اور مکسور بھی (غیاث اللغات)۔
اردو میں بھی یہ دونوں طرح سننے میں آتا ہے، مگر پہنچ اول کم اور کسر اول زیادہ۔ "چراغی" تو کسر اول ہی بولا جاتا ہے۔ "چراغاں" دونوں طرح سننے میں آیا ہے۔ اردو میں دونوں صورتوں کو میم ماننا چاہیے مگر مندرجہ بالا مراحت کے ساتھ۔ آصفیہ میں "چراغ" لکھا ہوا ہے، اور کسر اول کے متعلق کچھ وضاحت نہیں کی گئی۔ نور میں فارسی کے اختلاف کا تو ذکر کیا گیا ہے، مگر یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ اردو میں کیا صورت ہے۔

چکن : اردو میں یہ لفظ صرف کسر اول و فتح دوم مستقل ہے، اور اردو میں اب اسی طرح محم اور فیم ہے۔ آصفیہ میں "چکن" لکھا گیا ہے مگر قوسین میں یہ بھی لکھا ہوا ہے، "میم کسرتین"۔ اس اندراج سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ اردو میں بھی میم کسر اول و دوم ہے۔ مگر یہ میم نہیں ہوگا اور مولف کا بھی یہ مطلب نہیں۔ کسرتین کو فارسی سے مخصوص سمجھنا چاہیے۔ نور میں اس کی اصل حرکات "پہنچ اول و کسر دوم" بتائی گئی ہیں، مگر یہ اندراج صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اصلاً یہ کسر اول و دوم ہے۔ اور اردو میں یہ صرف کسر اول و فتح دوم ہے۔

چم : اصلاً یہ لفظ ہکون دوم صحیح ہے۔ اردو کی بول چال میں یہ اکثر پہنچ دوم

آتا ہے۔ اس لفظ کو دونوں طرح صحیح مان لینا چاہیے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ نور میں صرف ہر سکون دوم ہے۔

حلق : ہر لفظ لغت پر فتح اول و سکون دوم ہے، مگر زبانوں پر فتح اول و دوم بھی ہے۔ دونوں طرح مان لینا چاہیے۔ ترکیب کی صورت میں اہل کے مطابق ہر سکون دوم ہی آتا ہے۔

حلقوم : لغت میں ح پر پیش ہے، مگر استعمال عام میں فتح اول ہے۔
 حلیہ : خلعت اور صورت و خلعت کے معنی میں اصلاً کسر اول ہے اور سونے چاندی (وغیرہ) کے زیور کے معنی میں کسر اول و چشم اول و دونوں طرح ہے (متنب اللغات)۔ اردو میں یہ لفظ صورت، چہرہ، خط و خال (جو شناخت کے لیے لکھے جائیں) کے معانی میں چشم اول استعمال ہوتا ہے، اور اب یہی حرکت قابل قبول ہے۔

حوصلہ : لغت میں اس کو پر فتح اول و سوم و چارم لکھا گیا ہے۔ نور و آصفیہ میں بھی یہی صورت ملتی ہے۔ بول چال میں ہر سکون سوم آتا ہے اور عموماً اسی طرح مستقل ہے، اور یہی صورت مرخج ہے۔

خانقاہ : نور میں پر فتح ثون اور ہر سکون ثون دونوں طرح لکھا گیا ہے۔ اردو میں صرف ہر سکون ثون مستقل ہے اور صرف یہی صورت قابل قبول ہے۔

خاوند : اصلاً پر فتح واد ہے۔ زبانوں پر کسر واد ہے، اور یہی صورت مرخج ہے۔ نور میں لکھا ہوا ہے کہ ”اردو میں کسر واد و زبانوں پر ہے“

خباشت : عزل میں خ پر زبر ہے (المجد)۔ اردو میں زبانوں پر کسر اول بھی ہے۔ دونوں حرکات درج لغت ہونا چاہیے اس مراحت کے ساتھ کہ اردو میں عام طور پر کسر اول مستقل ہے، ہاں، آصفیہ و نور دونوں میں

”مجاہد“ لکھا ہوا ہے۔ آصفیہ میں تو حرکات کے متعلق اور کچھ نہیں لکھا گیا ہے، البتہ ”تور“ میں تو سین میں ”برنج اول“ بھی لکھا ہوا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج پر پیش کتابت کی غلطی ہے، مگر یہ دل چسپ بات ہے کہ دونوں لغات میں یہ غلطی پائی جاتی ہے۔

”خجستہ“ اصلاً ”ختم اول و ختم دوم“ ہے، مگر اردو میں ”ختم اول و کسر دوم“ مستقل ہے اور یہی صورت مروج ہے۔

”خدمات“ بہ لحاظ لغت کسر اول و ختم دوم (خدمات) ہے، مگر اردو میں صرف کسر اول و سکون دوم مستقل ہے اور اسی طرح ”خجستہ“ ہے۔ ”تور“ میں اس کو عربی کے مطابق ”کسر اول و ختم دوم“ لکھا گیا ہے۔ اردو کے تصرف کا ذکر نہیں ملتا۔ آصفیہ میں اس کے برعکس ”خدمات“ ملتا ہے اور اس کو عربی لکھا گیا ہے۔ یہ انتساب صحیح نہیں، یہ تو مہند صورت ہے۔ یہ لکھنا ضروری تھا کہ اصلاً ”خدمات“ ہے اور اردو میں ”خدمات“ مستقل ہے اور یہ مہند صورت ہے۔

”خدمت کجہ“ اصل کے لحاظ سے یہ ”برنج اول و کسر دوم“، ”بروزی“ ”خجستہ“ ہے۔ آصفیہ میں یہ موجود نہیں۔ ”تور“ میں ہے اور اصل کے مطابق۔ اردو میں یہ لفظ بہ طور نام مستقل ہے اور عام طور پر ”ختم اول و ختم دوم“ مستقل ہے۔ اس لفظ کی دونوں صورتیں قابل قبول ہیں۔

”خدیو“ فارسی میں یہ کئی طرح ہے، مگر اردو میں مومنا پر ”برنج اول و کسر دوم“ دیا ہے۔ بھول مستقل ہے اور یہ آئے معروف بھی محض میں آیا ہے۔

”خراج“ عربی میں ”برنج اول“ ہے۔ فارسی الے کسر اول بھی کہتے ہیں (غیاث اللغات)۔ اردو میں صرف کسر اول مستقل ہے۔ ”تور“ میں اردو کے اس

تقریب کا ذکر کیا گیا ہے، مگر آصفیہ میں صرف ”خراج“ لکھا ہوا ہے۔

خضم : دو لفظ ہیں : (۱) خضم، پہنچے اول و سکون دوم، اس کے معنی ہیں، دشمن، بد خواہ، حریف، مقابل وغیرہ۔ (۲) خضم، پہنچے اول و دوم، شوہر کو کہتے ہیں۔ آخر الذکر اردو کی ایجاد ہے، اور عورتوں کی زبان سے بھلا لگتا ہے۔ لفظ تو ایک ہی تھا، اختلاف معانی نے دو لفظ بنا دیے ہیں۔ مناسب یہ ہے کہ اب لغت میں ان کو الگ الگ لکھا جائے۔ آصفیہ میں شوہر کے معنی میں بھی ”خضم“ لکھا گیا ہے، یہ ٹھیک نہیں۔ اس معنی میں متفقہ طور پر ”خضم“ ہے۔ ہاں ترکیبات میں جب یہ لفظ آئے گا، تو اردو کے عام قاعدے کے مطابق پسکون دوم آئے گا، جیسے، دو خضی، خضموں بیٹی، خضموں بیٹی۔

خصوصیت : لغت میں خ پر زبر بھی ہے اور پیش بھی۔ توڑ میں دونوں حرکات کی نشان دہی کی گئی ہے۔ استعمال عام میں صرف پیش اول ہے اور اسی طرح قابل قبول ہے۔

خطی : اصلاً پس اول ہے۔ اردو میں صرف پہنچے اول ہے اور صرف یہی صورت قابل ذکر ہے۔ آصفیہ میں ”خطی“ لکھا ہوا ہے، یہ ٹھیک ہے، مگر اس کو عربی بتایا گیا ہے، یہ ٹھیک نہیں۔ اس صورت میں یہ ہند ہے۔ خفقان : اصلاً پہنچے اول و دوم ہے۔ آصفیہ میں اسی طرح لکھا گیا ہے۔ بول چال میں پسکون دوم بھی آتا ہے اور پیش تراسی طرح استعمال ہوتا ہے۔ البتہ نظم میں عموماً ہر تین استعمال کیا گیا ہے۔ اس لفظ کو دونوں طرح ماننا چاہیے، یہ صورت ”خفقانی“ کی ہے۔

خلجان : توڑ میں اس کو پہنچے اول و دوم ”لکھا گیا ہے، آصفیہ میں بھی صرف ”خلجان“ لکھا ہوا ہے، یہ اصل کے مطابق تو ہے، مگر اردو میں پلن کے

خلاف ہے۔ گفتگو میں یہ لفظ صرف بر سکون دوم آتا ہے، البتہ نظم میں صرف ہنست دوم ملتا ہے۔ اس صراحت کے ساتھ اس کی دونوں صورتوں کو صحیح مان لینا چاہیے۔

خلوت : اصلاً ہنست اول ہے۔ توڑ میں اسی رعایت سے لکھا گیا ہے کہ "بالفتح" صحیح، بالکسر غلط۔ مگر یہ فیصلہ غیر مناسب ہے۔ اردو میں بر کسر اول بھی استعمال ہوتا ہے، اور اس کو بھی صحیح مان لینا چاہیے۔ آصفیہ میں صرف "خلوت" ہے۔ اس میں دو قباحتیں ہیں، ایک تو یہ کہ مولف نے بر کسر اول کو عربی لکھا ہے، یہ صحیح نہیں، یہ ہندو صورت ہے۔ اور دوسرے یہ کہ صرف بر کسر اول لکھا ہے، جب کہ سماعت میں بر کسر اول اور ہنست اول دونوں طرح ہے۔

دجلہ : عربی میں وال مفتوح اور مکسور دونوں طرح ہے (منتخب اللفات)۔ اردو میں صرف ہنست اول مستعمل ہے۔ توڑ و آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔

درخشاں : فارسی میں ہنتم اول و دوم ہے۔ توڑ میں فارسی کے مطابق "ہنتم" اول و دوم "لکھا گیا ہے، مگر اردو میں اس طرح مستعمل نہیں۔ اردو میں عموماً ہنست اول و دوم (درخشاں) بولا جاتا ہے۔ یہی صورت "درخشندہ" اور "درخشندگی" کی ہے۔ آصفیہ میں "درخشاں" لکھا ہوا ہے۔ اردو کے لحاظ سے یہ بالکل درست ہے، مگر اس کو فارسی بتایا گیا ہے، یہ درست نہیں۔ یہ صراحت ضروری تھی کہ یہ اردو کا تصرف ہے، یعنی موجودہ صورت میں یہ ہند ہے۔

دفع : اصلاً ف ساکن ہے مگر اردو کے محاورے میں یہ عموماً ہنست ف آتا ہے، جیسے، دفع کرنا، دفع ہونا۔ اسی طرح "رفع دفع" میں بھی دونوں اجزائیں ف پر زبر آتا ہے، اور یہی صورت "وفع" کی ہے۔ یہ اردو کا تصرف ہے اور اس صورت کو بھی صحیح مان لینا چاہیے۔ تراکیب میں "دفع" بر سکون دوم ہی آتا ہے، جیسے،

دفع دخل مقدر۔ اسی طرح ”دفعشا“ میں حرف ثانی ساکن رہتا ہے۔ ”دفعہ“ کی جمع ”دفعات“ تو ہر سکون دوم ہی ہے۔ اصل لفظ ”دفعہ دار“ ہے، اس کا تلفظ ”دفعدار“ کیا جاتا ہے اور اردو کے لحاظ سے یہی صحیح ہے۔ اگر اسی طرح لکھا بھی جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا، بل کہ زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ بھی اردو کا تصرف ہوگا۔

ذنج : ہر لحاظ لغت بہ فتح اول و سکون دوم ہے، مگر بول چال میں بہ فتح دوم بھی آتا ہے، بل کہ عموماً اسی طرح بولا جاتا ہے۔ حرف اول کبھی مفتوح رہتا ہے اور کبھی مکسور ہو جاتا ہے۔ اس لفظ کی یہ تینوں صورتیں قابل قبول ہیں، یعنی، ذنج، ذنج، ذنج۔ ”ذنج“ اور ”ذبیحہ“ میں حرف اول ہمیشہ مفتوح رہتا ہے۔ ترکیب کی صورت میں اصل کے مطابق ہی استعمال کیا جاتا ہے، جیسے، ذنج عظیم۔

رجا : عربی میں بہ فتح اول ہے۔ اردو والے ہر کسر اول بولتے ہیں اور یہ تصرف ہے۔ لغت میں دونوں حرکات کا اندراج ضروری ہے، مگر مراحت کے ساتھ۔ رخشاں : فارسی لغات میں بہ فتح اول ہے۔ تور میں بھی اسی رعایت سے بہ فتح اول لکھا گیا ہے، مگر اردو میں ”رخشاں“ کوئی نہیں بولتا۔ سب لوگ ”رخشاں“ (بہ فتح اول) کہتے ہیں، اور اردو میں اب اسی صورت کو صحیح مانا جائے گا۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔

ردو قدح : لغت کے لحاظ سے ”قدح“ کی دال ساکن ہے (ردو قدح)، مگر اردو والے بہ فتح دال ”ردو قدح“ بولتے ہیں اور یہ اسی طرح اچھا معلوم ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں کو درج لغت ہونا چاہیے۔

رفع : اصلاً ہر سکون دوم ہے، مگر اردو میں زبانوں پر بہ فتح دوم ہے۔ رفع ہوا

رفع کرنا، رفع دفع، رفع دفع کرنا؛ ان سب میں ف پر ہمیشہ زبر آتا ہے؛ اور اردو کے لیے یہی صورت مرتج ہے۔ تراکیب میں البتہ اصل کے مطابق پسکون دوم رہتا ہے، جیسے، رفع مابہات، رفع شروغ وغیرہ۔

رفعت : یہ لحاظ لغت حرف اول مکسور ہے (رفعت) توڑ میں اسی رعایت سے یہ لکھا گیا ہے کہ، "بالکسر وفتح سوم۔" بالفم غلط ہے۔ مگر زبانوں پر فتح اول بھی ہے۔ اس لفظ کو دونوں طرح میم مانا چاہیے۔ آصفیہ میں بھی صرف بہ کسر اول لکھا ہوا ہے۔

رکاب : اصل بہ کسر اول ہے۔ توڑ و آصفیہ میں بھی بہ کسر اول لکھا گیا ہے، مگر اردو میں صرف بہ فتح اول مستقل ہے اور اب اسی طرح میم ہے۔ "رکاب وار" بھی بہ فتح اول مستقل ہے۔

رکابی : یہ بھی لغت کے لحاظ سے بہ کسر اول ہے، مگر اردو میں بہ فتح اول بولا جاتا ہے، اور اب یہی صورت مسیم ہے۔ "رکابی مذہب" میں بھی ر مفتوح رہتی ہے۔ توڑ میں اس کو بھی، اصل کے مطابق، صرف بہ کسر اول لکھا گیا ہے۔ آصفیہ میں ر پر زبر لگا ہوا ہے۔ اردو کے لحاظ سے یہ بالکل درست ہے، مگر اس کو فارسی بتایا گیا ہے، یہ درست نہیں۔ فارسی میں بہ کسر اول ہے اور بہ فتح اول اردو کا تصرف ہے۔

رمضان : توڑ و آصفیہ میں اس کو پ رفتین لکھا گیا ہے اور یہ اصل کے مطابق ہے، مگر زبانوں پر پسکون دوم ہے۔ مولف توڑ نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ، "عوام پسکون دوم و انظار زون بولتے ہیں، لیکن اس کے مرکبات یعنی رمضان اور رمضان خاں میں فحوا کی زبان پر بھی پسکون دوم ہے۔" آصفیہ میں "رمضانی" اور رمضان کے نمازی "کو بھی بہ فتح اول و دوم ہی لکھا گیا ہے۔ صاحب تہذیب

کا یہ لکھنا کہ ہر سکون دوم عوام بولتے ہیں، اب قابل قبول نہیں۔ اب عام و خاص سبھی ہر سکون دوم بولتے ہیں۔ نظم میں البتہ ہر فتح دوم آتا ہے۔ "رمضان" کو دونوں طرح (ہر فتح اول و دوم، اور ہر فتح اول و سکون دوم) صحیح ماننا چاہیے، اور "رضانی" اور "رمضان" بطور نام صرف ہر سکون دوم استعمال میں آتے ہیں۔

رمل : (ایک علم کا نام) اس معنی میں اصلاً ہر فتح اول و سکون دوم ہے، مگر زبانوں پر ہر فتح دوم ہے۔ "رمل" ایک بحر کا نام بھی ہے اور اس معنی میں یہ اصلاً ہر فتح اول و دوم ہے۔ اب اردو میں صورت یہ ہے کہ دونوں معانی میں یہ لفظ ہر فتح اول و دوم ہی استعمال ہے۔

رہن : اصل میں ہر فتح اول ہے۔ اردو والے عام طور پر ہر کسر اول بولتے ہیں اور اردو کے لحاظ سے یہی صورت مرتج ہے۔

زراعت : لغت میں ہر فتح اول، زبانوں پر ہر کسر اول ہے۔ دونوں حرکات قابل اندراج ہیں۔

زمام : اصلاً ہر کسر اول ہے، توڑ میں بھی اصل کی رعایت سے اس کو ہر کسر اول لکھا گیا ہے، مگر اردو میں زبانوں پر عموماً ہر فتح اول ہے، اور اردو میں یہی صورت مرتج ہے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔

سبققت : اصلاً ہر فتح اول و دوم ہے۔ اردو نظم میں اس طرح بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اور ہر سکون دوم بھی نظم کیا گیا ہے۔ زبانوں پر صرف ہر سکون دوم ہے۔ دونوں طرح درست ہے۔

سپرد : فارسی مصدر "سپردن" کی حرکات میں اچھا خاصا اختلاف ہے، چھتین ہیں۔ ہر کسر اول و فتح ثانی بھی ہے۔ ہر فتح اول و فتح ثانی بھی لکھا گیا ہے (دفعہ) تفصیل

کے لیے دیکھیے غیاث اللغات۔ "نوریں" سپرد کو کسر اول و ضم ثانی (سپرد) لکھا گیا ہے۔ آصفیہ میں بھی اسی طرح لکھا گیا ہے، مگر مؤلف نے قوسین میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ، "ہنرم اول زبان زد ہے"، اور یہ بالکل صحیح ہے۔ مختصر یہ کہ اس لفظ کو ہنرم اول و دوم اور کسر اول و ضم دوم دونوں طرح درست ماننا چاہیے۔

سرشک، فارسی میں کسر اول و دوم ہے (برہان قاطع)۔ اردو میں ہنرم اول و کسر دوم مستقل ہے، اور اردو میں اسی طرح صحیح ہے۔

سروذ، اصلاً ہنرم اول و دوم ہے، بمعنی "نغمہ و سماع"۔ اردو میں اس معنی میں بھی اور ایک قسم کے ساز کے معنی میں بھی، ہنرم اول و ہنرم دوم ہی استعمال کرتے ہیں۔ ہاں، واہجول رہتا ہے۔

سروش، اصلاً ہنرم اول و دوم۔ اردو میں زبانوں پر ہنرم اول و ہنرم دوم ہے۔ واہجول بھی مجہول ہے۔ آصفیہ میں اس پر پیش لگا ہوا ہے، البتہ "نوریں" ہنرم اول لکھا ہوا ہے، مگر یہ مراحت نہیں کی گئی کہ ہنرم اول اردو کا تصرف ہے۔

سطح، اصل میں ہنرم اول و سکون دوم ہے۔ اردو میں زبانوں پر ہنرم دوم بھی ہے۔ نظم میں البتہ اصل کے مطابق ہر سکون دوم ہی آتا ہے، اور یہ حالت ترکیب بھی اصل کے مطابق استعمال کیا جاتا ہے، جیسے: سطح گروں۔ اس تفصیل کے ساتھ اس کی دونوں صورتوں کو شامل لغت کرنا چاہیے۔

سطر، "سطح" کی طرح "سطر" بھی اصلاً ہر سکون دوم ہے۔ ترکیب میں اور نظم میں اسی طرح استعمال ہوا ہے اور ہوتا ہے، اور بول چال میں ط پر زبر آتا ہے۔ اس کی دونوں صورتیں قابل تسلیم ہیں، مگر مراحت کے ساتھ۔

سفال، فارسی میں حرف اول مضموم بھی ہے اور مکسور بھی، اردو میں کسر اول و مستقل ہے۔ آصفیہ میں اس پر پیش اور زیر دونوں حرکات لگی ہوئی ہیں،

”بِسْمِ اللّٰہِ“ البتہ نور میں صراحت کر دی گئی ہے کہ، ”اردو میں زبانوں پر کبیرہ
اول ہے“

سمت : اصلاً پہنچہ اول ہے، اردو والے زیادہ تر کبیرہ اول بولتے ہیں۔ دونوں
حرکات قابل تسلیم ہیں۔ آصفیہ میں اس کی حرکت کو ظاہر نہیں کیا گیا۔ نور میں
البتہ اصل حرکات کے ساتھ یہ صراحت ملتی ہے کہ، ”اردو میں بالکسری زبانوں
پر ہے“

شتر : اصل میں پہنچہ اول دوم ہے۔ نور و آصفیہ میں اسی طرح لکھا گیا ہے، بل کہ
دونوں مؤلفین نے صراحت کر دی ہے کہ پہنچہ دوم غلط ہے، مگر اردو میں زبانوں
پر پہنچہ دوم بھی ہے۔ اس لفظ کو دونوں طرح سمجھ ماننا چاہیے۔

شرح : بیان، اظہار، تفصیل و تشریح کے معانی میں اصلاً پہنچہ اول و کبریٰ
دوم ہے۔ اردو نظم میں اور تراکیب میں اسی طرح استعمال ہوتا ہے، مگر مفرد لفظ
گفتگو میں پہنچہ دوم ہی آتا ہے، اور یہ اردو کا تصرف ہے۔ صراحت کے ساتھ
دونوں صورتوں کو شامل لغت کرنا چاہیے۔ نرخ، قیمت، مول، بھاؤ کے
معانی میں اردو ہے اور ان معانی میں عموماً پہنچہ دوم آتا ہے۔

شطرینج : فارسی میں اس کو کبیرہ اول و فتح اول دونوں طرح لکھا گیا ہے۔ اسی وقت
سے نور و آصفیہ میں بھی دونوں حرکات کا ذکر کیا گیا ہے، مگر یہ نہیں بتایا گیا
کہ اردو میں کیا صولت ہے۔ اردو میں یہ صرف پہنچہ اول مستعمل ہے اور
بھی مرتفع ہے۔

شعبہ : عربی میں پہنچہ اول و سوم و چہارم ہے۔ کفات میں اس طرح بھی لکھا
گیا ہے۔ مگر اردو والے اس طرح نہیں بولتے۔ اردو میں اس کو پہنچہ اول
استعمال کیا جاتا ہے اور ب ساکن رہتی ہے۔ ضرورتاً ب مفتوح ہو سکتی

ہے، مگر ش پریش ہی رہتا ہے۔ نور و آصفیہ میں بہنم شین بھی لکھا گیا ہے۔
 شعور : اصلاً بہنم اول ہے، نور میں بھی اسی طرح لکھا گیا ہے، مگر استعمالِ عام
 میں بہنم اول ہے۔ آصفیہ میں بھی بہنم اول ہے۔

شکوہ : شان و شوکت، رعب و اب (وغیرہ) کے معانی میں اصلاً بہنم اول و دوم
 ہے اور کسر اول کے معنی ہیں "ترس و بیم"۔ اردو میں یہ امتیاز باقی نہیں
 رہا۔ یہاں بہ شان و شوکت (وغیرہ) کے معانی میں عموماً کسر اول مستعمل ہے۔

شکیب : فارسی میں حرف اول و دوم مکسور ہے۔ نور میں بھی اس کو اسی طرح لکھا گیا ہے
 اور آصفیہ میں بھی ش پر زیر لگا ہوا ہے، مگر اردو میں کسر اول شاید ہی کوئی بولتا
 ہو۔ عموماً بہنم اول بولا جاتا ہے اور اسی طرح مروج ہے۔ یہی صورت "شکیب" کی ہے۔
 شمشاد : فارسی میں ش پر زیر بھی ہے اور زیر بھی۔ اردو میں صرف بہنم اول مستعمل
 ہے۔ آصفیہ میں ش پر زیر بھی لگا ہوا ہے اور زیر بھی (شمشاد)، یہ فارسی
 کی تقلیدِ محض ہے۔

شمع : عربی میں سوم کے معنی میں بہنم اول و دوم (شمع) تھا (مختب اللغات)۔
 بعد کو "سوم بن" کے سن میں ہسکون دوم رائج ہو گیا، اور اس صورت کو "مولد"
 کہا گیا ہے۔ اب صورت یہ ہے کہ ترکیب میں اور نظم میں ہسکون دوم ہی آتا ہے،
 مگر مفرد لفظ زبانوں پر بہنم اول و دوم ہے۔ اسی طرح "شمع دان" میں بھی
 تم مفتوح رہتا ہے۔

صدقہ : بر لحاظِ اصل بہنم اول و دوم و سوم ہے۔ اردو میں بہنم اول و سکون
 دوم مستعمل ہے۔

صلح : اصلاً بہنم اول و سکون دوم ہے۔ اردو میں نظم اور ترکیب میں تو اسی طرح
 آتا ہے اور بول چال میں بہنم اول و نہنم دوم آتا ہے۔ دونوں صورتیں قابلِ تسلیم ہیں۔

اصندوق : عربی میں بہنیم اول تھا، فارسی میں بہنچہ اول ہوا، اور اردو میں صرف بہنچہ اول مستعمل ہے۔ آصفیہ میں ص پر زبر اور پیش دونوں حرکات ملتی ہیں (اصندوق)۔ ص کے پیش کو عربی سے مخصوص سمجھنا چاہیے۔

صومعہ : اصلاً بہنچہ اول و سوم ہے۔ اردو میں زبانوں پر بہنچہ اول و کسیر سوم بھی ہے۔ دونوں طرح صحیح ماننا چاہیے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔

طہغرل : اصل میں بہنیم اول و کسیر سوم ہے (طہغرل)۔ اردو میں اسے بہنیم اول و فتح دوم استعمال کرتے ہیں اور یہی مرجح ہے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں، اور تور میں اس کو اصل کے مطابق کسیر سوم ہی درج کیا گیا ہے۔

طمطراق : اصلاً بہنیم اول و سوم ہے۔ تور و آصفیہ میں بھی اسی طرح ملتا ہے۔ بول چال میں بہنچہ اول و سوم بھی آتا ہے اور یہ صورت بھی قابل تسلیم ہے۔

طہبارت : اصلاً بہنچہ اول ہے۔ زبانوں پر کسیر اول بھی ہے، اور یہ صورت بھی قابل تسلیم ہے۔ آصفیہ میں اس کے اعراب کی نشان دہی نہیں کی گئی اور تور میں صرف بہنچہ اول ملتا ہے۔

ظرافت : یہی صورت اس لفظ کی بھی ہے کہ اصلاً بہنچہ اول ہے اور زبانوں پر کسیر اول بھی ہے۔ اس کو بھی دونوں طرح صحیح ماننا چاہیے۔

عجلمت : عربی میں کسیر اول ہے۔ آصفیہ میں بھی عربی کے مطابق ع پر زیر لگا ہوا ہے۔ اردو میں اس طرح قطعاً مستعمل نہیں، اردو والے بہنیم اول استعمال کرتے ہیں۔ اور اردو میں اسی طرح صحیح ماننا چاہیے۔ تور میں یہ راحت موجود ہے۔

عرفہ : اصلاً بہنچہ اول و دوم ہے۔ اردو میں صرف بہنچہ اول و سکون دوم مستعمل ہے۔ **عروس :** یہ لفظ اصل ع پر زبر ہے۔ آصفیہ میں یہ لفظ حرکات کی مراحت کے بغیر لکھا گیا ہے۔ تور میں یہ مراحت کی گئی ہے کہ بہنچہ اول صحیح اور بہنیم اول غلط

ہے۔ اردو میں زبانوں پر بہتم اول بھی ہے، بل کہ اکثر لوگ اسی طرح بولتے ہیں۔ اس لفظ کو دونوں طرح سمجھ ماننا چاہیے۔

عروض : عروض کی طرح "عروض" بھی زبانوں پر بہتم اول ہے، اور یہ صورت بھی قابل تسلیم ہے۔

عطار د : اصلاً بہتم اول و کسر چہارم (عطار د) ہے۔ بول چال میں بہتم چہارم آتا ہے۔ یہ صورت بھی قابل تسلیم ہے۔

علاوہ : آصفیہ میں کسر اول ہے۔ یہ اصل کے مطابق ہے، مگر اردو والے صرف بہتم اول استعمال کرتے ہیں، اور اردو میں اسی طرح سمجھ مانا جائے گا۔

عملہ : آصفیہ میں بہتم اول و دوم ہے۔ یہ عربی کے مطابق ہے، مگر اردو میں ہکون دوم مستقل ہے، اور یہی صورت مرتج ہے۔

عنایت : عربی میں ع مکسور بھی ہے اور مفتوح بھی۔ اردو میں صرف کسر اول ہے۔

عند لیب : اصلاً بہتم اول ہے۔ نور و آصفیہ میں بھی اسی طرح ہے۔ زبانوں پر کسر اول بھی ہے۔ دونوں حرکات قابل قبول ہیں۔

عنوان : عربی میں کسر اول و بہتم اول دونوں طرح ہے (مستحب اللغات)۔ آصفیہ میں عربی کی رعایت سے ع پر زیر بھی لگایا گیا ہے اور پیش بھی۔ اُند میں صرف بہتم اول مستقل ہے۔

عذر : اصل میں بہتم اول و کون دوم ہے۔ نور و آصفیہ میں بھی اسی طرح ہے۔ مگر اردو میں کیا خواص کیا عوام، کئی عذر کہتے ہیں، "عذر کوئی نہیں کہتا یہاں نظم سے بحث نہیں۔"

غلاف : لغت میں بحیر اول ہے۔ زبانوں پر بہتم اول بھی ہے۔ دونوں حرکات قابل قبول ہیں۔

غیاث : اصل میں ع مکسور ہے۔ زبانوں پر عموماً بہتم اول ہے۔ دونوں صورتیں

درست مانی جائیں گی۔

فتح : اصلاً ساکن ہے۔ نظم اور فارسی تراکیب میں اسی طرح مستقل ہے۔
البتہ بول چال میں ہنسیچہ دوم آتا ہے اور اس حد تک یہ صورت بھی قابل تسلیم ہے۔
قراواں : فارسی میں کسر اول ہے۔ اردو لغات میں بھی اسی طرح ہے۔ زبانوں پر
ہنسیچہ اول بھی ہے اور پیش تر اسی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ یہی صورت
”فرادانی“ کی ہے، مگر یہ بھی عموماً ہنسیچہ اول مستقل ہے۔

فروزاں : فارسی میں ہنسیچہ اول و دوم ہے۔ اردو والے ہنسیچہ اول استعمال کرتے
ہیں۔ یہی صورت ”فروز“ کی ہے، جیسے، دل فروز۔

فروغ : اصلاً ہنسیچہ اول و دوم۔ اردو میں زبانوں پر عموماً ہنسیچہ اول ہے۔
دونوں حرکات قابل تسلیم ہیں۔

فریدیوں : اردو میں صرف ہنسیچہ اول ہے۔

قوارہ : آصفیہ دو نور دونوں میں ف پر زبر ہے، مگر زبانوں پر ہنسیچہ اول ہے۔
دونوں صورتیں قابل قبول ہیں۔

قبول : نور و آصفیہ دونوں میں ہنسیچہ اول ہے، یہ اصل کے مطابق ہے، مگر
بول چال میں عموماً ہنسیچہ اول آتا ہے۔ یہی صورت ”قبولیت“ کی ہے۔

قداست : اصلاً ق مفتوح ہے۔ گفتگو میں کسر اول بھی آتا ہے۔

قزلباش : اصل میں کسر تین ہے (قزلباش)۔ نور و آصفیہ میں بھی اسی طرح۔
اردو والے ہنسیچہ اول و کسر دوم استعمال کرتے ہیں اور اردو میں یہی صورت
منج مانی جائے گی۔

قطامہ : لغت میں ہنسیچہ اول ہے۔ اردو میں زبانوں پر ہنسیچہ اول بھی ہے۔

قطرہ : اصلاً کسر اول ہے۔ زیادہ تر ہنسیچہ اول مستقل ہے۔ دونوں

حرکات قابل قبول ہیں۔

قنبریل : اصل میں ق پر کسوا ہے۔ اردو والے عموماً پستہ اول استعمال کرتے ہیں۔
کفنی : اصلاً مفتوح ہے۔ اردو میں شعرانے اسی طرح باندھا ہے، مگر
زبانوں پر ہسکون دوم ہے۔

گرفت : آصفیہ میں کسر اول و دوم ہے۔ یہ فارسی کے مطابق ہے۔ اردو میں
پستہ دوم بھی مستقل ہے اور یہ حرکت بھی قابل قبول ہے۔ ”گرفتار“ عام طور پر
پستہ دوم ہی بولا جاتا ہے، یہی صورت ”گرفتاری“ کی ہے۔

گمرہ : اصلاً کسر اول و دوم ہے، اردو میں کسر اول و پستہ دوم مستقل ہے۔
گزاف : اردو میں پستہ اول بولا جاتا ہے۔ فارسی میں حرف اول محسوس بھی ہے
اور مضموم بھی۔

لا محالہ : یہ لحاظ لغت تیم مفتوح ہے، مگر اردو میں زبانوں پر پستہ تیم ہے۔
لغایت : اصلاً ”لغایتہ“ تھا (کسر اول)، اردو میں ”لغایت“ بن گیا، پستہ
اول۔

محبت : اصلاً پستہ اول ہے۔ تذر و آصفیہ میں بھی اسی طرح ہے۔ اس طرح
استعمال میں بھی آتا ہے، مگر اصلاً اس کی ایک یہ صورت بھی ہے کہ مضموم
ہو جاتا ہے۔ اس صورت کو بھی مان لینا چاہیے۔

محلہ : اصل میں پستہ اول ہے، مگر اردو میں زبانوں پر عموماً پستہ اول ہے۔ دونوں
حرکات قابل اندراج لغت ہیں۔

مراعات : لغت میں پستہ اول ہے، لیکن اردو میں زبانوں پر عموماً پستہ اول ہے۔
مرجان : اصلاً پستہ اول ہے۔ زبانوں پر کسر اول بھی ہے۔ دونوں حرکات
قابل قبول ہیں۔

مزبور : فارسی میں ہجتم اول ہے ۔ اردو میں صرف ہجتم اول ہے ۔ اصل لفظ "مزبور" ہجتم اول ہی متعلق ہے ۔

مزبورہ : فارسی میں حرف اول مضموم بھی ہے اور مکسور بھی ۔ اردو میں صرف ہجتم اول مستقل ہے ۔

مزگان : یہ بھی اصلاً کسر اول و ہجتم اول دونوں طرح ہے ۔ اسی رعایت کے آصفیہ میں تم پر ہمیش بھی لگا ہوا ہے اور زیر بھی (مزگان) ۔ مگر اردو میں صرف کسر اول و سکون دوم مستقل ہے ۔

مسترت : "مسترت" کی طرح یہ بھی ہجتم اول گفتگو میں آتا رہتا ہے ۔ اصلاً ہجتم اول ہے ۔ دونوں طرح صحیح مان لینا چاہیے ۔

مشک : (پانی بھرنے کی کھال) ۔ اصلاً ہجتم اول و سکون دوم ہے ۔ نظم میں اسی طرح آتا ہے ، مگر بول چال میں ہجتم اول و دوم ہے ، اور یہ صورت بھی قابل تسلیم ہے ۔

مصالحات : زبانوں پر عموماً کسر لام ہے ، جب کہ اصلاً ہجتم لام ہے ۔ دونوں طرح قابل قبول ہے ۔

معابہہ : اصلاً ہجتم اول پر زیر ہے ، اردو والے عموماً کسر ہجتم اول بولتے ہیں ۔

معائنہ : اصلاً "مُعَافِئَہ" تھا ۔ اردو میں "معائنہ" (کسر ہمزہ) ہے ۔

مقناطیس : آصفیہ میں کسر اول ہے اور تودہ میں ہجتم اول ۔ اردو میں صرف ہجتم اول مستقل ہے ۔

ملکہ : (مہارت ، قوت جو علم و ہنر سے انسان کو حاصل ہوتی ہے) عربی میں ہجتم اول و دوم ہے ۔ اردو والے ہجتم اول و سکون دوم بولتے ہیں ۔

ملکہ : (جیسے ملکہ معقلہ) اس معنی میں اصلاً آل پر زیر ہے ۔ زبانوں پر عموماً

پسکون لام آتا ہے۔ دونوں طرح درست ہے۔

منع : اصلاً پستہ اول و سکون دوم ہے۔ بول چال میں پستہ اول و دوم ہے اور اس صورت میں بھی یہیم و سیم ہے۔ تراکیب میں اور نظم میں پسکون دوم ہی آتا ہے۔ مولوی : اصلاً لام پر زبر ہے۔ بول چال میں لام ساکن ہو جاتا ہے۔ دونوں صورتیں گفت کے لیے قابل قبول ہیں۔

مہار : اصلاً پکسر تیم مرغ ہے، مگر اردو والے پرمیم بولتے ہیں۔ مہارت : اصلاً آم پر زبر ہے، بول چال میں اکثر پرمیم سنیے میں آتا ہے۔ دونوں حرکات قابل قبول ہیں۔

مہوس : آصفیہ میں واو پر زبر لگا ہوا ہے۔ ”مہوسی“ میں بھی واو پر زبر لگایا گیا ہے، مگر بولا جاتا ہے پکسر واو اور اسی طرح لکھنا چاہیے۔

مہیب : تدریس میں لکھا ہے، ”پستہ اول میم و پرمیم اول غلط“۔ لغت کے لحاظ سے یہ ٹھیک ہے، مگر اردو میں استعمالاً یہ پرمیم ہی متعل ہے، پستہ تیم شاید ہی کوئی بولے ہو۔

ناگوار : آصفیہ میں گوار کے گ پریش لگا ہوا ہے، یہ فارسی کی تقلید ہے۔ اردو میں گاف مفتوح رہتا ہے۔ تدریس میں حرکات کی مراحت نہیں کی گئی۔

نخواست : لغت میں پستہ اول ہے۔ زبانوں پر پکسر اول بھی ہے۔ دونوں حرکات قابل تسلیم ہیں۔

نخواست : اصلاً پرمیم اول ہے۔ زبانوں پر عموماً پستہ اول ہے، اور یہ مرغ صورت ہے۔ نخوت : لغات میں پکسر اول، اور زبانوں پر پستہ اول ہے، یہی صورت مرغ ہے۔

ندامت : اصل میں پستہ اول ہے، بول چال میں پکسر اول بھی آتا ہے۔ دونوں حرکات قابل قبول ہیں۔

نزاکت : یہ فارسی نثر اور لفظ پنجم اول ہے ، بول چال میں کسرا اول بھی آتا ہے ۔
دونوں طرح ٹھیک ہے ۔

نسرہیں : ”ہالفتہم وبالکسر دونوں طرح صحیح ہے“ (نور) ، مگر اردو میں صرف پنجم اول مستعمل ہے ، اور اردو میں اسی طرح صحیح ہے ۔

نشاط : لغات میں پنجم اول ہے ۔ بول چال میں کسرا اول بھی آتا ہے ۔ دونوں طرح درست مان لینا چاہیے ۔

نشان : نور میں ہے ، ”کسرا اول وغیرہ پنجم“ اردو میں صرف کسرا اول ہے ۔ یہی صورت ”نشانی“ اور ”نشاء“ کی ہے ۔

نشوونما : اصلاً ثانی پر زبر ہے (نشوونما) ۔ نور میں مراحت بھی کی گئی ہے کہ ”نما پنجم اول غلطی سے بول چال میں ہے“ ۔ حالانکہ سبھی ”نشوونما“ (پنجم ثانی) ثانی) کہتے ہیں ۔ اردو میں ہنجم ثانی ہی مریض ہے ۔

نشیب : نور میں ہے ، ”کسرا اول و دوم صحیح ، و ہنجم اول و کسرا دوم غلط“ ۔
پھر یہ بھی لکھا ہے کہ : ”زبانوں پر کسرا اول و ہنجم دوم ہی ہے“
اور یہی مریض صورت ہے ۔

نشیمین : فارسی میں کسرا اول و دوم ہے ، اردو میں پنجم اول بولتے ہیں ، اور اردو کے لیے یہی صورت ٹھیک ہے ۔

نفاذ : اصلاً ہنجم اول ، بول چال میں کسرا اول بھی آتا ہے ۔ دونوں صورتیں قابل قبول ہیں ۔

نفری : (روزانہ مزدوری ، اجرت وغیرہ) ”آصفیہ میں“ ”نفری“ ہے ہنجمین ۔ نور میں ”نفری“ ہے اور اب اسی طرح صحیح ہے ۔

نفری : اصلاً کسرا اول ہے ، اردو والے صرف پنجم اول بولتے ہیں اور اردو میں اسی طرح

صحیح ہے۔

نفع : اصل میں ف ساکن ہے۔ اردو میں فارسی ترکیب کے ساتھ انظلم میں اسی طرح آتا ہے، مگر گفتگو میں عموماً چشم دوم آتا ہے۔ "نفع نقصان" میں بھی ف پر زبر رہتا ہے۔ دونوں صورتیں قابل قبول ہیں، مگر مراحت کے ساتھ۔
نفعہ : اصلاً چشم اول و دوم، مستعمل چشم اول و سکون دوم، اور یہی صورت مرغ ہے۔

لقب : لغات میں چشم اول و سکون دوم ہے۔ بول چال میں یہ چشم دوم آتا ہے۔ دونوں طرح درست ماننا چاہیے۔

نگراں : اصلاً کسر اول و چشم دوم ہے۔ قرآن میں بھی اسی طرح۔ یہی صورت "نگران" کی ہے۔ نظم میں یہ لفظ اسی طرح آئے ہیں، مگر ذبانوں پر سکون دوم ہیں۔ دونوں صورتوں کو ماننا چاہیے۔

نمرود : اصلاً چشم اول ہے۔ قرآن میں مراحت بھی کی گئی ہے، "بالفتح غلط، بالضم صحیح"۔ مگر اردو میں چشم اول شاید ہی بولتا ہو، سبھی چشم اول کہتے ہیں، اور اسی صورت کو مرغ ماننا چاہیے۔

نمود : اصلاً چشم اول، ذبانوں پر چشم اول ہے۔ یہی صورت "نمود" کی ہے، کہ یہ بھی اردو میں چشم اول مستعمل ہے۔

نوالہ : آصفیہ میں ن پر زبر لگا ہوا ہے (نوالہ) اور یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ "مشہور کسر اول"۔ یہاں فارسی سے بحث نہیں، اردو میں یہ لفظ صرف کسر اول ہے۔ اور صرف اسی طرح ماننا چاہیے۔

نوشٹ : فارسی میں "نوشتن" کی حرکات میں اختلاف ہے۔ قرآن میں "نوشٹ" کے ذیل میں لکھا گیا ہے کہ، "چشم اول و دوم چیز چشم اول و کسر دوم"۔ اس سے

یہ متبادر ہوتا ہے کہ اردو میں یہ لفظ ان دو مختلف حرکات کے ساتھ مستعمل فارسی میں جو بھی صورت ہو، اردو میں نوشت، نوشتہ، نوشتن، سب صرف ہفتہ اول و کسر دوم مستعمل ہیں اور اردو میں اسی طرح صحیح مانے جائیں گے۔ آصفیہ میں ”نوشتہ“ ہے، اور ٹھیک ہے، اسی طرح ”نوشت“ کو بھی ایک ہی طرح لکھا گیا ہے۔

نوید : فارسی میں اس کو ”ہضم نون و کسر واو ویای مہول“ بھی بتایا گیا ہے اور ”ہضم نون ویای مہول“ بھی کہا گیا ہے۔ اردو میں عموماً ہفتہ اول و کسر دوم مستعمل ہے۔ آصفیہ و نور میں بھی اسی طرح لکھا گیا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ نور میں اس کو صرف ”بیایہ مہول“ لکھا گیا ہے اور آصفیہ میں لکھا گیا ہے کہ ”بی مہول“ بھی ہے اور معروف بھی۔ نسخے میں عموماً بیایہ مہول آتا ہے۔

نہنگ : (گھڑیال) فارسی میں حرف اول مفتوح ہے۔ اردو والے عموماً کسر اول بولتے ہیں۔

واردات : آر پر زیر ہے۔ خیال رکھنے کی بات یہ ہے کہ گفتگو میں یہ سکون آتا ہے، اور اس صورت کو بھی صحیح سمجھنا چاہیے۔

واسطہ : اصل اس پر زیر ہے۔ نور میں مراحت کی گئی ہے کہ ”بکسر سوم و فتح چہارم“ زبانوں پر سکون سین ہے۔ ”واسطہ“ کوئی نہیں بولتا۔ اس مراحت کے ساتھ ”بکسر سوم کو بھی درست مان لینا چاہیے۔ اس طرح کے بہت سے لفظ ہیں، جن میں حرف سوم ساکن ہو جاتا ہے، اور یہ ایک لسانی رجحان ہے، اس لیے ایسے سبھی الفاظ کی اس صورت کو بھی مان لینا چاہیے۔

وداع : نور میں مراحت کی گئی ہے کہ، ”بکسر اول غلط و ہفتہ اول صحیح“ عربی کے لحاظ سے یہ قول ضرور درست ہے، مگر اردو میں اکثر لوگ بکسر اول

ہی برتے ہیں۔ غیاث اللغات میں مراحت کی گئی ہے کہ، ”پکسر خواندن“ نوے
از تفریس باشد۔ پکسر اول کو بھی صحیح ماننا چاہیے۔

ورع : یہ اصلاً پنتیم اول و سکون دوم بھی ہے اور پنتیم بھی (منتخب اللغات)۔
اردو میں اکثر صنفے میں پنتیم آتا ہے، ضرورتِ شعری سے یہاں بحث نہیں۔
وضع : نظم اور تراکیب اضافی و عطفی کے علاوہ، یہ لفظ عموماً پنتیم اول و دوم استعمال
کیا جاتا ہے۔ ”وضع دار“ اور ”وضع واری“ میں بھی (بول چال میں) حق مفتوح
رہتا ہے۔ اس مراحت کے ساتھ، اس صورت کو بھی صحیح ماننا چاہیے اور وزنِج
لغت کرنا چاہیے۔

وقار : عربی میں حرفِ اول مفتوح ہے۔ فارسی میں پکسر اول بھی کہا گیا ہے۔ اردو
میں بھی دونوں طرح مستعمل ہے۔ آصفیہ میں صرف پنتیم اول ہے۔

ہزیان : سدری میں ”ہزیان“ ہے، پنتیم اول و دوم، مگر اردو والے
پکسون دوم استعمال میں لاتے ہیں۔ فارسی میں پکسون دوم بھی استعمال کیا گیا
ہے (پہاڑی علم) اور اردو میں بھی مفرس صورت قابلِ قبول ہے۔ بنظم میں کہیں
آپا ہو تو اس سے بحث نہیں، لغت میں اس کی مراحت کی جائے گی۔ صاحب
نور اللغات کے لکھنے کے مطابق، اردو میں پکسر اول ہے۔ لغت میں
اس کی بھی نشان دہی کی جانا چاہیے۔

ہزل : نور و آصفیہ دونوں میں صرف پنتیم اول و سکون دوم ہے۔ یہ اصل کے مطابق
ہے، مگر اردو میں زبانوں پر پنتیم ہے۔ یہ صورت بھی قابلِ قبول ہے۔
ہلاکو : اصلاً پنتیم اول ہے۔ اردو میں صرف پنتیم اول ہے اور یہی صورت
قابلِ قبول ہے۔

یثرپ : اصلاً پنتیم اول و پکسر سوم ہے۔ نور و آصفیہ میں اسی طرح ملتا ہے،

مگر زبانوں پر ہنسیچ اول و سوم ہے ، اور یہ بھی قابل قبول بل کہ مرتج سورس ہے۔
 یورش ، اصلاً ہنسیچ اول و سوم ہے ، اور داو غیر ملفوظ ہے ۔ اردو میں یہ دو
 طرح مستعمل ہے ، (۱) ہنسیچ اول و کسیر سوم دواو غیر ملفوظ (بروزن خورش)۔
 نور میں اس کا ذکر کیا گیا ہے ۔ (۲) ہنسیچ اول و کسیر سوم مع دواو ملفوظ معروف ،
 گفتگو میں عموماً اسی طرح آتا ہے ۔ لغت میں ان تفصیلات کے ساتھ ان سب
 صورتوں کا ذکر کیا جائے گا +

ملائی — بالائی

مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات کے مقدمے میں ایک جگہ لکھا ہے :

” ہر زبان کے فصحا کا قاعدہ ہے کہ اپنی زبان میں تعزقات لطیف سے ایسا ذکر کے لئے الفاظ اور اصطلاحیں پیدا کرتے ہیں۔ ہماری اُردو بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہیں رہی۔ (آب حیات، مفید عام پریس لاہور، سال طبع ۱۸۹۹ء، ص ۳۹)

اس ضمن میں انھوں نے مثلاً جملہ لکھے ہیں، ”آن میں بالائی“ بھی ہے۔ ”آن کے گلے کے مطابق“ یہ لفظ قرآنِ مبارک علی خاں کی ایجاد ہے۔ ”آن کی عبارت یہ ہے :

”لو اب عبارت ملی: ان مرحوم نے ملائی کا نام بالائی رکھا، کہ کھٹو میں نام اوردنی وغیرہ میں کم رائج ہے۔ مذاقِ سلیم دونوں کے لطف میں امتیاز کر سکتا ہے“

(ایضاً ص ۳۵)

مولوی سید احمد دہلوی متوفی فرہنگِ آصفیہ نے بھی یہی بات لکھی ہے عبارت کہے دینی

لے مسندِ لطیف، ۱۱ جنوری ۱۳۹۸ء۔ وفات: ۱۰ جولائی ۱۳۱۳ء (مفتاح التواریخ)۔

۱۱ حوقی ۱۱، مئی ۱۹۱۸ء (تجددِ مسافر وچند) ح۲۔ مرحوم کی ایک تصنیف، رسومِ دہلی کے پاکستانی اڈیشن کا مجدد سید یوسف بخاری دہلوی نے لکھا ہے ۱۰ اس میں مرحوم کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ تاریخِ وفات اس میں بھی ہے۔

ہے کہ آزاد کا مندرجہ بالا قول ہی اُن کی تحسیر کی بنیاد ہے :

”نواب سعادت علی خاں مرحوم نے ملائی کا نام بالائی رکھا تھا چنانچہ یہ لفظ کھٹو میں عام اور دہلی میں کم رائج ہے۔ مذاقِ سلیم دونوں میں امتیاز کر سکتا ہے۔“ (فرنگِ آصفیہ، جلد چہارم، ص ۴۰۰)

اس کے بعد جملہ لغات مرتب ہوئے اُن میں عموماً اسی کی تقلید کی گئی اور نواب سعادت علی خاں سے اس لفظ کی ایجاد کو منسوب کیا گیا، جیسے : قورالغبات، فرنگِ اثر، مہذب اللغات ! اس کے برخلاف، مولانا عبدالحلیم شرر کھٹوی نے اپنی معروف تصنیف گذشتہ کھٹو میں لفظ ”بالائی“ کا موجد نواب آصف الدولہ کو بتایا ہے۔ مولانا نے ”بالائی“ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

”اس کو پرانی زبان میں ملائی کہتے ہیں۔ آصف الدولہ بہادر نواب اور وہ کو یہ اس قدر پسند تھی کہ خاص اہتمام سے ان کے لیے تیار کی جاتی تھی۔ انھوں نے اس کا نام ملائی کے عوض بالائی رکھ دیا، اس لیے کہ یہ دودھ کے اوپر کی چیز ہے۔“

(گذشتہ کھٹو، شائع کردہ مکتبہ جامعہ دہلی ص ۲۹۴)

فی الوقت یہ کہنا مشکل ہے کہ اس لفظ کی ایجاد کے سلسلے میں کون سا قول مرخ ہے۔

یہ ہر صورت ابن تہریمات سے پہلے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ ”بالائی“ کھٹو میں، نواب آصف الدولہ یا نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں معرض وجود میں آیا تھا۔

۱۔ متون، ۱۰، اجزائی الآثار ۱۳۳۵ھ (۱۹۲۶ء) (یا وایام : تالیف مولوی عبدالرزاق کاپورہا ص ۳۴)

۲۔ مسند نشینی : ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶،

فرہنگ جہانگیری، فارسی کا معروف لغت ہے، جس کا سال تکمیل ۱۰۱۷ھ (۱۶۰۸ء) ہے، "مقدمہ فرہنگ جہانگیری"، یہ لغت مطبع فرہند کھنویں "بہ نصیب و تحقیق مولانا سید محمد صادق علی غالب کھنوی" چھپا تھا، اس لغت میں لفظ "چربک" کے ذیل میں، اس کے ہندی مراد کی حیثیت سے "ملانی" اور "بالائی" دونوں لفظ موجود ہیں :

"چربک، بالاول مفتوح... بہ معنی داور.... سوم سر شیر بود، و آنرا چربہ نیز گویند، و بہ ترکی قیاس، وہ ہندی ملانی و بالائی نامند۔"

میں کچھ دنوں تک سخت الجھن میں رہا کہ لفظ "بالائی" جب فرہنگ جہانگیری میں موجود ہے جس کی تہذیب کا کام عہدِ آئین شروع ہوا تھا اور یکسٹل عہدِ جہانگیری میں ہوئی، اس صورت میں یہ کہا کیوں کر درست ہوگا کہ یہ لفظ عہدِ آصفیہ القدر میں یا اس کے بعد عالم وجود میں آیا۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ فرہنگ جہانگیری کی عبارت میں فارسی لفظ "چربک" کے مراد کی حیثیت سے اصل صورت "ملانی" تھا، اور "بالائی" کا لفظ بعد میں کسی نے بڑھایا ہے، اور غالباً یہ مطبع کے کسی فرد کی کارگزاری ہے۔

فرہنگ جہانگیری کے جن شعلی نسخوں تک میری رسائی ہو سکی، وہ سب لفظ "بالائی" سے خالی ہیں۔ محمدوی قاضی عبدالودود صاحب نے مطلع فرمایا کہ خدا بخش خاں لاہوری (پٹنہ) کے شعلی نسخوں میں اس عبارت میں صرف "ملانی" کا لفظ ہے۔ جزی مولانا استیاز علی خاں

بالائی، بجائے ملانی ؟ [تفصیل، ص ۱۲۶]

اگرچہ صراحت نہیں مگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ تادریکِ رائے میں، ملانی کی جگہ بالائی، عہدِ غازی الصریح حیدر کی ایجاد ہے۔

یہ غالب خیال ہے کہ فرہنگ جہانگیری صرف اسی مطبع میں چھپا ہے۔ میں نے متعدد حضرات سے دریافت کیا، مگر کسی دوسرے مطبع کے چھپے ہوئے نسخہ حال معلوم نہیں ہوا۔

عرشی کے مکتوب سے معلوم ہوا کہ رضا لانجہوی درام پور میں اس فرہنگ کے تین غلطی لکھے ہیں جن میں سے ایک نسخے پر عہد عالمگیری کی مہریں ثبت ہیں؛ ان نسخوں میں بھی، اس عبارت میں "بالائی" موجود نہیں، صرف "ملائی" ہے۔ فرہنگ مذکور کا ایک نسخہ راقم الحروف کے پاس ہے، جس پر سبز کتابت ۱۱۰۳ھ لکھا ہوا ہے، اس کی بھی یہی صورت ہے۔ جامعہ تیس دہلی کے کتاب خانے میں اس کا ایک غلطی نسخہ موجود ہے، جس کے اول و آخر کے چند اوراق غائب ہیں، لیکن غاصب پڑانا معلوم ہوتا ہے، اس کی بھی یہی کیفیت ہے۔ ان سب نسخوں میں آخری جملہ اس طرح ہے: "وہ ہندی ملائی نامند۔"

اس صورت میں یہ خیال کرنا کچھ بے جا نہیں معلوم ہوتا کہ لفظ "بالائی" کا اضافہ بعد کو کیا گیا ہے۔ قطعی طور پر تو نہیں کہا جاسکتا، مگر خیال یہی ہے کہ یہ اضافہ اہل مطبع میں سے کسی نے کیا ہو گا، وہ کاتب صاحب ہوں یا تصحیح کرنے والے بزرگ ہوں۔ عرشی صاحب نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے: جہاں انگریز کے مطبوعہ نسخے میں بالائی، بعد کی اصلاح ہے، جہاں انیسویں کتابت کی ہے، "مکتوب بہ نام راقم الحروف"۔

دوسرے قرائن بھی اس پر دلالت کرتے ہیں کہ فرہنگ مذکور میں اصل "بالائی" کا لفظ نہیں تھا۔ مثلاً: فرہنگ رشیدی کا ایک اہم ماخذ فرہنگ جہاںگیری ہے۔ رشیدی میں بہت سے مقامات پر جہاںگیری کی عبارتوں کو کچھ ترتیب کے ساتھ شامل کر لیا گیا ہے۔ لفظ "جربک" کے

لے موافق نے دیا ہے میں خود صراحت کی ہے کہ یہ لغت فرہنگ جہاںگیری اور فرہنگ سروری کے مندرجات کا مجموعہ ہے، ترتیبات و تصحیحات کے ساتھ۔ موافق کی عبارت یہ ہے:

"ہوں فرہنگ جہاںگیری و فرہنگ سروری مطالعہ افتاد، جامع ترین فرہنگہا دو، اما مشتق لہذا ہر اے چند کہ احراز واجتہاد از ان لازم و مستمرد و یہ..... بنا بریں مقدمات، و در جمع لغات ان دو کتاب و حد مشہد

سطے میں بھی جہانگیری کی طویل عبارت کو معمولی ترسیم کے ساتھ نقل کر لیا گیا ہے، اور زیر بحث جملہ رشیدی میں اسی طرح ہے جس طرح جہانگیری کے مذکورہ خطی نسخوں میں ہے یعنی ”دوسرے کہ برکی قیماق وہ ہندی ملائی گویند“۔

فرہنگ جہانگیری سے پہلے جر لغت ہندستان میں لکھے گئے، ان میں موتیہ الفضلا کی بھی خاص حیثیت ہے۔ اس لغت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ہندی مرادفات انہی خاصی تعداد میں ملتے ہیں، اور یہ کہ بعد کے بہت سے لغات کا یہ اہم ماخذ رہا ہے جن میں جہانگیری بھی شامل ہے۔ موتیہ الفضلا میں لفظ ”چربک“ موجود ہے۔ جہانگیری اور موتیہ کی عبارتوں کا مقابلہ کرنے پر معلوم ہو گا کہ اس لفظ کے ذیل میں جہانگیری میں تفصیل زیادہ ہے، لیکن یہ تفصیل، بنیاد پر موتیہ کی عبارت پر مبنی معلوم ہوتی ہے اور کئی جملے مشترک ہیں۔ موتیہ میں آخری جملہ اس طرح ہے ”دوسری سرچہ کہ قیماق باشد“ اور ہند آئرا ملائی گویند، ہم یہ نظر آدہ“۔

صاحب موتیہ الفضلا کے شاگرد، شیخ عبدالرحیم سوربھاری کا لغت کشف اللغات تبتی جہانگیری کی فہرست ماخذ میں شامل ہے۔ اس لغت کے پیش نظر نسخے میں لفظ ”چربک“ تو موجود نہیں، البتہ اس کی دوسری صورت ”چربہ“ ملتی ہے، اور اس کا ہندی مرادف ”ملائی“ لکھا ہوا ہے: ”چربہ، بالفتح و باجیم فارسی... یہ ہند ملائی نامند“۔

عبارات تراکدہ و اشعار بے فائدہ... و متفرج الفاظ و ایضایہ اعراب و تحقیق معانی بقدرہ تقدیر و ساقی بہ ہند و مل نمودہ شد“ (دیکھئے فرہنگ رشیدی)۔

فرہنگ رشیدی، ایشیا نمک سوسائٹی بنگال کی طرف سے دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی پہلی جلد ۱۸۶۲ء میں اور دوسری ۱۸۶۵ء میں شائع ہوئی۔ یہ لغت پبلسٹ مشن پریس بھکتہ میں چھاپا تھا۔ یہی انٹیشن پیش نظر ہے۔ برٹ کے حالات کے لیے دیکھیے نوبتہ الخواطر جلد پنجم۔
۱۔ جامعہ تہذیبیہ دہلی کے کتاب خانے میں اس کا ایک خطی نسخہ موجود ہے، اسی سے استفادہ کیا گیا ہے۔
مطبوعہ نسخہ سری نظر سے نہیں لگرا۔

جہاں گہری اور رشیدی کے بعد جو اہم لغت ہندستان میں مرتب ہوئے، ان میں سے برہان قاطع، بہارِ نجم، غیاث اللغات اور فرنگِ آئندہ راج میں لفظ ”چربک“ کے ذیل میں اس کا ہندی مرادف مذکور نہیں۔ ہاں، سراج اللغۃ اور ہفت قلم میں ”چربک“ کا ہندی مرادف صرف ”ملائی“ ملتا ہے۔ ہفت قلم میں لفظ ”چربک“ کے ذیل میں موید الفضلا کی عبارت کو معمولی سی ترمیم کے ساتھ نقل کر لیا گیا ہے اور ایک دو جملے جہاں گہری سے لیے گئے ہیں، اس طرح ہفت قلم میں لفظ ”چربک“ کے ذیل میں جو کچھ مرقوم ہے، وہ اصلاً موید اور جہاں گہری کی عبارتوں کا مجموعہ ہے، اور اس میں بھی زیر بحث جملہ اس طرح ہے ورنہ سر شریہم آمدہ کہ قیماغ باشد دور ہند آرا ملائی گویند، یہ بات پیش نظر رہنا چاہیے کہ ہفت قلم، کشتوں میں مرتب ہوا ہے اور وہیں چھاپا ہے۔

مکمل خان آرزو کا یہ قابلِ قدر لغت ابھی تک طباعت سے محروم ہے۔ اس کا ایک اچھا غلط نسخہ ضالہ بٹری رام پور میں محفوظ ہے۔ اس سے متعلق معلومات عرشی صاحب کے خط کے توسط سے حاصل ہوئی ہے۔

یہ لغت غازی الدین حیدر کے زمانے میں مرتب ہوا تھا۔ اس کے دیباچے میں مولوی قبول محمد نے لکھا ہے کہ یہ لغت خود غازی الدین حیدر نے ”از کتب دہلی و دہلیت دہلی بہ اتمام رسانیدند“، اس کو شاید ہی کوئی تسلیم کرے۔ مولوی صاحب نے مزید لکھا ہے کہ یہ کتاب بروز جمعہ ۲ محرم ۱۲۲۹ھ کو شروع کی گئی، اور غزوہ ذی الحجہ ۱۲۳۰ھ کو مکمل ہو گئی۔ اگر یہ مدت صحیح ہے تو اس کی ترتیب میں متعدد حضرات نے حصہ لیا ہوگا۔ خاصاً ختم لغت ہے۔ یہ سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی چھ جلدیں لغات پر مشتمل ہیں، اور ساتویں جلد میں قواعد زبان، اقسام نظم و نثر، صنائع لفظی و معنوی اور عروض و تانیہ کا بیان ہے۔ یہ لغت بھی دوسرے لغات کے مندرجات کا مجموعہ ہے، مولوی ترمیمات کے ساتھ۔ میرا خیال ہے کہ مولوی قبول محمد (جنہوں نے اس کا مقدمہ

بن ماحض ہے، مختلف اعتبارات سے اس بات کی پوری طرح تائید ہوتی ہے کہ نو نگار
جہانگیری کے مطبوعہ نسخے میں لفظ "بالائی" بعد کو شامل کیا گیا ہے اور غالباً اہل مطبع اس کے
نسخے دار ہیں۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کچھ صورت و دو سکھ مقامات پر تو نہیں پائی جاتی ہے؟
اس خیال کا پیدا ہونا قدرتی بات ہے، اور ایک اور دل چسپ "الحاق" سے اس خیال کو
مدد ملتی ہے۔ اس کا تعلق بھی اسی لفظ "بالائی" سے ہے۔

ابھی لکھا گیا ہے کہ خان آرزو کے لغت سراج الکلفہ میں لفظ "بالائی" موجود نہیں، اس میں
صرف "لانی" ہے؛ مگر اسی کے دوسرے لغت چراغ ہدایت کے مطبوعہ نسخے میں یہ لفظ موجود ہے۔
سراج الکلفہ تو نہیں چھپ سکا، لیکن چراغ ہدایت چھپ چکا ہے۔ اس کے دو مطبوعہ نسخے پیش
نظر ہیں، یہ دونوں عیادت اللغات کے حاشیے پر چھپے ہیں، ایک نظامی پریس کالج لاہور کا مطبوعہ
ہے اور دوسرا نول کشور پریس گنٹو کا چراغ ہدایت کے ان دونوں نسخوں میں لفظ "سر شیز"
کے ہندی مرادوں کی حیثیت سے صرف "بالائی" ملا ہے:

"سر شیز" اضافت دشمنی معبر دیاے معرون، قیماقی کہ بہ ہند بالائی گویند؟

خان آرزو کا انتقال ۱۱۶۹ء میں ہوا اور نصف الدولہ کی فرماں روائی کا زمانہ آرزو کی
کھلمے کے ساتھ کئی دیگر علما نے اس لغت کی تالیف میں حصہ لیا ہے۔ نول کشور پریس سے پہلا حجم
کا جو نسخہ ۱۸۷۹ء میں شائع ہوا تھا اس کے آخر میں ہفت قلمزم مطبوعہ نول کشور پریس کا اشتہار بھی
ہے اس اشتہار کی یہ عبارت قابلِ توجہ ہے:

حاج خونی اور اجتام کے ساتھ تالیف کی گئی کتب کتابیں لغات فارسی کی کتب خانہ شاہی سے
فراہم ہو کر بہ اجتماع جم غفیر ملے نام دار گنٹو، شہل مولوی اوحد الدین مرحوم بگرامی اور مولوی
اسماعیل مغفور لندنی، خاص الخاص تو تم اور تم نفس نفیس اتقائے شاہی سے ... بہ صرفت خواندہ بے شمار
اہل مال کی محنت میں ... چھپیں؟

پہلے پہل بار مطبع سلطانی گنٹو، جلدوں میں شائع ہوا تھا، ۱۲۳۰ھ (۱۸۴۲ء) میں۔ میرے
ساتھ بھی نسخہ ہے

دقات کے ۱۸، ۱۹ سال بعد شروع ہوتا ہے چراغِ ہدایت میں اس کی صراحت نہیں کی گئی ہے کہ اس کا سالِ تالیف کیا ہے، لیکن ڈاکٹر منوہر سہاسے انور کی یہ رائے ہے کہ اردو ۱۹۳۸ء تک اس کی تالیف سے فارغ ہو چکے تھے [اولی کالج یگزین کا تیسرا نمبر ۱۹۶۲ء] اور صحت میں اس لغت میں لفظ ”بالائی“ کا وجود میرے لیے باعثِ تعجب تھا۔ غرضی عربی صاحب سے تصدیق کیا، موصوف نے مطلع فرمایا کہ :

”سر شیر اور لٹائی کے سلسلے میں چراغِ ہدایت کو دیکھا، اس میں یہ لفظ یعنی ”سر شیر“ سے موجود ہی نہیں ہے۔ آپ یہ دیکھیں کہ صرف ایک نسخے کو دیکھ کر لکھ دیا ہے، چار چار نسخے دیکھے، جن میں سے ایک ۱۱۸۳ء کا ہے، انگریزی میں بھی سر شیر نہیں ہے“ (مکتوب بہ نام راقم الحروف)۔

یعنی چراغِ ہدایت میں لفظ ”سر شیر“ بعد کا اضافہ ہے اور اس کے ذمے دار بھی بخلاہود لوگ معلوم ہوتے ہیں، جن کی ”تصحیح و تہذیب“ کے ساتھ یہ کتاب چھپی ہے، اس لحاظ سے چراغِ ہدایت کا مطبوعہ نسخہ بھی، فرہنگِ جہانگیری کے اُس نسخے کی طرح غیر متجزی قرار ہوتا ہے۔ یہاں اس کا اظہار ضروری ہے کہ خانہ آرزو کے اردو لغت کو اردو لفاظ میں حرفِ جہم کے تحت ”لٹائی“ مندرج ہے، اور ”بالائی“ سے یہ لغت بھی کلیتہً خالی ہے۔

”لٹائی“ اور ”بالائی“ کے سلسلے میں ایک دل چسپ بحثِ فصیح و غیر فصیح کی بھی ہے، اور خود لکھنؤ میں یہ مسئلہ مختلف قیام رہا ہے حضراتِ دہلی نے اس نو اور لفظ ”بالائی“ کو لکھی غلط نہیں کہا، لیکن اس کو اہل لکھنؤ کی ایسا دیکھا اور خود اسی پڑنے لفظ ”لٹائی“ کو فصیح سمجھتے رہے۔ آزاد کی مہارت اور نقل کی جاہلی ہے جس کو مولفہ آصفیہ نے بھی دہرایا ہے اس سے ارد بابِ دہلی کے رحمان کا یہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

آزاد کی خصوصیاتِ انشا میں سے ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ جہاں چاہتے ہیں، نہایت سادگی کے ساتھ طنز کا نشترِ جھومر جتاتے ہیں۔ رحمان اللہ اور مرزا کہتے کہتے

ایک جملہ ایسا بھی لکھ جاتیں گے کہ ساری تحسین، تعریفیں ہیں بدل کر رہ جائے گی۔ لفظ بالائی سے متعلق جو کچھ انھوں نے لکھا ہے، اُس میں بھی یہی انداز ہے۔ وہ ”ملائی“ کو فصیح اور اُس کے مقابلے میں ”بالائی“ کو غیر فصیح کہنا چاہتے ہیں، مگر صاف صاف کہنے کے بجائے، مذاقِ سلیم کے پردے میں اس بات کو ادا کرتے ہیں: ”مذاقی سلیم دونوں کے لطف میں امتیاز کر سکتا ہے“

اہلِ لکھنؤ میں سے مولانا شمس الدین نے مذاقِ سلیم کے امتیاز کی نشتریت کو برکی طرح محسوس کیا اور گذشتہ لکھنؤ میں جہاں ”بالائی“ پر گفتگو کی ہے، وہاں آزاد کی اس تعریف کا بھی جواب دیا ہے، اگرچہ وہاں پر یہ پہلو ان کے موضوع سے غیر متعلق تھا۔ مولانا شمس الدین کی عبارت یہ ہے:

”اس کو پرانی زبان میں ملائی کہتے ہیں۔ اصف الدور بہادر نواب اور دودھ کوہیہ اس قدر پسند تھی کہ خاص اہتمام سے ان کے لیے تیار کی جاتی تھی۔ انھوں نے اس کا نام ملائی کے عوض بالائی رکھ دیا، اس لیے کہ یہ دودھ کے اوپر کی چیز ہے۔ اہلِ لکھنؤ کو اپنے فرماں روا کو یہ تعریف بہت پسند آیا اور بالائی کا لفظ زبانوں پر اس قدر چڑھ گیا کہ اب لکھنؤ میں سوائے بہانویوں یا ہندو جہلانے سب اسے بالائی ہی کہتے ہیں اور ملائی کا لفظ کسی مہذب شخص کی زبان پر باقی نہیں رہا۔“

اس پر مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم نے آبِ حیات میں اعتراض کر دیا اور انصاف کو ذوقِ سلیم پر ختم فرمایا، جس معیار سے ان کے مذاق میں ملائی کا لفظ، بالائی سے زیادہ لطیف و فصیح ہے۔ کسی لفظ کو محض اپنے مذاق کے اعتبار سے غیر فصیح کہ دینا میرے نزدیک ایک بے معنی سی چیز ہے، اس لیے کہ ہر جماعت کو وہی لفظ اپنے ذوق میں اچھے معلوم ہوتے ہیں جو ان

کی زبان پر چڑھے ہوں اور اُن کے لہجے اور محاورے سے مانوس ہو گئے ہوں۔ جن مشہروں کے لوگ ملائی کہتے ہیں، اُن کو بے شک بالائی کا لفظ گراں گزرتا ہو گا اور اُن کی زبان سے نا آشنا ہو گا۔ مگر جس شہر میں لوگ بالائی کہتے ہیں، اور یہی لفظ ان کے محاورے میں شامل ہو گیا ہے، اُن کو جو فصاحت، لائی میں نظر آتی ہے، ملائی میں ممکن نہیں۔ اُن کو ملائی، جاہلوں اور گنواہوں کا لفظ معلوم ہوتا ہے۔۔۔

بہر حال اگر دونوں شہر معیار مانے جائیں تو ملائی اور بالائی بجائے خود فصیح ہیں ملائی اہل دہلی کے نزدیک اور بالائی اہل گھنٹو کے نزدیک۔

آزاد کے ایک لطیف جملے کے جواب میں مولانا نے کئی سطریں لکھیں، اور یہی کے عالم میں سنجیدگی کا دامن بھی اُن کے ہاتھ سے چھوٹ گیا کہ ملائی کو جاہلوں اور گنواہوں کا پسندیدہ لفظ قرار دیا۔ یہ انتہا پسندی ہے۔ مولانا شرر نے "ملائی" کو اہل دہلی سے مخصوص کیا ہے، مگر گھنٹو کے ایک مستند استاد اور زبان داں جلال نے اس کے برعکس "ملائی" کو صحیح اور بالائی کو غلط بتایا ہے۔ جلال نے اپنے نفٹ گلشن فیض میں لکھا تھا۔

۱۔ متوفی ۱۹۰۹ء (تذکرہ کا جلال رام پور)

۲۔ اس کا دوسرا نام گنجینۂ زبانِ اردو ہے۔ "گلشن فیض" تاریخی نام ہے۔ جس سے توفیق صراحت کے مطابق سالِ تکمیل ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) ہے۔ کتاب کے آخر میں جو قطعہ تاریخ طبع ہیں، اُن سے سالِ طبع ۱۲۹۷ھ نکلتا ہے، مگر خاتمتِ الطبع کی عبارت میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ یہ کتاب دسمبر ۱۸۸۸ء مطابق محرم ۱۲۹۸ھ میں چھپی ہے۔ یہ کتاب نول کشور پریس گھنٹو میں چھپی تھی۔ ۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

اتیریمنائی نے اپنے ایک شاگرد مہدی حسن خاں شادآب کو گھنٹا تک یہ نفٹ دراصل

”ملانی، ہر سنجیدہ شاعر کی ہوش وادان پدید آید و پوسٹیک بر مغزات
 نشینت، ن، مرخیر و شمر و کسانیکہ آخر“ بالائی ہر موندہ والین کشیدہ گویند
 غلط گویند“ (گلشن فیض، ص ۷۱۳)۔

جلال کا یہ لغت ۱۲۹۸ء تا ۱۸۸۰ء میں چھپا تھا۔ جلال کے بعض حریفوں نے اس پر کچھ
 اعتراض کیے، جن میں سے بعض بالکل درست تھے۔ ۱۳۰۳ء میں ان کا لغت سرایۂ زبان اردو
 شائع ہوا۔ یہ دراصل گلشن فیض کا اردو ترجمہ ہے، بہت سی ترمیموں کے ساتھ اس میں
 بھی انہوں نے ”ملانی“ کے متعلق اپنی اس رائے کو برقرار رکھا:

”میر نے مستودۃ لغت کا ایک ٹکڑا ہے، جس میں تعترفات بے جا شامل ہیں، مکتوبات
 امیر چٹائی، مرثیہ حسن الشجاء ثاقب، طبع دوم، مکتوب ہمام شاداب،
 لطیفہ ہے کہ صاحب فرنگ آصفیہ نے اس سے زیادہ واضح الفاظ میں امیر پر یہی الزام
 لگایا ہے:

”الشرائع کیا مقام عبرت ہے کہ حضرت امیر احمد صاحب امیر چٹائی، جنہوں نے
 اس اخیر فریق امیر اللغات کے دو باب مرن العین ممدودہ والین مقصورہ کے
 ہر بہار اضافی دلی کا چرا آکر کر شائع فرماتے ہر فرنگ آصفیہ جلد اول، طبع ۱۲۹۸ء ص ۱۳،
 ان بزرگوں کے اسس ”مزاج المؤمنین“ کو کیا کہا جاتے!

جلال کے لغت گلشن فیض کی زبان فارسی ہے، کچھ دلوں کے بعد انہوں نے بعض ترمیموں کے ساتھ
 اس کا اردو میں ترجمہ کر کے سرایۂ زبان اردو کے نام سے شائع کیا۔ ہاں جلال نے اپنے استاد شکستہ کے
 لغت نفس اللغات کی بہت سی مہاتیں، بالفاظ معمولی ترمیم کے ساتھ گلشن فیض میں داخل کر دیں اور کہیں
 حواشی نہیں دیے۔

یہ اس کا دوسرا نام تحفۂ سخن وراں ہے، جلال نے سال ترمیم کی صحت نہیں کی (باقی آگے)

• ملائی، ہجو، تہنالی معرود کے ساتھ ایک چیز ہوتی ہے: وہ کہ بہت لذیذ اور عمدہ لطیف، کہ اس کو نان خورش کرتے ہیں، اور یوں بھی کھاتے ہیں۔
سرشیر دشمر۔

اور ہم جہاں کہہ بالائی“ پاسے موجدہ اور الف کے ساتھ بولتے ہیں، غلط بولتے ہیں؟
(سرماہ زبان اردو مطبوعہ انوار لطیف لکھنؤ)

یہ بھی انتہا پسندی کی دوسری صورت ہے جس طرح شرر کلیم قول کہ ملائی تہا ہوں اور گنواروں کا لفظ ہے، غیر مناسب ہے؛ اُسی طرح جلاک کا یہ کہنا بھی درست نہیں کہ ”بالائی“ سرے سے غلط ہے۔ دو مثالیں اُن لوگوں کے یہاں سے پیش کی جاتی ہیں جن کا تعلق دبستان لکھنؤ سے ہے۔

وہ شیعہ لطیف سا و تاہاں شیرینی درد کا، شش جاں
جاں بخشہ درد عالم عشق بالائی اک آمد غم عشق
(محسن کاکوروی، مثنوی چراغ کعبہ مطبوعہ مطبعہ شام اور لکھنؤ، ص ۱۹)

ایفون ہرہ کے زہر سے اب پیرا ہے خوب جگر چھوہ لائی کی چاہ ہے منیر
(کلیات منیر، ص ۳۶۵)

موتوں نور اللغات نے ملائی اور بالائی، دونوں لفظ کسی تفریق یا امتیاز کے بغیر لکھے ہیں، اور کسی طرح کی پابندی مائد نہیں کی ہے۔ یہی صحیح صورت ہے۔ ”ملائی“ ہزار لفظ ہے۔ ایک زمانے تک ملائی لکھنؤ میں مستعمل رہا ہے۔ لفظ ”بالائی“ کی ایجاد کے بعد بھی، ابلی دلی، ”ملائی“ ہی کو ترجیح دیتے رہے، اور ابلی لکھنؤ میں سے جلاں جیسے مستند لوگ بھی اُسے

یہ لغت پہلی بار ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۶-۸۷ء) میں چھپا تھا۔ گلشن قیض (جس کا یہ ترجمہ ۱۹۰۶ء میں چھپا تھا، اس نے اس کی ترتیب ۱۲۹۹ء اور ۱۳۰۳ء کے درمیان میں مکمل میں لکھی ہوگی۔
تھ مولانا آسمان مارہروی، تفسیر و آراء کی اس مہارت سے ابلی دلی کی رائے کا بہت کچھ اندازہ

آخر تک صحیح اور فصیح سمجھتے رہے۔ موصوف اور اللغات نے لفظ ”ملائی“ کے ذیل میں اس کے مرکبات ملائی بڑنا، ملائیاں کھانا، اور ملائی کی چلے بھی درج کیے ہیں اور آخر الذکر کی سند میں متیر کا وہی شعر لکھا ہے، جسے اوپر درج کیا گیا ہے۔

حضرت آخر کھنوی مرحوم نے اپنے لغت فرہنگ اثر میں ملائی کی تردید یوں دلائی کہ اس کی ہم دوائی کی ہے۔ آخر صاحب نے لفظ ”ملائی“ کے ذیل میں سرانے زبان اردو کی عبارت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے :

”ملائی میں رکاکت کا پہلو نکلتا تھا، ملائی دلائی، ثواب معاوت علی خاں ثواب وزیر اودھ نے اس کو بالائی کہا۔ ایک صودت جو ان کی یہ ہو سکتی ہے کہ اس کی تر وودھ کے اوپر (بالا) جمتی ہے۔ ان کی یہ آج اتنی مقبول ہوئی کہ کھنوی میں خواص، بہ جز بالائی کے، ملائی بولتے ہیں نہیں۔ سوال صحیح یا غلط کا نہیں بلکہ فصیح و غیر فصیح کا ہے، اور اس نقطہ نظر سے فیصلہ غالباً بالائی کے حق میں ہوگا۔“
(فرہنگ اثر ص ۷۹)

آخر صاحب نے اپنے زمانے کو دیکھتے ہوئے یہ لکھا کہ خواص کھنوی صرف بالائی کہتے ہیں، ملائی کے زمانے میں یہ صودت نہیں تھی۔

کیا جاسکتا ہے :

”ساتھ ہی اس کے یہ بات بھی بتائی جائے کہ اہل کھنوی کے خسرعات و تصرفات دہلی میں کس زبان والے اپنے کلام میں استعمال کیے ہیں؟ ... اندھڑے معنی آندھی کے ہونا؛ ایشیے کی جگہ؛ بالائی، ملائی کی جگہ ... اس قسم کے الفاظ کی وقعت اہل زبان کی نگاہوں میں اسی قدر ہے جس قدر دکن کی ”نکو“ اور بنگال کی ”مہارو“ اور گجرات کی ”لین“ کی قدر ہے۔ اس قسم کے اختراعات کی اہل دہلی نے ہمیشہ مخالفت کی ہے“

(جلد داغ، مطبع شخصی حیدرآباد دکن ص ۳۰)

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اساتذہ کلمتوں میں سے بیش تر حضرات، متردکات اور فصیح و غیر فصیح کا بڑا لحاظ رکھتے تھے، اس موضوع پر کئی رسالے بھی لکھے گئے، کئی دواوین میں بھی اس کی صراحت کی گئی، غیر فصیح اور متردک الفاظ کی لمبی جوڑی فہرستیں مرقب کی گئیں، مگر متردکات کی ان فہرستوں میں لفظ ”طائی“ مذکور نہیں۔

یہ مان لینا چاہیے کہ یہ دونوں لفظ پہلے بھی فصیح تھے، اور اب بھی فصیح ہیں۔ جو صاحب چاہیں، بالائی، کمبیں اور جس کا جی چاہے ”طائی“ کہے، گفتگو اور تحریر میں بعض مقامات ایسے بھی آسکتے ہیں، جہاں صرف ٹھنی بیان کے لحاظ سے یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ کہاں پر ان میں سے کون سا لفظ کہنا چاہئے، اور ایسے مواقع پر دلی و کلمتوں کا اختلاف خود بہ خود درمیان سے اُٹھ جاتے گا۔



ترکیب مُہند

عربی فارسی الفاظ کو غیر عربی فارسی الفاظ (خاص طور پر ہندی الفاظ) کے ساتھ بہ قاعدۂ فارسی ترکیب دینا قابلِ اعتراض سمجھا گیا ہے۔ اساتذہ متوسطین و متاخرین نے ایسی ترکیبوں کو عموماً غیر معتبر قرار دیا ہے۔ اس مضمون میں اسی مسئلے پر بحث کی گئی ہے۔ یہ تین فصلوں پر مشتمل ہے :

پہلی فصل میں لفظ ”مُہند“ اور ترکیب ”مُہند“ کے معانی و مفہوم پر گفتگو کی گئی ہے۔

دوسری فصل میں فارسی و اردو میں ایسے مرکبات کے متعلقہ مسائل زیر بحث آئے ہیں۔

تیسری فصل میں اردو میں مُہند ترکیبوں کے لیے ضروری قاعدے لکھے گئے ہیں، اور یہ بتایا گیا ہے کہ کن صورتوں میں ایسی ترکیبیں مستحسن ہیں اور کن صورتوں میں وہ ناقابلِ قبول ہو سکتی ہیں۔

ترکیبِ مہند سے مراد یہ ہے کہ مرکب کا ایک جُز عربی یا فارسی سے تعلق رکھتا ہو (ترکی الفاظ بھی اس میں شامل ہیں) اور دوسرے جُز کو کسی اور زبان سے نسبت ہو۔ اکثر ہندی اور کم تر انگریزی الفاظ دوسرے جُز کے طور پر آتے ہیں، اور وہ الفاظ بھی اس ذیل میں آتے ہیں جو اردو میں بنے ہوں یا اردو میں تصرقات سے دوچار ہونے ہوں۔

نور اللغات میں لفظ ”تہنید“ کی جس طرح تشریح کی گئی ہے، اُس سے وضاحت کے ساتھ معلوم ہو سکتا ہے کہ اردو میں ”مہند“ سے مراد کیا ہے،

”تہنید، کسی غیر زبان کے لفظ کو ہندی بنالینا جیسے فارسی دہل سے ”ڈھول“، انگریزی ”لارڈ“ سے ”لاٹ“۔ تہنید کئی طرح کی ہوتی ہے، ایک تہ کہ دوسری زبان کے لفظ کو لفظاً و معنماً دونوں طرح بدل لیں، جیسے ”افرا تفری“ کو اصل میں ”افراط تفریط“ تھا اور اردو میں بمعنی ”ہل چل“ ہے۔ دوسرے، صرف لفظ کو بدل دینا، جیسے، ”پلیڈ“ سے ”پلیٹ“۔ تیسرے، صرف معنوں کو بدل لیں، جیسے، ”روزگار“ فارسی میں ”داند“، اردو میں ”نوکری“۔ چوتھے، حرکات کو بھی بدل دیں اور معنوں کو بھی، جیسے ”مشاط“ عربی مبالغہ کا صیغہ، اردو میں ”مشاط“ بغیر تشدید دوم، وہ عورت جو زُنّ مرد کی نسبت ٹھہرائے اور شادی کرائے۔ پانچویں، جمع سے واحد کے معنی لیں، جیسے ”اصول“، ”احوال“۔ چھٹے، دوسری زبان کے مادہ ہائے الفاظ سے ایسے صیغے بنانا جو اُس زبان میں مستعمل نہ ہوں، جیسے ”مغزو“ اور ”غتاب“ سے ”معاف“ اور ”معتوب“۔

جو لفظ ہندی صورت اختیار کرے، اُس کو ”مہندہ“ کہتے ہیں“ (تور اللغات)۔

غالباً پنڈت دتاتریہ کی یہی مرحوم نے اردو کی رعایت سے ”تہندہ“ کے بجائے اس عمل کا نام ”تاریدہ“ رکھا تھا اور ایسے لفظوں کو ”مورودہ“ کہا تھا، اور تاریدہ کی جگہ، ”اردووانا“ بھی کہا گیا تھا؛ مگر یہ نئی اصطلاحیں فروغ نہیں پاسکیں۔

عربی میں ”مہندہ“ ہندستانی لوہے سے بنی ہوئی تلوار کے معنی میں آتا ہے (مراج - المنجد) فارسی میں بھی یہی معنی برقرار رہے۔ ہندستان میں جب فارسی میں ہندی لفظوں کو بہ کثرت استعمال کیا جانے لگا اور عربی فارسی الفاظ مختلف تصرقات سے دوچار ہونے لگے تو یہاں یہ لفظ، اصطلاحی معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ قیاس ملے اُس زمانے کے فارسی لغات میں یہ لفظ ان اصطلاحی معنوں میں نہیں ملا۔ غیث اللغات میں بھی یہ معنی نہیں ملتے جو مؤخر لغات میں سے ہے۔ مگر یہ لفظ بطور اصطلاح مستقل طور پر تھا۔ مثلاً میرزا خاں کی تالیف تحفۃ الہند میں یہ لفظ موجود ہے (یہ عہد عالمگیری کی تالیف ہے) اس کتاب سے ایک مثال پیش کی جاتی ہے،

”ارج : خیم اول و نسخہ را، پستان را نامند و بہ تیج اول، مہندہ عرض باشند“

(تحفۃ الہند، مکتب مخطوطہ باڈلین لائبریری، ورق ۱۷۲ ب)

سراج الدین علی خاں آرزو نے اپنے لغت چراغ ہدایت میں اس لفظ کا جو اصطلاحی مفہوم لکھا ہے، وہ بہ ظاہر متعارف مفہوم سے مختلف معلوم ہوتا ہے۔ لفظ ”انگ“ کے تحت ایک ذیلی عنوان ”اشترک لغات در فارسی و ہندی“ کے تحت درج ہے،

”بنجم مہندہ است، و اس اصطلاح فقیر آرزو است و آں آرد و ان الفاظ فارسیست

در زبان ہندی، چنانکہ الفاظ فارسیہ و دتاتریہ ہندی نویند مثل روزنامہ و فی حررت و غیرہ۔“

اگر عبارت کا مفہوم سمجھنے میں مجھ سے غلطی نہیں ہوئی ہے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ”مہندہ“ کی یہ تعریف اُس تعریف سے ذرا مختلف ہے جو اس لفظ سے وابستہ رہی ہے۔

کے لیے اس انداز کے دو اصطلاحی لفظ ”مُتَرَبَّطٌ“ اور ”مُفَرَّسٌ“ موجود ہی تھے۔
 تہنید کا تعلق الفاظ کے بدلنے اور جننے سے ہے، اور لفظ ”مہند“ ایسے ہی
 الفاظ کے لیے آتا ہے، اسی طرح عطف و اضافت کے زیرِ بحث قاعدے بھی فارسی
 سے تعلق رکھتے ہیں، اگر فارسی یا عربی کے کسی لفظ کو کسی مہند لفظ یا ہندی انگریزی
 (وغیرہ) کے کسی لفظ کے ساتھ یہ قاعدہ فارسی ترکیب دی جائے، تو یہ عمل بھی تہنید
 کے ذیل میں آئے گا؛ ان وجوہ سے، اگر ایسی ترکیبوں کو ”ترکیب مہند“ کہا جائے تو
 کچھ بے جا نہ ہوگا۔ اسی لیے اس مضمون میں ”ترکیب مہند“ کو اصطلاح کے طور پر
 استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً ”آبِ ددان“ فارسی ترکیب ہے، لیکن ”آبِ ددانے“
 کو ترکیب مہند کے دائرے میں آنا چاہیے، کیوں کہ ”دانے“، ”دانہ“ کی مہند صورت
 ہے۔ ایک رباعی کا پہلا شعر ہے،

اب نگرم خبر موت کے آنے کی ہے
 ناداں! کچھ نہ کر آبِ ددانے کی ہے

اسی طرح فنِ بھنگ، موسمِ برسات، لیلائے سولِ سروس، پسِ چلمن، اخلاص
 و پیار جیسی ترکیبوں کو ”مہند ترکیب“ کہنا چاہیے۔ ہندوستانی فارسی میں فارسی
 و عربی الفاظ کے ساتھ غیر فارسی عربی الفاظ کو بے تکلف ترکیب دی جاتی رہی
 ہے اور اس میں ہندوستانِ نژاد اور ایران سے آئے ہوئے شعرا و نثر نویس برابر
 کے حصے دار ہیں، مگر ایسی ترکیبوں کو کوئی خاص نام نہیں دیا گیا تھا؛ یہ بات
 مناسب ہوگی کہ ایسی ترکیبوں کو، ترکیب مہند کے نام سے موسوم کیا جائے۔

۱۔ ”مرب“ وہ لفظ جو دراصل کسی اور زبان کا ہو، اور اس کو تھوڑی سی تبدیلی کے
 ساتھ عربی بنا لیا ہو، جیسے ”شک“ سے ”سک“ (تور اللغات)

۲۔ ”مفرس“ غیر زبان کا لفظ جسے فارسی زبان کا لفظ بنالیں (تور اللغات)

مرکبات، زبان کا اہم حصہ ہوتے ہیں۔ ادب خصوصاً شاعری کو اُن کی خاص طور پر ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ اداسے خیال کے لیے اُن کے اندر بہت وسعت ہوتی ہے۔ اس میں دراصل زبان کے مزاج کو بہت دخل ہوتا ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ مفرد لفظوں کی کمی کو مرکبات کی مدد سے پورا کرنا نسبتاً آسان ہے اور فارسی میں بھی ہوا ہے۔ عربی کے مقابلے میں فارسی کا ذخیرہ مفردات کم ہے، مگر فارسی میں ترکیب کے متعدد قاعدوں کی مدد سے مرکبات کا قابلِ قدر ذخیرہ ملتا ہے۔ مفرد یا مفرد نما لفظوں کا معرض وجود میں آنا، اکثر صورتوں میں نئی اشیا کے ظہور میں آنے یا نئے حقائق کے انکشاف پر منحصر ہوتا ہے، اس لیے مفردات کے ذخیرے میں بہت تدریج اضافہ ہوتا ہے اور محدود تعداد میں۔ جب کہ مرکبات کی تشکیل عموماً جذبات و افکار کی تصور تراشی یا خیالات کی ہیکر تراشی کے تحت ہوتی ہے (فارسی کے خیال بند شعرا یا اُن سے قریب کی نسبت رکھنے والے شاعروں نے بڑی تعداد میں بہترین ترکیبیں تراشی ہیں) اور کبھی محض لفظی تلامزموں کے نتیجے میں بھی اُن کی نمود ہوتی ہے۔ گویا ادبی زبان میں اکثر مرکبات کا ہیوا، عالم خیال میں بنتا ہے، اس لیے مفرد الفاظ کے مقابلے میں مرکبات کی تشکیل آسان ہے اور بہت بڑی تعداد میں وہ وجود پذیر ہو سکتے ہیں۔ اداسے مفہوم اور لفظ سازی کا یہ انداز اور مرکبات کا بہت بڑا حصہ فارسی سے براہِ راست اردو کو ملا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اردو زبان اپنے دورِ ارتقا میں "ادبی" رہی ہے۔ یعنی زبان کا ڈھانچا بنا کسی طرح ہو مگر اُس کا معیاری روپ ادبی رہا ہے، اور اُس ادبیت میں بھی شاعری کو سب سے اہم منزلت حاصل رہی ہے۔ اس زبان کا نقش جب درست ہو رہا تھا، اُس وقت دفتری اور تہذیبی سطح پر فارسی کی حکومت تھی۔

جب فارسی کی بساط الٹ گئی تو اُس کی جگہ انگریزی نے لے لی۔ یہاں جدید علوم و فنون اور صنعت و حرفت کو جتنا بھی فروغ ہوا، اُس کی ترجمانی انگریزی کے حصے میں آئی۔ اردو عمومی طور پر شعر و ادب کی زبان رہی اور اُس معیار پسندی کے سایے میں پروان چڑھتی رہی جس میں وہابی سے کہیں زیادہ حصہ لکھنؤ کی تہذیب آرائی کا تھا۔ وہابی ایک مدت سے قافلوں کی منزل گاہ اور گذرگاہ تھی اور مختلف اقوام اور مختلف علاقوں کے اثرات یہاں آویزش و آمیزش کے عمل سے دوچار ہوتے رہے تھے؛ ان وجوہ سے یہاں کی معاشرت کے مختلف مظاہر میں گھر در گھر کی ہلکی سی نمود مزور تھی اور زبان بھی اس سے مستثنا نہیں تھی؛ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی ادبی زبان پر قاعدوں کے پہرے کچھ زیادہ نہیں بیٹھ پائے۔ اس کے برخلاف لکھنؤ کی نئی معاشرت نے اُس شعری و ادبی زبان کو ضابطوں میں زیادہ سے زیادہ اسیر کرنا ضروری سمجھا۔ وہاں کی معاشرت جس طرح ظاہر آرائی کے پیر میں آئی تھی، اُس کا تقاضا ہی یہ تھا۔ زبان، ادب اور حکومت؛ ان سب کے مرکز اول (وہابی) سے امتیاز پیدا کرنے کی حد سے بڑھی ہوئی خواہش، اُس میں اضافے ہی کرتی رہتی تھی۔ گویا اردو کو وہ فضائی ہی نہیں جس میں صنعت و حرفت اور ایجابات و اکتشافات کی تازہ کاریاں اپنے اثرات کو پہنچانے لگی رہتی ہیں، جن کے اثر سے ذخیرۃ الفاظ میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، اور سب سے بڑی بات یہ کہ زبان میں وہ صلابت پیدا ہوتی ہے جس کے بل پر وہ پھیلتی ہے، اور ادبی زبان اور بول چال کی زبان کا فاصلہ کم ہوتا رہتا ہے۔ اس کا کچھ اندازہ اُس وقت ہوتا ہے جب کسی نئے عنصر یا نئے انداز کے اضافے، یا کسی قاعدے کی شکست کا مرحلہ آتا ہے۔ ترکیب مہند کا قاعدہ بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔

ترکیب کے کئی قاعدے ہیں۔ سادہ طریقہ تو یہ ہے کہ دو لفظوں کو پہلو بہ پہلو رکھ دیا جائے اور اس کی دو صورتیں یہاں قابل ذکر ہیں: دونوں تجز اسم ہوں جیسے: گل ہلن اور پلچن۔ ایک اسم ہو اور ایک فعل، جیسے دل شکن اور ہتھ چھٹ۔ ”پن پلچن“ اور ”ہتھ چھٹ“ جیسے مرکبات ایسی ہیں اور ان کو درست قرار دیا گیا ہے، مگر خاص خاص صورتوں کے علاوہ، عام طور پر اس کو نادرست بتایا گیا ہے کہ مرکب کا ایک تجز فارسی و عربی کے بجائے کسی اور زبان کا ہو، اور ایک تجز فارسی یا عربی سے تعلق رکھتا ہو مثلاً ”کھڈارڈ“ اور ”سنسنی خیز“ کی حیثیت بہ لحاظ قاعدہ ”غیر متبر مرکبات“ کی ہوگی۔

فارسی میں فعل امر سے پہلے کسی اسم کے اضافے سے اسم فاعل سمائی بنتا ہے، جیسے: دل کش، دل چپ۔ ایسے مرکبات اردو میں بھی اسی طرح متعل ہیں۔ اسی طرح فارسی کے متعدد سابقوں اور لاحقوں کے اضافے سے بنے ہوئے مرکبات بھی اردو میں بہ کثرت موجود ہیں، جیسے: گل زار، مے کدہ (وغیرہ) — ترکیب کے یہ قاعدے جس قدر سادہ ہیں، اسی قدر کارآمد بھی ہیں۔ اس سادگی و نہ پرکاری کے باعث یہ ہونا ہی تھا کہ اردو میں بھی ایسے مرکبات کی تشکیل ہو اور اس طرح کہ ان کا ایک تجز فارسی یا عربی ہو اور ایک مقامی، جیسے: بکمر گدا، ڈاک خانہ، دھوکے باز، جگت استاد، جگت گرد کی ویسی ترکیب بھی پیش نظر ہے، کفن کھسوٹ، عجبائب گھر، چور و دواڑہ، ہتیار بند، لٹھ بند، امام باڑا، بستی پوش، ڈگری یافتہ، جیشی شدہ، تھانے دار، دھاری دار، گھاڑی بان، منہ زور وغیرہ۔ اس قبیل کے مرکبات کے متعلق اساتذہ نے کچھ بھی کہا ہو، یا کہیں، یہ زبان کا اہم تجز ہیں اور عام تحریروں میں ان کو استعمال کیا گیا ہے اور استعمال کیا جاتا ہے۔

۱۔ ایک پرانا شعر یاد آگیا:

اک بستی پوش سے آغوش ز گیس کیجیے جی میں ہے اس مصرع موزوں کو نہیں کیجیے

اس سلسلے میں خاص بات یہ ہے کہ ایسے مرکبات نے عموماً خنز میں بار پایا۔ ان میں سے اکثر تھے ہی اُس کے ڈھب کے۔ شاعری کی زبان کے متعلق یہ کہا جا چکا ہے کہ اُس کا دائرہ شروع ہی سے محدود رہا ہے۔ شعری زبان کا ایک رہا ہوا تصور ذہن و ذوق پر اس طرح چھا کر رہ گیا ہے کہ اکثر صورتوں میں اُس سے قطع تعلق نہیں ہو پاتا۔ ہم میں سے اکثر کا یہ حال ہے کہ اصول کے طور پر جو بھی کہیں، مگر شعر میں کوئی ایک لفظ اور صراہ صرا آجائے تو تربیت یافتہ ذوق، تلخ کام ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرح کی بیش تر ترکیبیں نثر تک محدود رہیں۔

ترکیب کے دو خاص قاعدے ایسے ہیں جو فارسی سے مخصوص ہیں اور وہیں سے اُردو کو ملے ہیں؛ یہ ہیں عطف اور اضافت کے قاعدے۔ اضافی مرکبات نے (توصیفی مرکبات بھی اس میں شامل ہیں) فارسی زبان و ادب کو بہت کچھ بخشا ہے اور اردو شاعری میں بھی بہت سی کرشمہ کاریاں انہی کی مرزوں میں۔ ان دونوں قاعدوں نے خنز کے مقابلے میں نظم میں زیادہ جگہ بنائی، بل کہ خنز میں خاص خاص ترکیبیں، نظم ہی سے مستعار لی جاتی رہی ہیں۔ چون کہ اضافی ترکیبیں شروع ہی سے نظم سے کچھ زیادہ متعلق رہی ہیں، اور یوں بھی کہ یہ دونوں قاعدے، فارسی کے خاص قاعدوں میں سے ہیں، ان وجہ سے ان میں "خالص بن" کا ہر طور خاص لحاظ رکھا گیا ہے، یعنی یہ کہ مرکب کے دونوں اجزا فارسی و عربی کے ہوں۔ بس اتنی جھوٹ دی گئی کہ اسمائے خاص یا ایسے نام جن کا بدل موجود نہیں؛ اُن کو عطفی یا اضافی مرکبات کا جُز بنایا جاسکتا ہے، مثلاً،

ہوس اندھا بنا کر، قتل کا سامان کرتی ہے

فریبِ نفس ہے، سیتا کہاں آغوشِ رازِیں میں (آرڈو لکھنوی)

مدیر ہے کہ "چلسن" اور "عزم" کی طرح کے جو لفظ اردو میں مستعمل ہیں اور میں میں

عربی یا فارسی کے معلوم ہوتے ہیں؛ اکثر اساتذہ کی احتیاط پسندی نے اُن کو بھی ایسی ترکیبوں سے دور رکھنے پر زور دیا۔ آتش کے اس شعر میں :

کسی کی محرم آپ رواں وہ یاد آئی ۔ حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا
 "محرم آپ رواں" کی ترکیب پر کئی معتبر لوگوں نے اعتراض کیا ہے۔ آئیرضائی کے
 ایک شاگرد کے ایک شعر میں "پس چلن" آگیا تھا، آئیر نے اُس کو قابلِ اعتراض
 قرار دیا۔ شاگرد کا مصرع تھا :

ہم نے نظارہ کیا ہے پس چلن اُن کا
 اُستاد نے اِس کو یوں بتا دیا :
 ہم نے نظارہ کیا ڈال کے چلن اُن کا
 مولانا نظم طلبا طبائی نے لکھا ہے :

"وہ الفاظ فارسی و عربی کے، جن میں معنوی تغیر ہو گیا ہے، اہل زبان
 اُس لفظ کو اور معنی میں بولتے ہیں، اہل ہند اور معنی میں بولنے لگے،
 مثلاً "محرم" کا لفظ اردو میں چھوٹے کپڑے کے معنی پر مستعمل ہے، یا "تردو"
 کا لفظ عربی میں آمد و رفت کے معنی پر ہے اور اردو میں فک و تشویش کے معنی
 پر بولتے ہیں، یا جیسے لفظ "خم" فارسی میں "تری" کے معنی پر ہے اور اردو میں
 "تر" کے معنی پر بولتے ہیں، یا جیسے لفظ "خفت" اردو میں شرمندگی کے

آئیر نے اس اصول کے ذیل میں لکھا تھا۔

"چلن، ذوقاری ہے، عربی، اُس کی طرف اضافت فارسی کی ہرگز جائز نہ ہوگی۔ جانِ حقیر
 کی نظیر اِس کے لیے مستند نہیں ہے۔ "تھرا" قلم ہے، شہر کا نام ہے، اُس کا ترجمہ عربی فارسی
 میں کیا ہوگا؟ لہذا ترکیبوں کے ساتھ بے تردّد باندھا جائے گا۔"

[مکتوب آئیرضائی بہ نام دکن شاہ جہاں پوری۔ مرقع ادب، جلد دوم]

معنوں پر مستقل ہے، اس قسم کے جمیع الفاظ کا تفتیح و تفتیس کرنا چاہیے اور ان سب الفاظ کو ہندی بھگنا چاہیے اور ترکیب فارسی یا عربی میں جس طرح ہندی الاصل لفظوں کو لانا غلط ہے، اسی طرح ان الفاظ کا استعمال بھی براہِ قلم کے لیے اضافت و مصطف فارسی وغیرہ میں ناجائز ہوگا۔ یعنی جس طرح کپڑہ رنگیں نہ بھگنا سیم نہیں، اُسی طرح ”عمرم رنگیں“ اور ”ہمٹم نم“ کہنا بھی ناجائز ہے، کیوں کہ کسرۃ تو صیغی فارسی کے لیے مخصوص ہے۔

ان تین قسموں کے علاوہ، ایسے لفظ بھی اردو میں بہت سے بولے جاتے ہیں کہ ہندیوں نے کسی عربی یا فارسی لفظ سے ان کو اشتقاق کر لیا ہے اور اہل زبان اُس اشتقاق سے بے خبر ہیں، مثلاً ”تموز“ تو فارسی لفظ ہے، اُس سے ہندیوں نے ”تمازت“، ”نزاکت“ کے قیاس پر مصدرِ عربی بنالیا۔ اسی طرح علالت، بھالت، ذہانت، لیاقت، شمولیت، بھاگت وغیرہ ہندیوں نے قیاس سے مصدر بنائے ہیں، ایسے الفاظ کا استعمال اکثر ناجائز ہے۔ اگر کوئی لفظ فصحا کی زبان پر چڑھ گیا ہے، جیسے ”بادشاہت“ تو اُسے ہندی لفظ بھگنا چاہیے، کسرۃ اضافی یا تو صیغی یا کسی اور ترکیب عربی فارسی کے ساتھ اُس کو استعمال کرنا درست نہیں۔ مثلاً جس طرح ”پیار و شاہت“ یہ عطف فارسی کہنا جائز نہیں، اُسی طرح ”امارت و بادشاہت“ کہنا بھی نادرست ہے۔

(معانی سخن، طبع چہارم، ص ۳۷-۳۸)

حضرت مولانا نے لکھا ہے، ”اردو الفاظ کے ساتھ فارسی اضافت بھی سراسر معیوب اور ناجائز ہے“ (ایضاً ص ۲۸) اور اس ذیل میں بہت سی مثالیں درج کی ہیں، ان میں یہ اشعار بھی ہیں،

روتا ہے وہ میں جو مری بزمِ مگوں میں پھولوں میں میرے پھل ہوئی بودفا کی ہے
 ملازم ہیں جو دنیا میں تو ہم سرکارِ ہستی کے سب تو خواہ میں جتنی میں ہم کو جامِ ملا ہے
 سیدنا شاہ "برقا" اور سفیل "کو مسیم" سمجھتے تھے، مگر ہندو ترکیبوں کو وہ بھی سمجھ
 نہیں سمجھتے تھے۔

"دو ہندی لفظوں یا ایک ہندی اور ایک غیر ہندی (عربی فارسی وغیرہ) کے
 ساتھ کسرۂ اضافت کا استعمال قلط ہے، لیکن فارسی عبارت میں، ایشیا کی
 حقیقت کے بیان میں، دونوں صورتیں جائز ہیں۔"
 (ترجمہ کوریاے لطافت ص ۳۵۹)

اسی سلسلے میں انھوں نے مزید لکھا ہے :

"موصوف کے آخر کا کسرۂ اضافت ہندی میں جائز نہیں، وہ فارسی سے
 خصوصیت رکھتا ہے۔ "اوس بسیار"، "پھول خوب" کہنا غلط ہے۔
 لیکن کسرۂ اضافت ایسے لفظ کے آخر استعمال کر سکتے ہیں جس کے لیے
 فارسی میں کوئی لفظ نہ ہو۔" (ایضاً ص ۲۹)

شعری زبان کے اثر سے واقف تیار صورت ہے کہ نظم میں عام طور پر ایسے مرکبات
 امنی لگتے ہیں اور مذاقِ سلیم پر ہلکا معلوم ہوتے ہیں جن کا ایک بجز فارسی یا عربی سے تعلق
 رکھتا ہو اور ایک بجز ہندی یا انگریزی کا ہو۔ ایسی ترکیبوں کو کہیں طنز کے طور پر ضرر استعمال
 کر لیا جاتا ہے، مزاحیہ شاعری میں بھی اُن کی کثرت ہو جاتی ہے، مگر غزل میں تو تربیت
 یافتہ ذوق اُن کو گوارا ہی نہیں کر پاتا، اور نظموں میں بھی محدود سطح پر بعض خاص قسم کی
 ترکیبیں ہی بارِ پاکستان ہیں۔ زبان کا جو مزاج اب تک رہا ہے، یہ اُس کا اثر ہے۔ زبان
 کا مزاج بڑی چیز ہے، وہ دیر میں بدلا کرتا ہے اور اردو میں ابھی تک ایسی مزاجی تبدیلی
 نہیں ہو پائی ہے۔ ————— یہ بات خاص طور پر ذہن میں رہنا چاہیے کہ مطلع

اضافہ کے قاعدوں کا تعلق فارسی سے ہے اور اب تک اُن کا وہ کردار اور انداز اُس طرح محفوظ ہے اور یہ بھی کہ اصول و قاعدہ کچھ بھی کہئے، لسانیات کا جو بھی فیصلہ ہو اور اصلاح پسند طبیعتیں زبان سے کچھ بھی کہیں، مگر اردو میں اب تک فارسی و عربی اور غیر فارسی و عربی الفاظ کو الگ الگ پہچانا جاتا ہے اور جب تک یہ صورت رہے گی، اُس وقت تک عطف و اضافہ کے خالص فارسی قاعدوں کا عمومی تعلق، عربی و فارسی الفاظ سے یا اُن سے ملتے جلتے مہندہ الفاظ ہی سے رہے گا۔

اس سلسلے میں دل چسپ بات یہ ہے کہ خود فارسی میں صورتِ مال ذرا مختلف ہے۔ ایرانی فارسی میں تو ظاہر ہے کہ عام ہندی الفاظ کے شامل ہونے کا سوال کیوں پیدا ہوتا، البتہ ہندوستان میں اس کی گنجائش تھی، اور گنجائش کیا، یوں کہیے کہ ایسا ہونا لازم تھا؛ اس بنا پر کہ یہاں فارسی زبان صرف شاعری کی زبان نہیں تھی وہ دفتری زبان تھی اور سارے کام اُس میں انجام دے جاتے تھے، اس لیے اُس میں ادبی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ، دوسری سطح پر اُس کھردرے پن کی نمود بھی لازم تھی جس کا تعلق کاروباری اسالیب بیان سے ہوا کرتا ہے اور جس کے اثر سے زبان میں کئی سطحیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ کاروباری پن اس کی ضمانت تھا کہ مقامی لفظوں کی کھپت اُس میں ہوتی رہے۔ جب ایک بار اجنبی لفظوں کے لیے راستہ کھل گیا تو رفتہ رفتہ اُس میں مقامی لفظوں کا اجنبی پن کم ہوتا گیا۔ یہ اجنبیت جس قدر کم ہوتی گئی، اُسی نسبت سے بہت سے مقامی لفظ، فارسی قاعدوں کی نسبتیں حاصل کر کے، فارسی تراکیب کے سانچوں میں ڈھلتے رہے۔ مگر اس کا اظہار ضروری ہے کہ آمیزش کا یہ عمل نثر میں فروغ پذیر نظر آتا ہے، نظم میں اُس کا تناسب کم ہے۔ نظم میں ہی منفی غزل اس سے محفوظ رہی، البتہ شنیویوں میں اور پھر قصائد میں اُن کی نمود ہوئی۔

[یہ تحفہ ان اصناف کے مزاجی تقاضوں کی بھی آئینہ داری کرتی ہے۔]

میں اس سلسلے میں مزید گفتگو سے پہلے، (ہندستانی) فارسی شریعہ ہندو رنگبوں کی کچھ مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں، تاکہ صورت حال کا صحیح طور پر اندازہ کیا جاسکے۔ یہ واضح کر دیا جائے کہ ان مثالوں کی حیثیت ”مشتمل نمونہ از خردارے کی سی ہے۔“

ذخیرۃ الزمائم (مستند شیخ فرید بھکزی، جلد اول، طبع کراچی، ۱۹۶۱ء)

از پرگنات ہندوستان (ص ۱۵) برچ کھنڈی فیل (۲۹) بصبت
شراب دپاتربازی (۲۹) ایام برسات (۳۸) بغرب برہمی (۳۱)
صدای کوڑہ (۵۵) کھری بے نمک (۹۰) کوڑہ چوب (۹۳) ڈیوری
عل نواب نور جہاں بیگم (۹۳) چوڑولی آں سالہ (۱۰۵) برگ
قبول (۱۱۰) پھاگل خامگی خود (۱۱۸) سکھپال سواری (۱۳۲) خرچ
بھٹیارہا (۱۳۵) جھروکہ دولت (۱۴۶) چوڑہ کوٹوالی (۱۳۹)
لباس سناسیاں (۱۵۳) درباب اکھاڑا (۲۲۹) عورت برہمن (۲۳۸)
کثرہ خاص و عام (۲۴۶)۔

جہانگیر نامہ (نویں کشور پریس ۱۸۹۸ء)

چودھری پرگنہ (۱۶) فضا جھروکہ (۳۷) پھول کشادہ گراں بہا (۷۰)

۷۔ اس کتاب ہے عام الفاظ کی بھی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں،

برڈولی سوارشد، (۵۵) درگدڑی (۶۲) پرگنات (۷۳)
نورات (۹۰) سنی (۱۱۱) درٹوکہ یا انداختہ (۱۳۳) پاتربازی (۱۳۶)
کمل (۱۴۰) چار گھڑی (۱۵۱) اخراجات (۱۵۷) دوپستہ (دوپٹا)
(۱۵۹) پنک (پنکھا) میکر (۱۷۱) درکٹھی نہادہ (۲۰۲) گھمار ہال میدہند
(۲۲۳) درزی (۲۲۳) ساگ (۷) سالن (۷)۔

ایام برسات (۱۱۰) شدتِ باد و بجکڑ (۱۱۱) گردِ پتو (۱۳۶) پایاں
گھاٹ (۱۵۲) زخمِ برچھا (۲۴۰)۔

دقائقِ نعمتِ غائبِ عالی (ذولِ کشورِ پریس، طبعِ چار دہم) ۱
کلیں بارگاہ (۱۹) بیڑہِ پان (۳۳) سفینہٴ ہی (۴۲) بیاضِ بیجک
(۴۵) فیلابِ ہتھیہ پول (۳۶) گولیِ افیون (۸۲) جلمِ تمباکو (۱۵۰)۔
دقائقِ عالمگیری (طبعِ میدی کن پور ۱۳۵۶ھ) ۱

ہجرۃٴ زمفرانی (۵) ڈالیِ انبہ (۶) جھروکۃٴ درشن (۶) بعدِ برآمدنی چہار
گھڑیِ روبر (۶) مالِ بیو پاریاں (۹) چند تھانِ محمودیِ زردوزی (۱۱)
تھادہاتِ فوجداری (۱۵) ڈالیِ نذر (۳۷) چھارنیِ دزدان (۳۶)
بیڑہٴ نصرتِ جنگ (۶۲)۔

رسائلِ طنز (ذولِ کشورِ پریس کان پور) ۱

تالِ آب (۳۱) ہجرۃٴ زرتار (۳۵) لطافتِ پلکۃٴ پٹنی (۶) کٹاوتہٴ درپٹا (۶)
برگِ پان (۳۶) پانگیِ درشان (۳۲) مہارتِ رود نگار (۶۴) جھروکۃٴ
مشرق (۶۳) درشنیابِ با اخلاص (۶۴) بدستِ ڈاک چوکی (۶۶) کیلہٴ
ہالِ صورت (۶۸) مہارتِ شمال (۷۱) ہمتنا لپیابِ رعد (۷۳) بدستک
دوبِ تال (۷۴) منڈلِ عزائمِ خوانی (۸۱) کلافتابِ خوش آواز (۱۴۲)
حرکاتِ پاترِ بازاں (۱۴۲) تخیلیِ دقت (۱۵۶)۔

مغل بادشاہوں خصوصاً اکبر نے بہت سی چیزوں کے ہندی نام برقرار رکھے تھے
اور یہ ناگزیر تھا اور اس طرح کے کچھ نام خود بھی رکھے تھے۔ ایسے سب لفظ تحریر و تفسیر
میں بہ اضافت و بغیر اضافت آتے ہی رہتے ہوں گے (یہ بھی ناگزیر تھا) اور ان کے اثرات
اپنا کام کرتے رہتے ہوں گے۔ میں صرف آئینِ اکبری کے ایک عنوان ”آئینِ فیضانِ دہ“ سے

ایس کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں :

دھرتی ، آندھ ، پیری ، گدھ پیری ، تُوہ نگر ، چرخ ، اُجیالی ،
دُنبلی ، گدیہ ، گدوتی ، پنچوہ ، چوراسی ، پٹ کچہ ، ثیا ، پاکر ،
کچی جنپ ، میکہ ڈنبر ، رن پیل ، گیتلی ، پارسے رنجن ، آکس ، گجپاک ،
کھنڈ ، جگاٹ ، جھنڈہ ، گج سوتی ، برگ ، بال ، پوت ، سسرہری ،
سینکا ڈھال ، تل بجر ، پنڈریک ، بامن ، انجن ، پھدنت ، سار بھوم ،
گندھرب مزاج ، سودر مزاج ، راجس مزاج ، منجولا ، پھنڈرکیا ،
موسل ۔

مختلف دفاتر میں بے شمار مقامی اصطلاحیں بھی استعمال کی جاتی تھیں ۔ زبان
پر ان سب کا اثر پڑنا ناگزیر تھا ۔ امیر خسرو ، قطبوری ، طغرا ، کلیم دیرہ کے یہاں نظم
میں بھی بہت سے دیسی مفردات اور مہندہ مرکبات مل جائیں گے ۔ مدعا یہ ہے کہ ہندوستانی
فارسی میں ہندی الفاظ اور مہندہ مرکبات عام طور پر پائے جاتے ہیں ۔ اس صورت حال
کے پیش نظر ہونا یہ چاہیے تھا کہ اردو میں ہندہ مرکبات کا وہی انداز برقرار رہتا کیوں کہ اردو
فارسی کی جانشین نہ ہی ، مگر اس کے بعد ادبی فرماں روائی اسی کے حصے میں آئی ؛ مگر بات
وہی ہے کہ جب یہ تبدیلی رونما ہوئی اُس وقت ایک تو زبان کا ابتدائی دور تھا ، دوسرے
یہ کہ فارسی یا انگریزی کی طرح دفتری زبان کی حیثیت اردو کو نہیں ملی ۔ اردو کو جو
حیثیت ملی ، اُس میں ادبیت شریک غالب تھی ۔ اس طرح وہ شروع ہی سے ایک دائرے
میں محصور رہی ۔ پھر بھی فارسی کے اُس عام انداز کے دو اثرات کسی نہ کسی حد تک اردو
میں کارفرما رہے : ایک تو یہ کہ قدیم شعر کے یہاں مہندہ مرکبات اسی خاص تعداد میں ملتے ہیں ۔
یہ صورت حال کسی نہ کسی حد تک غالب کے زمانے تک ، بل کہ ذرا بعد تک نظر آتی ہے ۔
لہٰذا کلیات اسمائیل پیر علی سے صرف دو مثالیں (ایک اعنان اور ایک ملتی جہلی کی جاتی ہیں ،

یہ مزور ہے کہ بہتر ترجیح اُن کا واسطہ کم ہونا گیا ہے۔ مگر جب دبستانِ مکھنوں کی روایت نے نمود حاصل کی تو یہ مسئلہ ٹوٹ گیا۔ دہلی میں شاعری کے مابین کم بنے، اور اُن پر مسلسل اُس سے بھی کم ہو پایا؛ اس لیے عام اثرات کے لیے گنجائش نکلتی رہی۔ مکھنوں میں شروع ہی سے زبان کو قواعد کی زنجیروں میں کسایا اور سخت گیری کی نگاہ پاسبانی کرتی رہی؛ اس لیے اُس طرح کی گنجائشوں کے لیے جگہ نہیں بن سکی، چوں کہ سیاسی حالات نے آخر میں مکھنوں کو مرکزیت اور طاقت بخش دی تھی، اور وہاں کی ٹھپانگلی ہوئی پابندیوں کو فروغ مل گیا تھا؛ اس لیے محدود فحری اور بھلی طرح کے لسانی اثرات اور آوازہ روی کے لیے اس کی گنجائش رہی ہی نہیں تھی کہ وہ نظم کی معیاری زبان میں آمیز ہو سکیں۔

دوسرے یہ کہ اساتذہ کے یہاں نثر میں آخر تک مہذب ترکیبیں بارپا کرتی رہیں اور یہ اُس طاقت ور روایت کے پایدار اثرات کا نتیجہ تھا۔ ان اساتذہ میں اتیرہینا فی جیسے استاد بھی شامل ہیں جو ”پس چلن“ کو غیر معتبر سمجھتے تھے۔ نو طرزِ مرتع خاص پرانی کتاب ہے پہلے اُس سے دو چار مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ نو طرزِ مرتع مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی پیش نظر ہے:

فرشہ چاندنی (میں ۱۰۱) شامیانہ چاندنی (۱۰۹) بوٹا کاری درنگ طرازی

(۱۳۳) سرجم برسات (۱۲۰) روشنی بھاڑ بندی (۱۴۵) کشن دولہا (۲۳۲)

خواجہ سرا یا بن ڈیوڑھی خاص محل (۳۲۲)۔

سرسید اور حالی بعد کے لوگوں میں سے ہیں، ان لوگوں کے یہاں اور ان کے معاصرین

دوسرا مورچہ، کالج کی سب سے اعلیٰ تعلیم

جس سے کچھ ہوتے مکشوف رموزِ پنجر (ص ۱۹۱)

نور و سایہ کی بڑھی ہم سب لگی

گو سیا ہم رنگ ہیں لیل و نہار (ص ۲۱۳)

کے یہاں بھی ایسی ترکیبوں کی بہتات ہے۔ بدلے ہوئے حالات اور ضرورت نے ان لوگوں کے یہاں انگریزی لفظوں کا تناسب بڑھا دیا ہے۔ مکاتیب سرسید، مرتبہ نشان حسین سے چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں :

چودھریانِ بلندور (ص ۲) قرضہ سہیٹی (۳۶) آمدنی چھا پانچا (۳۲)

چندہ مہری (۳۳) زیر چندہ مہری (۳۴) قواعد کیٹی (۸۰) ٹرسٹیان کالج

(۱۱۰) بذریعہ حق (۱۱۳) رپورٹ مابعد (۱۱۶) اخراجات لاٹری (۱۲۴)

مستحق اسکارشپ (۱۸۸) ڈگریات آرٹس (۲۰۲)۔

امیر مینائی کا ذکر ادرا پر آچکا ہے کہ وہ نظم میں پس پس ٹیک کو سمجھ نہیں سمجھتے تھے،

مکاتیب امیر مینائی، مرتبہ احسن اللہ خاں ثاقب (طبع دوم) سے بھی چند مثالیں پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے :

منقول سرگ (ص ۲۰۹) ہر واپسی ڈاک (۳۴۹) کمیٹی انتخاب (۳۴۹)

میران کمیٹی (۳۴۸) ارکان اسٹاف (۳۴۸) کارڈ اطلالی (۱۰۹) بصیفہ

رجسٹری (۳۳۱)۔

۳

ہم کو صفائی کے ساتھ یہ بان لینا چاہیے کہ اردو میں، مختلف اعتبارات سے، عربی و فارسی اور ہندی لفظوں کی تفریق باقی رہی اور اُس کے طاقت و اثرات چھائے ہوئے ہیں۔ زبان کا مزاج اچانک کسی ایسے مطالبے کو قبول نہیں کر سکتا جو اب تک کی ہمہ گیر روایت کے خلاف ہو۔ آپ ”در دگھٹنا“ یا ”اونٹ بے ٹکیل“ یا ”اونٹ و گھوڑا“ لکھیں یا بولیں، اور لسانی اصولوں کی منطق سے ان کو قابل قبول ٹھہرائیں، مگر زبان کا مزاج ان کو قبول نہیں کر پائے گا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ایسے اضافی و عطفی مرکبات کو مزاج

ادب کے حوالے کر دیا جائے اور یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ اسی مقصد سے بولے یا لکھے گئے ہیں۔

میں نے اس سے پہلے کئی بار یہ بات کہی ہے کہ ترکیب ہند بھائے خود غلط نہیں، ہاں اس سلسلے میں مذاقِ سلیم کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا ہوگا، مگر میں خود محسوس کرتا ہوں کہ یہ قول ناتمام ہے۔ تجربہ یہ ہوا ہے کہ اردو میں جو لفظ فارسی عربی لفظوں کے انداز پر بن گئے ہیں، یا وہ لفظ جن میں کچھ تصرف ہوا ہے مگر ان کا کینڈا وہی عربی فارسی والا ہے، ایسے لفظ بالعموم اضافی و مطنئی ہند مرکبات کے ایک جز یا دونوں اجزاء کے طور پر کھپ جایا کرتے ہیں۔ اصطلاحی الفاظ اور خاص خاص نام کسی بھی زبان کے ہوں، وہ بھی اسی ذیل میں آتے ہیں، مگر عام ہندی و انگریزی لفظ عموماً انہیں کھپ پاتے۔ انگریزوں نے، بے جوڑ اور اکثر مفہم خیر معلوم ہوتے ہیں۔

اس کے ساتھ یہ بھی ذہن میں رہے کہ بول چال کی زبان اور ادبی زبان میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے، اور یہ کہ اردو میں یہ فرق کچھ زیادہ ہے، اس لیے یہ لازم نہیں کہ جو ترکیب بول چال کا جز ہو، وہ ادبی زبان میں بھی اُسی طرح کھپ سکے۔ اور یہ بھی بجزوری نہیں کہ جو ترکیب نثر میں جگہ پاسکتی ہو، وہ نظم میں بھی اپنی جگہ بنا سکے۔ کچھ دنوں سے اردو میں یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ نظم کی زبان کو بول چال کی زبان سے قریب تر لایا جائے، مگر آج کل یہ کوشش افراط و تفریط کے پیر میں آگئی ہے۔ اگر اسی کوششیں

لے ایک فلم آئی تھی منورجن، اُس میں مکالمہ نویس نے ”محنت چوبیس“ قسم کی بہت سی ترکیبیں استعمال کی تھیں، جو ایک جعلی نواب کی گفتگو کا جز تھیں۔ مکالمہ نویس کے سامنے یہ پہلو تھا کہ ”نواب صاحب“ اُس معاشرت اور زبان کے متعلق بہت کچھ سُسنے کے گنہگار ضرور ہیں، مگر اُن سے واقف نہیں۔ دیکھنے والوں کو یاد ہو گا کہ ایسی ترکیبوں نے اُس فلم میں منہر کو کس کس طرح نمایاں کیا تھا۔

وسیع پیمانے پر بار آور ہو سکیں کہ مفرد الفاظ کی حد تک نظم کی زبان، بول چال کی زبان سے کچھ اور قریب آجائے [ابتدائی کوششیں عموماً مفرد الفاظ تک محدود رہتی ہیں] تو اس کا امکان ہے کہ دوسرا مرحلہ برائے کر ایسے کچھ مرکبات بھی نظم کی زبان میں دخل پاسکیں۔

بہر حال، اس وقت یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ بہت سی ایسی مہند ترکیبیں جو شریں مناسب معلوم ہوتی ہیں، یہ ضروری نہیں کہ وہ نظم کو بھی اُسی طرح راس آسکیں۔ اردو کا تو یہ حال ہے کہ بعض ایسے فارسی لفظ جو فارسی میں متعل ہیں، مگر کسی دیکھی سے وہ ہندی الاصل معلوم ہوتے ہیں؛ اردو نے اُن کو بھی ترکیب کی صورت میں قبول نہیں کیا ہے۔ مثلاً ایک لفظ ہے ”جنگل“ تیر فارسی میں موجود ہے (بہارِ عجم) مگر اس کی بناوٹ اس کے ہندی ہونے کا شبہ ذہن میں پیدا کرتی ہے؛ یہی دیکھ کر اگر کوئی شخص مثلاً ”غارِ جنگل“ لکھ دے تو بڑا عجیب مرکب معلوم ہوگا۔ یا جیسے ایک لفظ ہے ”چو ترہ“ یہ برہان قاطع میں موجود ہے، مگر ”جنگل“ کی طرح یہ بھی ویسی دکھائی پڑتا ہے؛ اب ”چو ترہ بلند“ لکھیے اور اُس پر عاشی بھی لکھ دیجیے، مگر ذہن و ذوق دونوں کی آنکھوں میں ناپسندیدگی کی چمک برقرار رہے گی۔

ذیل میں ترکیب مہند سے متعلق ضروری قاعدوں کو لکھا جاتا ہے۔ یہ ملحوظ خاطر رہے کہ ایسے قاعدوں میں قطعیت نہیں ہو سکتی۔ بہت سے مقامات پر مذاقِ سلیم اپنے طور پر فیصلہ کیا کرتا ہے اور کچھ مقامات پر استثنا کا قاعدہ حاوی معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی ایک ضابطہ ہے۔ اس کے باوجود، قواعد کی ضرورت اور اہمیت برقرار رہتی ہے، کیوں کہ اکثر صورتوں میں اُن کے بغیر فکر و نظر کو سمجھنا سہل نہیں مل پاتا اور اُن کی عدم موجودگی میں عموماً انتشار کو بڑھاوا ملتا ہے۔ مناسب قواعد، اکثر بیچ فیصلوں میں معاون ہوتے ہیں اور اُن کے لیے منطقی بنیادوں کا کام دیتے ہیں۔

غیر عطفی و اضافی مرکبات :

غیر عطفی و اضافی مرکبات اردو میں بہت ہیں۔ ہندی میں ترکیب کا یہ سارہ قاعدہ موجود ہے کہ دو لفظوں کو پہلو بہ پہلو رکھ دیا جائے۔ ایسے مرکبات کہیں تو (ہندی کے انداز پر) غیر فارسی عربی اجزا پر مشتمل ہوتے ہیں، جیسے، چڑیا گھر، جو رنگی، موتی چوک، کسان بھاد وغیرہ۔ اور کہیں اُن کا ایک جز فارسی یا عربی ہوتا ہے، جیسے، توتا چشم، ٹکڑا گدا، عجائب گھر، امن سبھا، ڈاک خانہ، لنگر خانہ، چور دروازہ، امام باڑا، جیل خانہ، کٹھنٹلا، منہ زور وغیرہ۔

ایسے مرکبات بھی اردو میں ابھی خاص تعداد میں ہیں جو اسم اور فعل پر مشتمل ہیں اور دونوں اجزا غیر عربی فارسی ہیں، جیسے، تیس مار، لٹھ مار، منہ پھٹ، ہتھ پھٹ، دس بھری، من چلا، من مانی، منہ بولا، دانت کاٹی، آنکھ پھوڑا (وغیرہ)؛ اس لیے یہ ہونا ہی تھا کہ ان کے انداز پر ایسے مرکبات بھی بنیں (الف) جن کا ایک جز یعنی فعل، اردو (یا ہندی) سے تعلق رکھتا ہو اور دوسرا جز یعنی اسم عربی یا فارسی کا ہو۔ مختلف افعال سے مرکب اس قماش کے بے شمار مرکبات اردو میں پائے جاتے ہیں، مثلاً، دُم کٹا، دل بٹلا، دل لگی، کفر توڑ وغیرہ، اور (ب) ایسے مرکبات بھی بنیں جن میں فارسی افعال بہ طور ایک جز کے آئیں، جیسے، بکھڑا پوش، گیر داپوش، ہسنی خیز، تھوک فروش، گھڑی ساز، کناری بان، ٹھنڈا، چال باز، ٹھنڈا باز، پتہ باز، دھوکے باز، سمجھ دار، لچک دار، پھول دار، چوٹی دار، ٹھیکے دار، بوٹے دار، ڈگری یافتہ، رجسٹری شدہ وغیرہ۔

وہ مرکبات بھی اسی ذیل میں آتے ہیں جن میں فارسی افعال کسی صنف کے ساتھ آئے ہوں، جیسے، اُٹھائی گیرا، صبح خیز یا۔ یا ایسے مرکبات جن کے دونوں اجزا عربی

فارسی کے ہیں مگر جنے ہیں وہ اردو کے انداز پر اور یہیں کی پیداوار ہیں، جیسے، عمر قید۔
 یا سے نسبتی و یا سے مصدری کا اضافہ بھی اسی طرح ہوا ہے، جیسے، لٹہ بازی، گھڑی ساز،
 تھانے داری وغیرہ۔ اور ایسے مرکبات بھی بڑی تعداد میں ہیں جو فارسی کے سابقوں
 یا لاحقوں کی ترکیب سے بنے ہیں، جیسے، بے ڈھب، بے کل، گاڑی بان، بے جواز،
 بے ڈھنگا، کاری گرو وغیرہ۔

یہاں ترکیب کے سب قاعدوں کو گنا نامقصود نہیں، صرف اہم قاعدوں کا ذکر
 کیا گیا ہے۔ غیر مصطفیٰ و اضافی مرکبات کا چلن اردو میں عام ہے، اور اُن میں بہت
 مرکبات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، ایسے سارے مرکبات بالکل
 صحیح ہیں اور زبان کا اہم جز ہیں۔ معتد و اساتذہ نے اس قبیل کے اکثر بہت مرکبات
 کو غیر معتبر قرار دیا ہے، "سنسن خیز" اور "بھوار" جیسے مرکبات کو اب بھی کچھ حضرات
 ناقابل قبول قرار دینے میں تکلف یا تاسی سے کام لینا پسند نہیں کرتے، مگر اطمینان کی
 بات یہ ہے کہ ایسے فتوؤں کو کچھ زیادہ قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ بعض افراد کا جو بھی
 طرز عمل رہا ہو، اکثریت نے ایسے مرکبات کو کبھی غیر معتبر نہیں سمجھا۔ ایسے مرکبات نظم و نثر
 دونوں میں بہ کثرت ملتے ہیں۔ نثر میں زیادہ اور نظم میں کم، اور اس کی بیش پر تعجب نہیں
 کرنا چاہیے۔ نثر میں زیادہ وسعت ہوتی ہے اور اُسی نسبت سے مختلف عناصر کو جذب کرنے
 اور گوارا بنالینے کی صلاحیت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ نظم میں بھی مشنویات و قصائد اور عام
 منظومات کے مقابلے میں غزلوں میں اُن کا تناسب کم ہوگا، اور اس پر بھی حیرت نہیں
 ہونا چاہیے۔ غزل کا ذخیرۃ الفاظ عام منظومات کے مقابلے میں شرمعاری سے محدود رہا ہے۔
 یہ روایت بھی ہے اور اس صنف سخن کا تقاضا بھی۔

یہ واضح کر دیا جائے کہ یہ صورت اُن مرکبات کی ہے جنہوں نے دو اسموں سے یا
 ایک اسم اور ایک فعل سے ترکیب پائی ہو۔ فارسی کے سابقوں یا لاحقوں سے بنے ہوئے

اکثر مرکبات غزلوں میں بھی اُسی طرح ملیں گے جس طرح عام نظموں میں یا نثر میں ملتے ہیں۔ بہر حال قاعدہ یہ ہوگا کہ ہر طرح کے غیر عطفی اضافی مرکبات بالکل محکم ہیں اور اُن کو بے تکلف استعمال کیا جاسکتا ہے، نثر میں بھی اور نظم میں بھی۔ غزلوں میں بھی اُن کو بار ملنا چاہیے، مگر غزل کے مزاج اور انداز کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُن کا انتخاب ہونا چاہیے۔ غزل کے متعلق یہ بات خاص طور پر ذہن میں رہنا چاہیے کہ جب تک اُس میں مجموعی طور پر مزاجی تبدیلی نہ ہو، اُس وقت تک اُس کی زبان میں اس طرح کے تغیرات اپنی جگہ نہیں بنائیں گے۔ اردو تو غیر بڑی حد تک ادبی زبان رہی ہے؛ فارسی کو کاروباری زبان کی حیثیت بھی حاصل رہی ہے اور اُس کے باوجود فارسی غزل میں ہند مرکبات کا اُس طرح عمل دخل نہیں ہو پایا جس طرح فارسی نثر میں اور اُس کے بعد مشنویات اور قصائد میں اُن کی پیوندکاری ہوئی ہے۔

اضافی و عطفی مرکبات :

ترکیب ہند میں اہل مسئلہ اضافی و عطفی مرکبات کا ہے۔ غیر عطفی اضافی مرکبات کی طرح، عطفی اضافی مرکبات کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ مطلقاً قابل قبول ہیں۔ خاص خاص صورتوں کے علاوہ، عام صورتوں میں ایسے اکثر مرکبات قابل قبول نہیں معلوم ہوتے اور فی الوقت اس پر اصرار بھی نہیں کرنا چاہیے کہ ایسے سب مرکبات کو لازماً قابل قبول ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل قاعدوں کو پیش نظر رکھنا مفید ہوگا۔

①

بہت سے لفظ ایسے ہیں جو عربی فارسی لفظوں کے انداز پر بن گئے ہیں اور صورت شکل کے لحاظ سے عین عین عربی فارسی کے لفظ معلوم ہوتے ہیں، مگر میں یہ ہیں کہ پیداوار، جیسے، شکریہ، رہائش، مرن، یگانگت، جنات وغیرہ؛ ایسے سب

لفظوں کو عطفی و اضافی ترکیبوں کے ساتھ بے تکلف استعمال کیا جاسکتا ہے اور کسی طرح کی تفصیص یا تحدید نہیں کی جاسکتی۔ (بعض اساتذہ نے ایسے الفاظ کے متعلق جو بھی کہا ہو یا کہیں، مگر ایسے سب لفظ بالکل صحیح اور فصیح ہیں) جیسے، خذائے مرغن، یوم پیدائش، شکرِ احباب، جاے ریش، بہت دیگناگت وغیرہ۔ مثلاً،

کس کی پریاں، شہر جنات کو بھی آٹھ بہر

ہے یہ حسرت کہ سب کو چہ جاناں ہوتا (ناسخ)

اعتقادِ یگناگت بھی تھا اشرارِ موانست بھی تھا

(مصفی، شہزادِ بحرِ بہت)

(۲)

اسی طرح بہت سے عربی فارسی لفظوں میں مختلف قسم کے تصرّفات نے لہجہ بنگالی ہے۔ کہیں تو نئے معنی کا اضافہ ہو گیا ہے، جیسے، محرم، آبِ رواں، تکرار، عادی، راشی، شادی، مشکور وغیرہ، اور کہیں صورت میں ذرا سی ترمیم ہو گئی ہے، جیسے، غلطی، دانگی، جواہرات وغیرہ، ایسے سب لفظ بھی بالکل صحیح اور فصیح ہیں اور ان کو عربی فارسی الفاظ کی طرح عطفی و اضافی مرکبات کا جز بنایا جاسکتا ہے۔ ایسے لفظ مرکب کا ایک جُز بھی ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں اجزا اسی قبیل کے ہوں، جیسے،

غلطی ہائے مضامین مت پوچھ لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

(قالب)

ہاتھ کیوں رکھتے ہو مہنہ پر مرے مطلب کیا باعثِ بخش و تکرار کہوں یا نہ کہوں

(دارالم)

کسی کی محرمِ آبِ رواں وہ یاد آئی حباب کے جو برابر کہیں حباب آیا

(آتش)

شب شادی کی دھوم کی کیا بات روزِ روشن تھی روشنی سے رات (میر)



عربی فارسی کے جن لفظوں کے آخر میں ہائے عطفی ہوتی ہے ؛ محرف صورت میں وہ "ہ" سے بدل جاتی ہے ، جیسے "پیادہ" اور "پیائے میں" یہ کہا گیا ہے کہ ایسے لفظوں کو محرف صورت میں یہ ترکیب اضافی و عطفی نہیں لانا چاہیے ، مثلاً "آبِ واد" تو فارسی ترکیب ہے ، مگر "آب وادے" اُس کی مہندہ صورت ہے اور اس لیے غیر مستبر ہے ۔ اسی اکثر صورتوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ عطفی ترکیب تو عموماً غیر مناسب نہیں معلوم ہوتی ، مثلاً یہ مصرع :

ناراں ! تجھے فکر آبِ دوائے کی ہے

اس میں آبِ دوائے "کس طرح اجنبی نہیں معلوم ہوتا، ذمہ دارانہ سماعنا۔ اور ایسی بہت مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، مثلاً،

سائل کو نان دملوے کے اونٹوں کی وی قطار (سوا)

رات کو دیکھوں ہوں میں جب شمع و پروانے میں دھوم (سودا)

البتہ اضافی ترکیب عموماً غیر مناسب معلوم ہوتی ہے، جیسے:

کوسوں کیا تشنگی زمانے کو کہ نہیں جاے سراٹھانے کو (ذوق)

اس میں "تنگ زمانے" اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ یہی صورتِ نشر میں پیش آتی ہے۔

اس لیے ایسے عطفی مرکبات کو تو مطلقاً درست ماننا چاہیے اور قابلِ قبول سمجھنا

چاہیے، ہاں، ایسے اضافی ترکیبیں بالعموم ناقابل قبول ٹھہریں گی، جیسے میسرکایہ

مصرع: مگر باز پہ بجھے تیر عشقِ خرد سالوں کو۔ (کلیاتِ مرثیہ آسی ص ۳۰ نم)۔

یہ مرض کر دیا جائے کہ ایسی صورتوں میں عموماً مطلقاً تریکیب ہی سے

سابقہ پر مبنی ہے۔

(۴)

یہ کہا گیا ہے کہ ہائے متغنی پر ختم ہونے والے مفرد لفظوں میں تو قافیے کی ضرورت سے "ہ کو الف سے بدل دینا درست ہے، مگر ترکیب کی صورت میں یہ تبدیلی جائز نہیں۔ یعنی نظارہ "کو" ہمارا" اور "گوارا" کے قافیے میں "نظارا" لکھنا تو ٹھیک ہے، مگر "لطف نظارا" نہیں لکھا جائے گا، کیوں کہ اس صورت میں یہ مہذب و مرکب ہے۔ مگر یہ پابندی قطعاً غیر ضروری ہے، کیونکہ "لطف نظارہ" اور "لطف نظارا" میں کچھ فرق نہیں۔ اردو میں ہائے متغنی ویسے بھی اکثر الف کی طرح تلفظ میں آتی ہے، مثلاً :

اداسے دیکھ لو، جاتا رہے گلہ دل کا بس اک نگاہ پٹھرا ہے فیصلہ دل کا
اس میں "فیصلہ" اور "گلہ" "تلفظ میں" فیصلہ" اور "نگلا" بن جاتے ہیں اور یہ صورت عام ہے۔ بات یہ ہے کہ ہائے متغنی فارسی کی خاص چیز ہے، اردو میں اس کی جگہ اصل حرف الف ہے؛ اس لیے اکثر صورتوں میں ہائے متغنی، الف کی آواز کو قبول کر لیتی ہے۔ مختصر یہ کہ قافیے کی ضرورت سے "لطف نظارا" اور "کیف جلوہ قسم کی ترکیبوں کو بالکل صحیح ماننا چاہیے، مثلاً :

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زبرد زبر اب دد دیکھو گے کہیں لطف شبانا ہرگز
بزم ماتم تو نہیں، بزم سخن ہے حالی یاں مناسب نہیں رورو کے رُلانا ہرگز
(حالی)

دیا قمری کو مصرعِ نالہ مصرعِ قدسِ رو پر بالا (ذوق)
گنائیں گے ہم آزادی گلشن کا ترانا بے کار ہے اسے برقی بلا، ہم کو ڈرانا
کافی ہے بہت دستِ صحرائے زمانا ہم اور کہیں ڈھونڈ نکالیں گے ٹھکانا
(اقبال سیل)

(۵)

ہندی وغیرہ کے اعلام کے ساتھ عطفی اضافی ترکیبوں کو اساتذہ نے بھی رد کر رکھا ہے اور یہی ٹھیک بھی ہے۔ ہاں اس کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ عام طور پر ایسے خاص ناموں کو مرکب کے ایک جز کے طور پر آنا چاہیے (مستثنیات سے بحث نہیں) ، جیسے: سمیت کاشی، مہج بنارس، سروقدان گوکل وغیرہ۔

ع : سمیت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل

ع : گھر میں اشتنان کو بس سروقدان گوکل

ع : فریب نفس ہے، سینا کہاں آغوشِ راون میں

(۶)

ہندی وانگریزی کے ایسے لفظ جو عام طور پر استعمال میں آتے رہتے ہیں، اور اُن میں سے اکثر کے بدل موجود نہیں، جیسے، اسٹیشن، سول سروس، چندا، ممبری، کبار، ڈولی، ڈگری، سڑک وغیرہ، یا ہسینون اور موسموں کے نام، یا اسمائے جنس وغیرہ، ایسے لفظوں کو بھی اضافی و عطفی مرکبات کا جز بنایا جاسکتا ہے۔ جیسے تاج کا یہ مصرع، باب امام باڑہ سلطان خاص دعام۔ یا جیسے سودا کا یہ مصرع، کیا قصہ جس دم سوئے نیل گاؤ، یا جیسے تیر کا یہ مصرع، اب جو آیا ہے موسمِ برسات۔ ہاں ایسے لفظوں کو بھی عطفی و اضافی مرکبات کے ایک جز کی حیثیت سے لایا جاسکتا ہے۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ شق ۱۵ میں جن مرکبات کا ذکر کیا گیا ہے، اُن میں اور ان میں اصولاً تو کچھ فرق نہیں، مگر استعمال اس کا خاص طور پر لحاظ رکھنا ہو گا کہ ان مرکبات کو نظم میں احتیاط کے ساتھ لایا جائے، یعنی مقتضائے کلام کا ہر طور خاص لحاظ رکھا جائے، اور اس احتیاط کی وجہ یہ ہے کہ ایسے مرکبات میں شامل ہندی وانگریزی اجزاء، خاص ناموں کے بجائے خاص الفاظ (اسمائے جنس و میرہ) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور یہ تو سمجھی جانتے ہیں کہ احتیاط و پابندی

سے مختلف چیز ہے۔ دونوں کے تقاضے بھی مختلف ہیں اور دائرہ اثر بھی، محض بحث کی خاطر اس فرق کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

(۷)

ایسے لفظ بھی ہیں جو شکل صورت سے فارسی الاصل معلوم ہوتے ہیں یا یوں کہیے کہ فارسی یا عربی الفاظ جیسے لگتے ہیں، ایسے لفظوں کو بھی مطلقاً و اضافی ترتیب میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ جیسے ایک لفظ ہے ”چلمن“، اس کی اصل جو بھی ہو، مگر یہ معلوم ہوتا ہے فارسی لفظوں جیسا، یہی وجہ ہے کہ ”پس چلمن“ قطعاً اجنبی نہیں لگتا۔ مستقل بھی رہا ہے،

نیم جلوے کو بھی وہ کہتے ہیں اب بے پردگی
جہم کا ہیبت یہ کس کا مرب چلمن ہو گیا (مومن)
یہ کاہ رُبا سے بھی ہیں کم اکے کشیش دل
مذکور کچھ ایسا پس چلمن ہے ہمارا (۷)

یا جیسے لفظ ”کلس“، یہ لفظ سودا کے ایک مصرعے میں اس طرح آیا ہے کہ اُس کے غیر فارسی ہونے کا احساس ہی نہیں ہوتا، چ، کہ رکھا ہے کلس گنبد دستار اُسے۔ یا جیسے ایک لفظ ہے ”رومان“ کہ یہ ظاہر عربی نژاد معلوم ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص ”کیف رومان“ لکھے تو یہ نہایت گوارا ترکیب ہوگی۔ ایسے لفظوں کو مطلقاً و اضافی ترتیب کے اجزا کی حیثیت سے قطعاً قابل قبول سمجھنا چاہیے۔ ہاں ایسے کچھ مرکبات غزلوں میں بھی کھپ سکتے ہیں، مثلاً،

دیکھو دستار بستنی ساقی سرشار کی _____ کُسل گئی ہیں آج آنکھیں زرخس ہیار کی
پریوں کے ہے لباسِ بستی کی کیا بہار _____ آراہیشِ بستی کی ہیں حُسنِ باغ میں
کچھ ہے شعرِ سخنِ فہم کے لیے اشرف _____ و گردِ زمزمہ واہ واہ سے کیا کام

آج کل نظم کا انداز بدل رہا ہے اور اُس کے ساتھ زبان و بیان میں بھی کچھ کچھ تبدیلیاں آ رہی ہیں، موضوعات کے لحاظ سے کثرتِ دراپن بھی اپنی جگہ بنا رہا ہے، اور اس طرح فی الحال محدود ہیئانے پر ہیں، مگر اس کی گنجائش نکلتی دکھائی دیتی ہے کہ کچھ اور ہندی الفاظ بھی ترکیبِ فارسی کے ساتھ پہلے کی طرح بے جواز معلوم نہ ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے الفاظ کی تعداد ابھی کم سے کم ہے، مگر اس کا امکان ضرور ہے کہ زبان و اسالیب کی تبدیلیاں اور نئے نئے موضوعات کے تقاضے، اس تعداد میں قابلِ لحاظ اضافہ کریں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض الفاظ خاص خاص مقامات پر اس طرح ترکیب کا جز نہیں کہ وہاں خوش مذاقی کو اجنبیت کا احساس ہی نہ ہو، مثلاً ایک نئے شاعر کی ایک نظم کے پہلے دو مصرعے ہیں :

یہ کیسے روز و شب ہیں جو بہو میں تیرتے گئے
گزرتے وقت کی پہچان اک سوچِ لہو بھری (عنبر سعیدی)
ایسے اضافوں کو قبول کرنے کے لیے ذہن کو آمادہ رکھنا چاہیے، البتہ بد مذاقی کو راہ
نہیں ملنا چاہیے اور ”سب ٹھیک ہے“ اور ”سب جائز ہے“ جیسے گمراہ کن
تصورات کو ذہن پر عادی نہیں ہونے دینا چاہیے۔

(۸)

قدما اور متوطنیں کے یہاں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن میں حرفِ عطف
دو جملوں یا دو ٹکڑوں کے درمیان آیا ہے، مثلاً :
مُل گراں گوش و چمن صورتِ جیرانی ہے _____ کس گلستان میں ہیں حکمِ غزل خوانی ہے
یہ جو ر و جو رکش تھے کہاں آگے مشق میں _____ تجھ سے جفا و تیر سے رسمِ وفا جلی
سیحے میں ہراناں و پہلو میں دل آتش _____ دھڑکے ہے پڑا دل کہ نہ ہوشِ متعل آتش
ع : دل مدحی و دیدہ بنا مدعا علیہ۔

ایسے بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا، اس لیے عطف کی اس صورت کو قابل قبول تو سمجھنا چاہیے، مگر اب اس کا خیال ضرور رکھنا چاہیے کہ ناگوار صورت پیدا نہ ہو، مثلاً :

جوں ابر بے کسا نہ روتے اٹھے میں گھر سے برے بے عشق اپنے دیوار سے دور سے
اپنے کوچے میں نفاق جس کی سُنو ہون رہا وہ جگر سوختہ وسیعہ جلا میں ہی ہوں
دونوں شعروں میں نہایت ناگوار صورت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کو قابل قبول نہیں کہا جاسکتا۔ اس سے زیادہ ناگوار صورت اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب دو کے بجائے اور آجائے، جیسے :

اب ہمارا آپ کا ہے تذکرہ ذکرِ بھمنوں اور لیلیا ہو گیا

(۹)

ایسے عطفی مرکبات بھی دیکھنے میں آئے ہیں جن کا ایک جز غیر عربی فارسی ہوتا ہے ایسے بہت سے مرکبات قابل قبول ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اضافت کے مقابلے میں عطف کے اندر تہنید کو قبول کرنے کی صلاحیت کچھ زیادہ ہوتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اکثر عطفی مرکبات، بے جوڑ اجزاء کا مجموعہ نہیں معلوم ہوتے، مثلاً :

ع لگیں اُس کو نہ جب تک راج و مزدور

ع کوئی رہ گیا موش و مینڈک کا زور

ع چھٹیں گر لاکھ اُس پر چرخِ دیوان

ایسے عطفی مرکبات میں ہندی اجزاء کو ایک جز کے طور پر قابل قبول معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہندی کے بعض اجزاء یا انگریزی کے کچھ لفظ ایسے ہوں جو مرکب کے دونوں اجزاء کے طور پر آسکیں، مگر یہ خاص صورت ہوگی، عام طور پر ایسا کم ہوگا۔ قواعد کی بنیاد مستثنیات پر نہیں رکھی جاتی اور قواعد بنانے کا یہ مطلب بھی نہیں ہوتا

کو مستثنیات سے انکار کر دیا جائے۔

ہاں ، یہ بات ذہن میں رہنا چاہیے کہ غیر عربی فارسی الفاظ کے ٹکڑے اکثر دواو عطف کے بغیر آتے ہیں اور فصاحت کلام کا عموماً تقاضا بھی یہی ہوا کرتا ہے ، جیسے :
پھول پھل ، ڈاک تار ، خط ہتر ، ہاتھ پیر ، دانہ پانی ، دن رات وغیرہ ۔ ایسے بے شمار ٹکڑے ملیں گے اور یہ اس طرح آتے ہیں ۔ اگر ان کے درمیان عطف کا دواو لایا جائے ، یعنی ”پھول و پھل“ یا ”دن و رات“ یا ”ڈاک و تار“ کہا جائے یا لکھا جائے تو فصاحت کلام پر حرف آجائے گا۔

یہ وضاحت پہلے کی جا چکی ہے اور اب اُس کی تکرار کی جاتی ہے کہ اب تک زبان کا جو انداز رہا ہے ، اُس میں اس کی گنہائش تو ہے کہ ہندی یا انگریزی کے خاص خاص لفظوں کو اضافی ترکیبوں کے ایک جُڑ کے طور پر لایا جاسکے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض مرکبات ایسے ہی دونوں اجزا پر مشتمل ہوں ، جیسے ، ممبران پارلی منٹ ، اجراءے ڈگری ، کاغذات اپیل ، ارکان کمیٹی ، ہڈیہ و جیشری ، انتظام جیل (نادر کا کوردی کا معرہ یاد آیا ، کہ اس نظم و نسق سے انتظام جیل اچھا ہے) وغیرہ ؛ مگر ایسے مرکبات کا دائرہ محدود رہے گا۔ خاص خاص لفظوں کے علاوہ ، عام لفظوں کی یہ صورت نہیں ہوگی ، یعنی گوشت بھینس ، دودھ بکری ، انجن ریل ، در و گشتا ، اونٹ بے نکیل جیسے مرکبات قابل قبول نہیں ٹھہریں گے۔ البتہ ظرافت یا تسمیہ کی ضرورتوں کے کام آسکتے ہیں ۛ

سقوطِ حروفِ علت

لفظ کے آخر سے، خواہ وہ کسی زبان کا ہو، حروفِ علت کا دنا یا گنا، اساتذہ متقدمین کے نزدیک مطلقاً معیوب نہیں تھا۔ بیش تر اساتذہ متوسطین کا بھی یہی مسلک تھا۔ یہ مراعت ضروری ہے کہ حروفِ علت میں سے جی کا دنا و عام تھا۔ اسم و فعل، حرف، ہر لفظ کے آخر سے حسبِ ضرورت اس کا سقوط روا رکھا جاتا تھا۔ حروفِ مغیرہ حروفِ ربط اور ضمیروں کے آخر سے الف اور واو کو بھی بلا تکلف گرا دیتے تھے۔ البتہ مفرد اسموں کے آخر سے واو اور فعلوں کے آخر سے الف کا گرانا اس قدر عام نہیں تھا، اس میں کچھ احتیاط کی جاتی تھی، اگرچہ مثالیں ملتی ہیں اور اچھی خاصی تعداد میں ملتی ہیں، مگر اس کو معیوب بھی سمجھا گیا ہے۔

نظم میں، گفتگو کی طرح، حروفِ علت کا ادب کرنا مکنا عام بات ہے۔ اس کو زبان کا خاصہ سمجھنا چاہیے۔ حروفِ علت کا کردار، حروفِ معج سے مختلف ہوتا ہے، اور وہ اس طرح کہ آوازوں کو مختلف سطح پر اور مختلف انداز سے کہینا، بل ہریتا اور گرا کر اٹھانا، ان کا خاص عمل ہے؛ اور اس طرح یہ لازم ہے کہ مختلف مقامات پر، آہنگ کے لحاظ سے، آواز کی کشش میں گراؤ یا تقلیل نمایاں ہو۔ ضرورت شعری کا اور شعری آہنگ کے

تقاضوں کا اس میں اضافہ کر لیجیے۔ اس طرح یہ ضروری ہے کہ گفتگو میں حروفِ علت کی محسوس میں کہیں کمی ہو، کہیں بیشی اور کہیں حرفِ علت کی آواز کسی دوسری آواز میں اس طرح جذب ہو جائے کہ وہاں پر اُس کا وجود ہی مخلوط ہو کر رہ جائے۔ جہاں تک شعری آہنگ کا تعلق ہے، تو حروفِ علت کا دینا، کبھی تو شعری روانی پر بالکل اثر انداز نہیں ہوتا اور یہ وہ مقامات ہوتے ہیں جہاں گفتگو میں بھی وہی کیفیت نمایاں رہتی ہے۔ یعنی عام بول چال میں، جن الفاظ کے اجزایا آخری جز، دب کر نکلتے ہیں؛ شعر میں بھی وہ اُسی طرح اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ جن مقامات پر شعری ضرورتیں، آواز کو معمول کے مقابلے میں کم کشش دار رکھنے پر مجبور ہوتی ہیں، وہاں روانی کلام ضرور مجروح ہو جاتی ہے، کہیں کم اور کہیں زیادہ۔ غالب نے صغیر بلگرامی کو ایک خط میں لکھا تھا،

”اے وہ لبِ ہلا کے رہ جانا ابھی کچھ بات کر نہیں آتی

بیموں حضرت! ابھی کچھ کی تھنائی کا دنیا غیر فصیح نہیں؟“ کچھ ابھی بات کر نہیں آتی“

کیا اس کا نام تبدیل نہیں؟ (غالب کی یاد پوری، ص ۵۶)

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صاحبِ نظر، حروفِ علت کے اس طرح دبنے کو جس سے فصاحتِ کلام پر حرف آجائے، کچھ اچھا نہیں سمجھتے تھے، اور اس ضمن میں عربی، فارسی، ہندی الفاظ کی آہستہ آہستہ کے پیشِ نظر نہیں رہتی تھی۔ غالب کے کلام میں عربی و فارسی الفاظ کے آخر سے یا سے معروف کے سقوط کی مثالیں موجود ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ حروفِ علت کے دبنے کو مطلقاً غلط نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اصل مقصد فصاحتِ کلام کا باقی رہنا تھا۔ جہاں اُس پر اثر پڑے، اُس کو محض نظر خیال کیا جاتا تھا۔ اس سے اتفاق کیا جائے گا کہ صحیح و غلط یا یوں کہیے کہ مناسب و غیر مناسب کا یہ معیار نہایت صحیح تھا۔

یہ بات ذہن میں رہنا چاہیے کہ زبان میں پہلے کی بہت اہمیت ہے اور اُس۔

کے تقاضوں کے تحت، آواز کے انارچڑھاؤ کی لہریں بچ داب کمانی رہتی ہیں۔
 شعر میں لہجہ کی کچھ زیادہ اہمیت ہے۔ لفظوں کی صحیح ترتیب اس کے لیے بنیادی
 حیثیت رکھتی ہے اور اس صحیح ترتیب الفاظ کو، پڑھتے وقت اگر صحیح لہجہ کی نفاذ
 نصیب ہو جائے؛ تو خواندگی کی تکمیل ہو جاتی ہے اور اس تکمیل کی مدد سے، معنوی
 رنگ کے عکس، مناسب طور پر اور مناسب مقامات پر جھک اٹھتے ہیں۔ آواز کا
 انارچڑھاؤ بہت سے مقامات پر حروفِ علت کی کشش دار اور کشش آفریں لہریں
 کا سہارا لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعر میں حروفِ علت کہیں پر تو پوری طرح آواز کا
 ساتھ دیتے ہیں اور کہیں پر کم اور کہیں پر کم تر۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم
 ہوگا کہ شعر میں حروفِ علت کا نمایاں ہونا اور دبنا، دونوں صورتیں لازم ہیں، اور اس
 لیے ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی کہ مثلاً عربی و فارسی لفظوں کے آخر سے آئے
 معروف ساقط نہیں ہو سکتی، مگر دوسری زبانوں کے لفظوں کے آخر سے ساقط ہو سکتی
 ہے۔ یہ غیر اصولی ہی نہیں، ناقابلِ عمل پابندی ہوگی۔

لکھنؤ کے اساتذہ متاخرین نے جو بہت سی غیر ضروری پابندیاں نافذ کی تھیں،
 ان میں سے ایک پابندی یہ بھی تھی کہ عربی فارسی الفاظ کے آخر سے حروفِ علت،
 خاص طور پر آئے معروف کو گرانا، غلط ہے۔ ہاں ہندی الفاظ اس پابندی سے مستثنا
 ہیں۔ مولانا حسرت موہانی کے رسالے معائبِ سخن کا ایک اقتباس پیش کرنا دلچسپی
 سے خالی نہ ہوگا:

”شیخ تاج کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے تلامذہ کو اخیر زلے
 میں جو بدلتیں کی تھیں، ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ کلمے کے آخر سے
 الف، واو، ی کو بے تکلف گرا دینا اچھا نہیں، مگر بقول بولوی علی حیدر
 صاحب طباطبائی، شیخ کی اس دہشت پر کسی سے عمل نہ ہو سکا۔ لفظوں کی

پہلیاں تو ذکر مصرعے میں بھرونا، اردو شاعری میں مداح پایا۔
 شیعہ کا حقیقہ کرنا اس بنا پر تھا کہ فارسی میں کہیں ایسا نہیں دیکھا کہ میکئی و
 میروی میں سے ہی کو گرا دیں۔ یا گنگو و شمسیت دشو میں سے داو
 یا دریا یا مگرو یا کالف ساقط ہو جانے دیں؟ (معائب سخن، ص ۱۷)

شیعہ تاریخ کی ہر صیت کا ذکر کیا گیا ہے، اُس کی حیثیت تو بظاہر مفروضے کی
 معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ تاریخ کی ایسی کوئی تحریر موجود نہیں۔ اس کے برخلاف، اُن کے
 کلام میں عربی و فارسی الفاظ کے آخر سے یا سے معروف کا سقوط ملتا ہے۔ ہاں اُن
 کے شاگرد کلب حسین خاں نادر نے اس قاعدے کو لکھا ہے :

حروف علت جو آخر الفاظ عربی فارسی میں آتے ہیں، ان کا خوب
 واضح ہونا لفظ میں چاہیے، مثل کے ساتھ دب کر زبان پر آئیں، مگر الفاظ
 ہندی میں خصوصاً دب، ہقام جمع مضائقہ نہیں ہے۔ (تلمیذ علی، ص ۲۱)

اصل میں ایسے اکثر قاعدوں کے واضح رشک (تلمیذ تاریخ) تھے۔ اُن کے بعد سے
 اساتذہ لکھنؤ نے ہمیشہ ایک قاعدے کی حیثیت سے اس پر زور دیا کہ عربی فارسی الفاظ
 کے آخر سے حروف علت، خصوصاً یا سے معروف کو ساقط نہیں ہونا چاہیے۔ یہاں
 تک کہ داغ نے بھی اس قاعدے کی پابندی کو آخر آخر میں ضروری قرار دیا تھا، جب
 کہ دہلوی اساتذہ عموماً ایسی پابندیوں کے قائل کبھی نہیں رہے تھے۔ مولانا حسن مارہروی
 کی فرمائش پر، داغ نے معائب شاعری سے متعلق ایک طویل قطعہ لکھا، اُس قطعے میں
 اس کا بھی ذکر ہے :

حرف علت کا جڑا اُن میں ہے مگر نادرنا

”عربی فارسی الفاظ جو اردو میں کہیں

لیکن الفاظ میں اردو کے، یہ مگر نا ہے روا“

الف و س اگر گئے تو کچھ سیب نہیں

(بادکار داغ، ص ۱۹۵)

قواعد سازی کے پیر میں اور اُس زمانے کے زبان و ادب کے خاص تصورات کے تحت، سب سے بڑی غلطی یہی ہوئی کہ ایک عام قاعدے کو، عربی و فارسی الفاظ سے متعلق کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ غیر مناسب پابندی تھی اور ہر طرح کی منطق سے آزاد تھی، اس لیے یہ لازم تھا کہ اس قاعدے کی پابندی پوری طرح نہ کی جاسکے، بل کہ یہ لہجے کا تقاضا تھا، جس کا کچھ ذکر اوپر آچکا ہے۔ اور ایسا ہوا۔ جن لوگوں نے اس قاعدے کی تبلیغ کی، اُن سے بھی پوری طرح اس کی پابندی نہیں ہو سکی۔ اپنے اپنے اساتذہ کے یہاں اس کی مثالیں موجود ہیں، اور انہی خاصی تعداد میں۔ خاص طور پر جن شاعروں نے غزل کے علاوہ، اور اصناف (مرثیہ، مثنوی وغیرہ) پر بھی طبع آزمائی کی ہے، اُن میں سے بیس تر اس (غیر مناسب، بل کہ غیر معقول) پابندی کو نہیں نبھاسکے۔ وہ یہی ہے کہ یہ پابندی تھی ہی بے اصولی۔ حروفِ طلت کے رہنے سے کلام میں جہاں ناہمواری نمایاں ہوتی ہے، وہ عام ہے، پھر اُس کو عربی یا فارسی الفاظ سے مخصوص کیسے کیا جاسکتا ہے؟ مثلاً درج ذیل مصرعوں میں خط کشیدہ الفاظ کو دیکھیے؛ ان میں ایسے حروفِ طلت ساقط ہوئے ہیں، جن کا گرا نا، از روئے قاعدہ جائز ہے، مگر فصاحتِ کلام ہوا ہو گئی ہے:

- ع: عمر اپنی کٹی دنیا کے ستمگاہوں میں (تسلیم)
 ع: دنیاے عشق میں بڑے نام امتحاں کے میں ()
 ع: لطف وہ عشق میں پائے میں کہ جی جانتا ہے (داغ)
 ع: کرتا بیمارِ محبت کا سیجا جو علاج (ذوق)
 ع: تجھے تو اہل کی ہے آرزو، اُسے وہم ہے کہ یہ مر گیا (نظم بلبلِ اہلی)
 ع: ہر دم محو رہا گو کہ تو خود بینی میں (عزیز لکھنوی)
 ع: صحرا میں جب ہوئی مجھے خوش چشموں کی تلاش (امیرینائی)

ع : ہاں کھولے پر ایاں پھرتی تھیں سر دیوار پر (اتیر مٹائی)

بات وہی ہے کہ ان سب مقامات پر حروف علت اُس طرح دیے ہیں جس طرح گفتگو میں نہیں دیتے، اور اس لیے آواز کو جھکا لگتا ہے اور روانی کی سانس ٹوٹ جاتی ہے۔ اس سے صاف طور پر معلوم ہو سکتا ہے کہ حروف علت کا ساقط ہونا اگر عیب ہے، تو اُس کا تعلق محض استدال سے ہے؛ جہاں بھی روانی کلام پر اثر پڑے، بس وہاں عیب ہے، اس کی تخصیص عربی یا فارسی یا کسی اور زبان کے الفاظ سے نہیں کی جاسکتی۔ اسی تخصیص نے، اس قاعدے کو غیر مناسب، ناقابل قبول اور ناقابل عمل بنا کر رکھ دیا۔

بہت سے مقامات پر (آخر لفظ سے) حروف علت کا سقوط ہی مناسب بل کر فصیح ہوتا ہے۔ حروف غیرہ یعنی کا، کو، کے، نا، نی، نے، را، ری، رہے، اور جو، سو، تھا، میں، سائیں یہ صورت اکثر سامنے آتی ہے۔ مثلاً :

ع : تم کو ہے وصلِ غیر سے انکار

ع : مُنبہ اُس نے چڑایا تو ہنسی آگئی مجھ کو

ع : تنگ سے غاد تھا میں، ساقی نے یہ کیا کر دیا

ع : ہم سے ہر چند وہ ظاہر میں خفا ہیں، لیکن

ع : دنیا کا ورق، بینشِ اربابِ نظر میں

لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں؛ اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ کہاں پر لہجہ کا تقاضا کیا ہے۔ یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ لہجہ کی تہ میں، معنویت کی لہر میں پنہاں ہوتی ہیں، اور اُنہی کے محرک سے، لہجہ کی سطح پر کششوں کے نقشِ امجرتے اور دبتے ہیں۔ اردو کی جمعیں (ہیں، نہیں، دن، توں کے ساتھ) یا ایسے افعال جن کے آخر میں یہ حروف یک جا ہوں، جیسے، تصور میں، دنیا میں، دیکھیں، دیکھوں وغیرہ؛ اُن

میں بہت سے مقامات پر حروفِ علت کا سقوط ہوا نہیں معلوم ہوتا۔ اردو کی جمع کے بعد اگر کوئی لاحقہ آجائے، جیسے: گیسوؤں والا؛ اس صورت میں عموماً حرفِ بابت علت کا دہنا ہی اچھا معلوم ہوگا، جیسے: گل میں چراغ گیسوؤں والوں کے سامنے — مفرد الفاظ کے آخر سے بھی کبھی کبھی واو کا دب کر نکلنا اچھا معلوم ہوتا ہے، جیسے: دھوازاں کا لکھنؤ والوں کے سامنے۔ غالب کا مصرع ہے: لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھٹا، یعنی: اس میں واو کا اظہار کچھ بھلا نہیں معلوم ہوتا۔ ثوابِ مرزا شوق کے اس مصرعے میں: گیسورخ پر ہوا سے ہلتے ہیں، ”گیسو“ میں واو کا دب کر نکلنا اچھا نہیں معلوم ہوتا، لیکن گیسوؤں والے ”میں یہ صورت نہیں پائی جاتی۔ بات یہی ہے کہ لکھنؤ میں عام طور پر کئی لفظوں کو کس طرح بولا جاتا ہے اور یہ کہ کہاں پر بچے کا تقاضا کیا ہو۔ بہادر شاہ ظفر کا شعر ہے:

دلاور میں، بہادر میں نظرِ جو رستم میداں وہ ادا کی سدا شمشیرِ دو دستی پہ ہنستے ہیں
اس شعر میں ”دو دستی“ میں واو کا اظہار اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

افعال کے آخر سے عموماً اور بہت سے اسما کے آخر سے الف کا گرنا کچھ اچھا نہیں ہوتا، مثلاً:

چملا جاتا ہے کارِ دانی نفس ذبا نگ رہا ہے، ذموتِ برس ہے
ہجومِ شوق کا بھی قصہ مختصر ہے کہ جو میں چاہتا ہوں، وہ کہا نہیں جاتا
جلیل مانگ پوری نے ایک خط میں لکھا ہے:

”کیا اور دیا اور دی وغیرہ، جو افعال متعذر ہیں؛ اُن میں حرفِ علت کا گرنا
میسوب ہے۔“ (نقوش، خطوطِ نبر، جلد ۲، ص ۲۵۰)

جہاں تک اسے معروف کا تعلق ہے، اُس کے متعلق قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس کے آخر میں واقع اسے معروف کی بھی یہی صورت ہے۔ مثلاً ان مصرعوں کو دیکھیے:

ع : الہی خیر! کہ اب آگ پاس آن لگی
 ع : در بہ در نامیہ فرسائی سے کیا ہوتا ہے
 ع : آج بیداری میں ہے خواب زلیخا مجھ کو
 ان میں سقوط یا ناگوار سماعت نہیں معلوم ہوتا۔ مگر درج ذیل مصرعوں میں سقوط
 یا، قطعاً محفل فصاحت ہے :

ع : سرے شعلے اٹھتے ہیں، آنکھوں سے دیا جاری ہے
 ع : مجھ کو تو پار سے ہے ہم آغوشی کا خیال
 ع : کچھ ناز کی قاتل کی، کچھ اپنی گراں جانی
 ایسے مرکبات، جن میں پہلے لفظ کے آخر میں می ہو؛ گفتگو میں عموماً یہ می دب کر
 نکلتی ہے۔ نظم میں بھی اس می کے دبنے سے اکثر مقامات پر خوش گفتگو باقی رہ جاتا
 ہے، جیسے یونانی علاج، ہوائی جہاز، ویرانی سی ویرانی وغیرہ،
 ع : پیاری پیاری کلاہیاں اُس کی
 ع : کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
 اس سلسلے میں آرزو لکھنوی مرحوم کے ایک خط کا اقتباس، افادیت سے خالی
 نہیں ہوگا :

”الف، واو اور ی؛ عربی کے لیے حروفِ علت ہیں، مگر اردو کے لیے
 حروفِ اتمامِ حرکات ہیں۔۔۔۔۔ تلفظ میں دبتے ہوئے آئیں، لہذا کتابت میں
 میں ان کا آنا، صرف اظہارِ حرکت کے لیے ہوتا ہے۔ ایسے تمام حروف کا استقام
 جائز ہے، چاہے وہ عربی و فارسی کے کچھوں نہ ہوں۔ مثلاً ”نفسی نفسی“ میں پہلی
 می بولتے وقت دیتی ہے، لہذا اس کا استقام ہی فصیح ہے۔ فارسی میں آئے
 ضغیفہ کا استقام ہی فصیح سمجھا جاتا ہے۔ ”تو“ اور ”جو“ کا واو بھی ظاہر ہو تو نیز فصیح

ہے..... جو لوگ ہندی کے الفاظ میں بھی ناجائز سمجھتے ہیں، وہ اپنی سمجھ کے مالک ہیں۔ ہمیں دوسروں کے مسلک سے کیا واسطہ؟

(ہمدانی زبان، علی گڑھ، حکم فروری ۱۹۷۷ء)

اس خط کے حاشیے میں آرزو صاحب کا یہ شعر بھی لکھا ہوا ہے، جس میں نفسی نفسی آیا ہے، اور پہلے لفظ کی جی ساقط ہو گئی ہے،

پڑی ہے ہر اک کو اپنی اپنی سچے انبیاء میں بھی نفسی نفسی
تھیں کو اک رٹ ہے اُنسی کی، شفیق روزِ جزا تھیں پُر

آرزو صاحب نے جس نکتے کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے، یعنی ایسے مقامات پر حروفِ علت کی حیثیت کے باب میں، وہ خاص طور پر توجہ طلب ہے اور یہ اہم بات ہے۔ مختصر یہ کہ لفظ کے آخر سے حروفِ علت کا دہنا، قابلِ قبول بھی ہو سکتا ہے اور ناقابلِ قبول بھی۔ اس کا انحصار محلِ استعمال پر ہو گا۔ ذاس میں عربی و فارسی اور غیر عربی و فارسی الفاظ کی تصریح کی جاسکتی ہے، اور نہ کوئی قاعدہ کلیہ بنایا جاسکتا ہے۔ اصل معیار یہ ہے کہ جہاں بھی حرفِ علت کے دہنے سے، مصرعے کی روانی متاثر ہو، وہاں غیر مناسب ہے۔ اور جہاں یہ صورت نہ ہو، وہاں مناسب ہے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ مسئلہ مناسب اور غیر مناسب کا ہے، غلط اور صحیح کا نہیں۔

۲

ذیل میں عہدِ ناسخ اور اس کے بعد کے چند اساتذہ کے یہاں سے ایسی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں، جن میں عربی و فارسی الفاظ کے آخر سے یا سے معروف کا سقوط نمایاں ہے۔ یا سے معروف کی تخصیص اس لیے کی گئی ہے کہ اس بحث کا مرکز خاص طور پر یا سے معروف کو قرار دیا گیا ہے اور اُنسی کا ذکر بار بار کیا گیا ہے۔ اساتذہ نے جب بھی سقوطِ حروفِ علت کے قاعدے پر کچھ کہا تو یا سے معروف کا بطورِ خاص ذکر کیا۔ ان مثالوں سے

جو محض مشتے نمودارِ خردارے کا حکم رکھتی ہیں، اس غلط فہمی کا ازالہ کیا جاسکے گا کہ اساتذہ کے یہاں سقوطِ یاسے معروف نہیں پایا جاتا۔ یہ صراحت ضروری ہے کہ آتش، آتش، اور بیش تر تلافیہ آتش کے یہاں اس قاعدے کی مطلق پابندی نظر نہیں آتی۔ یہی حال مرثیہ گوئیوں کا ہے، اُن کے کلام میں بھی اس کا التزام نہیں ملتا۔ اصل میں امیر و جلال کے زمانے میں یہ لہر تیزی سے ابھری تھی۔ امیر نے اپنے خطوں میں کئی جگہ اس کو عیب بتایا ہے، مگر دل چسپ بات یہ ہے کہ اُن کے کلام میں سقوطِ یاسے معروف کی مثالیں ملتی ہیں۔ شعراے دہلی میں سے، بہ استثنائے داغ، کسی نے اس کو عیب نہیں مانا۔ اور داغ بھی دوبارہ رام پور میں جب اساتذہ لکھنؤ کے دھگل میں اُترے، تب اُن کے یہاں غیر ضروری قواعد پسندی کا رجحان فروغ پذیر ہوا۔ اُن کے کلام میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔

- ع : وحشی ہوں آدمی کے جھگل کا نتائجِ کلیات طبعِ اولیٰ (۱۱)
- ع : کام خوں ریزی ہے اُس یوسفِ بازاری کا (۱ ص ۱۱)
- ع : کہ چہریں جاری ہوئیں، موسمِ بہار آیا (۱ ص ۱۵)
- ع : چھوڑوں کیا پیری میں شیریں دھنوں کی محبت (۱ ص ۲۶)
- ع : کیا ہو بغیرِ ہستی کے، آبِ رواں بلند (۱ ص ۱۰۵)
- ع : چہیں عربانی کا کھن میں نہیں (۱ ص ۱۳۵)
- ع : آج اسے جان، خود آرائی کا سامان کرو (۱ ص ۲۰۸)
- ع : ہیں یہ بے آبی کے مضمون، کبھی رنگ کا ہو (۱ ص ۲۶۷)
- ع : نائے کے بند جتے ہی، سیلابی کبوتر موبو جائے (۱ ص ۲۸۲)
- ع : کہیں الہی، مری آہ کو اثر مل جائے (۱ ص ۲۸۲)
- ع : جو چمختے ہیں چشائی پر آپ افشاں (۱ ص ۲۸۸)

- ع : خوں غواری کی عادت جو ہے لے یاں نہ چھوٹی ۳۰۷ ص ۷
 ع : غالی رہنا گھر کا ہوتا ہے بُرا ۳۰۸ ص ۷
 ع : میری میں دونا جوانی سے جنوں کا جوش ہے ۳۱۱ ص ۷

- ع : مشکل کے وقت حامی ہوا تو غلیل کا آتش و نکیات نول کشیدہ پس ۱۳
 ع : ناقص ہے دوستداری میں کامل نہیں ہے تو ۸ ص ۷
 ع : آزادی سے زیادہ اسیری میں لطف ہے ۸ ص ۷
 ع : نقد پردازی جسے کہتے ہیں فن ہے کس کا ۱۸ ص ۷
 ع : مُنہ کتابی، قلبی ہے۔ خط، حاشیہ ہے میر کا ۲۱ ص ۷
 ع : زانچہ بھی فصل ہے پیشانی کی تحریر کا ۲۶ ص ۷
 ع : عزلت گزینی کا جو میں نے کیا ارادہ ۳۳ ص ۷
 ع : موجود اس کی ہے سیدہ روزی ہماری آتش ۳۸ ص ۷
 ع : گمان سانی پر صیاد کا ہوا مجھ کو ۵۴ ص ۷
 ع : وہی دیوا لگی میری ہے بہار آنے دو ۶۶ ص ۷

صرف الف کی ردیف سے ابھی اتنی ہی شالیں اور مل سکتی ہیں۔

- ع : دل کی بے تابی نے پیار سے مجھے ناچار کیا امانت کھنڈی (داسوخت)
 ع : آبر و ریزی سے شاید تو نہیں ڈرتا ہے
 ع : دل کی بے تابی سے، گودی میں اٹھایا اس کو
 ع : کردی اک تغرقہ اندازی کی صورت باہم
 ع : جب کہ عتاری میں کامل ہوا وہ او تمام
 ع : میں نے اُس گل کو جو یک رنگی میں کامل پایا

- ع ۱ میں بھی تو آدمی کی جان ہوں، حیوان نہیں ۰
 ع ۱ کبھی کبھتا ہوں پریشانی میں شام بچوں ۰
 ع ۱ آگے اُس مینی کے، خود مینی تری ہے بے کار ۰
 ع ۱ وصل سے شادی ہوئی، کھل گئے عقدے دل کے ۰

- ع ۱ پاک دامانی میں تری نہیں پڑنے کا غلط ۰
 ع ۱ الہی دیکھیے، دامانگی کہاں پہنچائے ۰ ۰ ۰ ص ۳
 ع ۱ مے خواری کی تکلیف نہ لے روزوں میں ساقی ۰ ۰ ۰ ص ۱۱
 ع ۱ ایمانے ملاقات تھی خاموشی ہماری ۰ ۰ ۰ ص ۱۱
 ع ۱ دم میں دم باقی ہے جب تک، ندامت یار سے امتحان ۰ ۰ ۰ ص ۱۱
 ع ۱ پاک دامانی کا دوا نہ کرے اس رو سے ۰ ۰ ۰ ص ۱۳
 ع ۱ پھر راتیں کاٹنے لگے آخر شمار ہی ہیں ۰ ۰ ۰ ص ۱۳
 ع ۱ جو ہر وہ خاکساری نے پیدا کیا مری ۰ ۰ ۰ ص ۱۵

دیوان زند ۲۱۶ صفحات پر حاوی ہے؛ مندرجہ بالا مثالیں شروع کے صرف ۱۵ صفحات سے ماخوذ ہیں۔

- دکھلایا نا تو آنی نے گھریار کا مجھے ۰ صبا (غمنہ آرزو میں ۱۶)
 خود مینی کا رواج کبھی پیش تر نہ تھا ۰ ۰ ص ۲۵
 سودا کی کس قدر بے شبہ تار کا خراج ۰ ۰ ص ۳۷
 خالی کر دیجیے تامل کا نمک دان بھریں کر ۰ ۰ ص ۶۵
 جو گل نشانی کی جا ہے بھرگ بار چراغ ۰ ۰ ص ۷۲

- ع : دروازہ دستی کیس بے ادب نے کی دم قتل مومن دربار مرتضیٰ احمد علی
- ع : یہ بے حجابی مری، گو بھی کو جھانکو تم * * * ص ۱۳۷
- ع : غزل سرا کی مومن نے کیا کر رنگ سے آج * * * ص ۱۳۸
- ع : مری تسی کو روزِ جزا کے آنے کی * * * ص ۱۹۳
- ع : در بدرِ ناصیب فرسائی سے کیا ہوتا ہے * * * ص ۲۲۸
- ع : بیزارِ زندگانی کا جینا محال تھا * * * ص ۲۳۶
- ع : سر سے شعلے اٹھتے ہیں، آنکھوں سے دریا جاری ہے * * * ص ۱۸

- ع : آج بیداری میں ہے خوابِ زلیخا مجھ کو غالب (دولت مرتضیٰ صاحب، ص ۳۱)
- ع : کوئی دیرانی سی دیرانی ہے * * * ص ۱۵۲
- ع : غاموٹی ہی سے نکلے ہے، جو بات چاہیے * * * ص ۲۱۹
- ع : چہرہٴ مینائی ہی رکھ لو تم اپنے کان میں * * * ص ۱۰۲
- ع : سینہ بے آبی سے ملتا ہے برقیچہٴ کھسار * * * ص ۲
- ع : بیضہٴ قمری کے آئینے میں پنہاں صیقل * * * ص ۳
- ع : ناخن کو جگر کا دی میں بے رنگ نکالوں * * * ص ۹۰

- ع : الہی جلوہ ہے کس بُت کا آج مسجد میں ذوقِ دربارِ مرتضیٰ آزاد، ص ۷۳
- ع : کہ سینہ کا دی میں یاں نامور کو دیکھتے ہیں * * * ص ۱۴۷
- ع : نہیں وہ آدمی، لیکن سب آدمی کے ڈھنگ * * * ص ۲۹۸
- ع : نقشِ سجدے کا ہے پیشانی کا ٹیکا ہم کو * * * ص ۱۶۷
- ع : الہی خیر ہو، مانندِ شعلہٴ سرکش * * * ص ۱۱۸

ع : خانائی پنجہ ہوں تاک و چنار و بید انجیر ۔ ۔ ۔ ص ۲۹۳

ع : سچ ہے، محبوب جو لائمانی ہے، وہ بچتا ہے حسن کا گردی (وفاقیہ حسن من ۳)

ع : عرش پر کر سہی بچھائے ہے مرا ذہن رسا ۔ ۔ ۔ ص ۳۸

ع : اک رنگِ مخفی ہے مایہن دو ابروئے سیاہ ۔ ۔ ۔ ص ۳۰

ع : آتی ہونے میں بھلا آپ کے شبہ کیا ہے ۔ ۔ ۔ ص ۳۲

ع : بے خون ریزی کا نقشہ داغ کج کلاہاں میں ۔ ۔ ۔ ص ۴۳

ع : سبک روخی یاروں کو دکھلاؤں میں ۔ ۔ ۔ ص ۸۸

ع : کیسی افسردگی، کیا بات ہے مر جانے کی ۔ ۔ ۔ ص ۱۰۹

ع : تاریکی میں نور یا الہی ۔ ۔ ۔ ص ۱۲۷

ع : باقی جو کچھ کہے، وہ فانی ہے فواب مرزا شوق (شوقی ہر شوق)

ع : سختی ساری جتوں کے دل کو دسی ۔ ۔ ۔

ع : ثانی رکھتی نہ تھی وہ صورت میں ۔ ۔ ۔

ع : میری رسوائی کا خیال رہے ۔ ۔ ۔

ع : چھپ کے تنہائی میں اغیار سے رویا ہو گا امیر بان ہمنہاء مشق جو ہر پسند کیا دہلی

ع : قبری بے دردی ہی ابھی تھی حرس کھانے سے ۔ ۔ ۔ ص ۲۰۰

ع : پاس بچائی کا اُس شوخ کو ایسا ہے امیر ۔ ۔ ۔ ص ۲۳۸

ع : طرقت العین میں وہ روشنی پہنچی جو قریب ۔ ۔ ۔ ص ۱۲۸ (مرآۃ العین ص ۱۲۸)

ع : بھٹیاں ہوتی ہیں تباری سے اکثر باہر ۔ ۔ ۔ ص ۲۰۰

- ع : یہ شیخ سعدی ہے، جس نے کہ چشمِ روشن کو
ع : نہ بے وفائی کا غم تھا، نہ دردِ جدائی کا

- ع : الہی تو نے ہمیں کس بلا میں ڈال دیا (نور اللغات: مطبعہ نئے بہار، ص ۱۲)
ع : وہ بُت کرے خدائی کی باتیں، خدا کی شان
ع : کیا جانے وہ خدائی کا مارا کہاں ہے اب
ع : الہی شیخ بھی مے خوار ہو، مغاں کی طرح
ع : الہی تامل کی خیر گزری کہ آج کو چے سے فقہ گر کے
ع : الہی دم مری آنکھوں میں پھر کھلے نہ آئے
ع : مثالِ عارضِ صفائی رکھنا، بہ رنگِ کاکل گچی نہ کرنا
ع : الہی تو نے حسینوں کو کیوں کیا پیدا

- ع : گھر میں جو سپیدی چار سو تھی
ع : رانتوں سے کبودی لب پر آئی
ع : چاندی کی رگوں سیاہی لائی
ع : دانائی تھی ختم اُس پری پر
ع : آزادی کو شتری نے کھویا
ع : تقدیر کی نار سائی کب تک

- ع : تنہائی میں رنجِ شبِ یلدا ہے قیامت
ع : رعنائی میں آفت ہیں تو مے لبِ چہ جسم

- ع : اب بھی کیا ہم قریٰ یکتائی کا دعوا نہ کریں (دیوان چہارم)
 ع : یعنی جب یہ ہے تو فکر بے لوائی پھر کہاں
 ع : پھر بھی ہے تم کو سیحانی کا دعوا، دیکھو
 ع : یعنی ہم نے کس لیے غلطی جتائی آپ کی (دیوان ہشتم)

- ع : پیسے کھائے، یا کوئی قربانی دے (آفر گمنامی (غفر جاوید)
 ع : وہ اندھے ہیں رانائی سے کوسوں دور
 ع : خوشی سے صفا کوشی مضبوط ہے
 ع : ہستی ہوتی ہے اتنی ہی مبہم (آوہا ہاں میں اہا)
 ع : راستی وہ جو ہم سخن تجھ سے ہوئی ہو بر ملا (میں ۱۱۵)

بہت بڑے ذخیرے کے یہ صرف چندا جزا ہیں اور ان مثالوں ہی سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ فارسی عربی الفاظ کے آخر سے یا سے معروف کس بے تکلفی کے ساتھ ساقط ہوتی رہی ہے اور یہ کہ جن لوگوں نے اس سقوط کو غلط بتایا، وہ خود بھی اس کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اس سے ثابت ہو گیا ہو گا کہ حروف علت کا سقوط ضروری ہے اور یہ کہ اس میں زبانوں کی قید نہیں لگائی جاسکتی۔ اساتذہ کے یہاں ہر طرح کے مناسب و غیر مناسب سقوط حروف علت کی ہزاروں ہزار مثالیں بکھری ہوئی ہیں اور اس میں معتبر و غیر معتبر کی کچھ تخصیص نہیں۔ پُرانے ذخیرے کا جائزہ لینا مقصود نہیں، مقصود یہ ہے کہ ایک قاعدے کی حیثیت سے، سقوط حروف علت کو جو غلط طور پر صحیح و غلط کے خالوں میں بانٹا گیا، اور فارسی و عربی کی جس طرح تخصیص کی گئی، اس پر گفتگو کی جائے، اور جو شعرا فصاحت کلام پر نظر رکھنا چاہتے ہیں، اُن کی توجہ کو صحیح انداز نظر

اور طریقہ کار کی طرف مبذول کرایا جائے۔ اور اس پر زور دیا جائے کہ الفاظ کے آخر سے حروفِ علت کا دبنا اور نہ دبنا، غلط اور صحیح کے عنوانات کے تحت نہیں آتا؛ اس کو مناسب اور غیر مناسب کے نام سے موسوم ہونا چاہیے۔ اشعار میں، گفتگو کی طرح، حروفِ علت کا ساقط ہونا لازم ہے، مگر اس سلسلے میں گفتگو کے اسلوب اور لہجے کے تقاضوں پر ضرور نظر رہنا چاہیے۔ مکمل پابندی تو شاید ہی کسی چیز کی ہو سکے، البتہ یہ مناسب بھی ہے اور ضروری بھی کہ یہ پہلو ذہن میں رہے اور وجہ اس کی طرف متعطف ہوتی رہے۔

اعلانِ نون

عربی فارسی کے وہ لفظ جن کے آخر میں نون ہو، اور اُس سے پہلے الف، واو، یا میں سے کوئی حرف ساکن ہو، جیسے: جان، ایمان، خون، جنون، دین، تحسین وغیرہ؛ تو ایسے لفظوں کو شعر میں کس طرح لایا جائے، اعلانِ نون کے ساتھ، یعنی جان، بروزن، مال؛ یا اخفائے نون کے ساتھ، یعنی جاں، بردزن، پاؤں؛ اور اگر ایسے لفظ مرکب اضافی، توصیفی یا عطفی کا جزو آخر ہوں، جیسے دشمن ایساں، جوش جنوں، و شب بے پایاں، دین و ایمان وغیرہ؛ اس صورت میں کیا نون کا اعلان کیا جائے گا؟

اس کا سیدھا سا جواب تو یہ ہونا چاہیے کہ جہاں نون کا اعلان مناسب ہو وہاں اعلان کیا جائے اور جہاں اخفا کا محل ہو، وہاں ایسے لفظوں کو بہ اخفائے نون نظم کیا جائے۔ اور اس کا اصل معیار ذوقِ سلیم ہو گا۔ مصرع کی روانی اور اُٹس کا آہنگ اگر اخفا کا متقاضی ہو تو وہی صحیح ہے، اور اگر اعلان کا طالب ہو، تو وہی درست ہے۔ لفظ مفرد ہو یا مرکب، اس سے کچھ فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ لیکن قواعدِ شاعری کی شریعت میں اس آزاد روی کو قابلِ قبول نہیں سمجھا گیا، بل کہ مفرد اور مرکب الفاظ کو الگ الگ قاعدوں کے پھندروں میں کسایا گیا۔ مرکبات کے متعلق تو قطعیت کے ساتھ یہ فیصلہ کیا گیا کہ ان میں نون کا اعلان کسی صورت میں بھی روا نہیں، ہر مرکب کو (عطفی،

اضافی، توصیفی، لازماً بہ اخفائے تونِ نظم کرنا چاہیے۔ اس قاعدے کی رو سے دشمن جان، صحیح ہے اور شرمندہ احسان غلط ہے۔ اور مفرد الفاظ کے متعلق کچھ لفظوں کو استثنا کر کے یہ کہا گیا کہ اُن کو اعلانِ تون کے ساتھ نظم کرنا چاہیے۔ مولانا حسرت موہانی نے لکھا ہے :

”فارسی کے جو الفاظ اردو زبان میں عام طور پر رائج ہیں، اُن کے متعلق دستور یہ ہے کہ اگر وہ بلا اضافت ہوں، تو رواجِ اہل زبان کے خلاف، اُن میں تون کا اعلان کیا جائے؛ لیکن ترکیبِ فارسی میں اعلانِ تون جائز نہیں سمجھا جاتا۔ مثلاً صرف ”مکان“ یا ”تجان“ کہنا ہوگا تو ”مکان“ اور ”جان“ اعلانِ تون کے ساتھ بولیں گے، جس کی کتابت کے لیے تون کے پیٹ میں نقطہ دینا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اگر ”آفتِ جاں“ یا ”رگِ جاں“ کہنا ہوگا تو ”آفتِ جاں“ اور ”رگِ جاں“ میں ترکیبِ فارسی کی موجودگی کے باعث، اعلانِ تون جائز نہ ہوگا، اور کتابت میں تون بے نقط لکھا جائے گا۔“

[نکاتِ سخن، اشاعتِ ششم، انتظامی پریس حیدرآباد، ص ۹۱]

ہر حالتِ ترکیبِ اعلانِ تون کے ناجائز ہونے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ :

”جب ترکیبِ فارسی ہو، تو اعلان، جیسا کہ ذوقِ دہلوی کے کلام میں جا بہ جا ہے، جائز نہیں۔ جب فارسی ترکیب ہو، تو فارسیوں کا اشتباع چاہیے، اور وہ اس قسم کے الفاظ، اعلان کے ساتھ نہیں باندھتے۔ اور ایک آدھ جگہ جو اُن کے کلام میں اعلان پایا جاتا ہے، تو یا تو وہاں سہو کاتب ہے، یا سن قبیلِ شاذ“ [شوقِ نبوی، رسالہ اصلاح، ص ۱۸]

اس سلسلے میں تین اہم باتوں کو نظر انداز کر دیا گیا جس کی وجہ سے مفرد و مرکب کی تفریق اور اعلان و اخفاء کی قید غیر مناسب احکام کا مجموعہ بن کر رہ گئی۔ پہلی بات تو یہ کہ بول چال

میں کچھ لفظ عموماً اعلانِ نون کے ساتھ آتے ہیں، جیسے: "خون" اور "دین"۔ اور کچھ لفظ عموماً اخفائے نون کے ساتھ بولے جاتے ہیں، جیسے: "مگرایاں" اور "خندراں"۔ ان سب لفظوں کی صورت یہ ہے کہ ان میں سے کچھ لفظ تو ایسے ہیں کہ وہ مفرد ہوں یا مرکب، اور نظم میں ہوں یا نثر میں؛ اُن کو اگر اعلانِ نون کے ساتھ استعمال کیا جائے گا تو ہمیشہ ناگوار معلوم ہوں گے، خواہ اساتذہ کے بنائے ہوئے قاعدے کے مطابق، اعلانِ جائز ہو۔ اور کچھ ایسے لفظ ہیں کہ وہ دونوں طرح استعمال میں آ سکتے ہیں، اُن میں صوتی سطح پر ناگوار کیفیت نمایاں نہیں ہو پاتی۔ ظاہر ہے کہ اسی اعتبار سے ایسے الفاظ کے متعلق فیصلہ بھی کیا جانا چاہیے۔

دوسری بات یہ ہے کہ بہت سے مرکبات اس طرح کے ہیں جو گفتگو میں عام طور پر اعلانِ نون کے ساتھ آتے ہیں۔ نثری تحریروں میں بھی جب یہ جگہ پاتے ہیں تو قاری اُن کو بہ اعلانِ نون ہی پڑھتا ہے۔ یہ ایسے مرکبات ہیں کہ اگر اُن کو، قاعدے کی پابندی کے خیال سے، بالجبر بہ اخفائے نون بولا جائے تو ناگوار صوتی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ مثلاً اسی "اعلانِ نون" کو لیجیے؛ اس کو "اعلانِ نون" کہہ کر دیکھیے، واضح طور پر یہ محسوس ہو گا کہ تلفظ میں بھٹاپن در آیا ہے، اگرچہ از روئے قاعدہ اسی طرح صحیح ہے۔ مشہور قول ہے، "الشعر ازلما یذالرحمن" اس میں نون کا اعلان ہے۔ اب حالی کے اس شعر کو دیکھیے؛

دعویٰ فضل و براعت اس کو زیرِ با ہے یہاں

جو کوئی تلمیذِ رحمان تم میں ہو میرے سوا

اس میں تلمیذِ رحمان "زبان سے ادا تو ہو جاتا ہے، جتنا نہیں، اجنبی سا لگتا ہے؛

حالاں کہ قاعدے کی رو سے یہ بالکل صحیح ہے۔ ایک اور مثال :

راکبِ حزم ترا، ناقہ صالح تہ راں مومن
 رانقصِ عزم ترا: دوشِ ملائک پہ سوار [تکلیفِ طبع لاہور، ص ۱۳۹]
 پہلے مصرعے میں بہ لحاظِ قاعدہ ”تہ راں“ صحیح ہے، لیکن پڑھنے میں کس قدر بے جوڑ
 معلوم ہوتا ہے!

اس سلسلے میں یہ بات بھی اہم تھی کہ بہت سے مرکبات ایسے بھی ہیں، جو
 بہ اخفائے نون اور بہ اعلانی نون، دونوں طرح بولے جاسکتے ہیں اور نظم بھی
 کیے جاسکتے ہیں اور بہت سے مقامات پر دونوں صورتوں میں بد معنائی اُن سے
 دور رہتی ہے۔ مثال کے طور پر غالب کے اس شعر میں بلائے جاں کی ترکیب
 بہ اخفائے نون آئی ہے، اور بالکل ٹھیک معلوم ہوتی ہے،

بلائے جاں ہے غالب اُس کی ہر بات عبادت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

[دیوانِ غالب، نسخہ مرتبی، ص ۱۵۸]

یہی ترکیب ذیل کے شعر میں بہ اعلانی نون نظم کی گئی ہے، اور اس صورت میں بھی
 بڑی نہیں معلوم ہوتی،

ہے بلائے جان یہ افعی بہ نخلِ یاسمن

یا کہ ہے یہ دام، بہرِ عاشقانِ غمت تن

نصوّر لکھنوی (تذکرۃ مجمع الانتخاب)

مگر یاسار اکمیل محلی استعمال اور انداز استعمال کا ہے۔ بہ خوبی ممکن ہے کہ یہی ترکیب
 کسی دوسری جگہ بہ اخفائے نون ناگوار معلوم ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی شعر میں
 بندش ایسی ہو کہ بہ اعلانی نون ناگوار تر لگے۔

تیسری بات جو سب سے زیادہ اہم تھی، اور جس کو نظر انداز کیا گیا، یہ تھی کہ اساتذہ
 دہلی کے یہاں ذوق و غالب، بل کہ حالی کے زمانے تک، اخفا و اعلانی نون کی یہ

پابندی ہرگز نہیں تھی۔ وہ لوگ مرکبات کو بے تکلف بہ اعلانِ نونِ نظم کیا کرتے تھے۔
 داغ کے ابتدائی کلام میں بھی اس کی مثال ملتی ہے۔ البتہ بعد کو انھوں نے سختی کے ساتھ
 اس کی پابندی کی، اور یہ اثر تھا درحقیقت اُن کے قیامِ رام پور کا، جہاں لکھنوی شعرا
 کے جھگڑے میں وہ بہت سی پابندیوں کو ماننے پر مجبور ہوئے۔ ان دہلوی شعرا کے یہاں
 بے شمار اشعار میں بصورتِ ترکیبِ نون کا اعلان ملتا ہے، اور ان میں نہ معلوم کتنے
 اشعار ایسے ہیں جن میں یہ اعلان کسی طرح بُرا نہیں معلوم ہوتا۔ یہ بات قابلِ توجہ تھی
 کہ ایک مدت تک نون کے اخفایا اعلان کو کوئی اہم مسئلہ نہیں سمجھا گیا، قاعدے کی زنجیر
 میں پائے بند ہونے کے بجائے، ضرورت اور آسانی کی روشنی میں اس کو دیکھا گیا؛ تو اس
 کے اثرات زبان اور شاعری میں پرنشیں ہوئے ہوں گے، اور ان اثرات کے باعث،
 بہت سے ایسے مفرد و مرکب لفظ سامنے آئے ہوں گے، جن میں اخفایا اعلان، محصل
 استدلال کے تابع رہا ہوگا، کسی قاعدے کا اسیر نہیں بنا ہوگا؛ طویل مدت تک شاعری کی
 زبان میں بہت سے مرکبات کو بہ اعلانِ نونِ نظم کیا جاتا رہا؛ اس پیہم عمل سے، کیا یہ مرکبات
 چلن کے سانچے میں نہیں ڈھل گئے ہوں گے، اور شاعری کی زبان سے اچھی طرح روشناس
 نہیں ہو گئے ہوں گے؟

ان امور کو نظر انداز کر دیتے ہیں، اور محض ایک جامد قاعدہ بنا دیتے ہیں، سب
 سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ جن مرکبات کو بہ اعلانِ نونِ نظم کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا، اُن کو بھی
 متاخرین نے مجبوراً اسی طرح نظم کیا اور حسنِ کلام کی پروا نہیں کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ
 قاعدہ، کہ بصورتِ ترکیب ایسے الفاظ کو لازماً بہ اخفایا نونِ نظم کرنا چاہیے؛ آج مفروضہ
 معلوم ہوتا ہے۔ — میں ذیل میں کچھ ایسی مثالیں پیش کرتا ہوں جن سے یہ معلوم ہوگا
 کہ محصلِ استعمال اور سلیقہ استعمال کا لحاظ رکھا جائے، تو بہت سے مقامات پر، مرکبات
 میں بھی اعلانِ نون اُسی طرح گوارا بن جائے گا جس طرح وہ بہ اخفایا نون گوارا معلوم

ہوتے ہیں، اور دوسری طرف ان مثالوں سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ اساتذہ نے مرثیات کو بہ اعلانِ نون بہ کثرتِ نظم کیا ہے، اسی لیے مثالی شعراء کی تعداد کچھ زیادہ ہے، مگر ان کی حیثیت ”مشتے نمونہ از خروارے“ سے زیادہ نہیں، البتہ اثباتِ مدعا کے لیے یہ کافی ہیں،

در پے جان ہے قراولِ مرگ

کسو کے تو شکارِ ہم بھی ہیں تیرا نکلیت مرثیہ ساسی میں ۵۱

لوٹے ہے خاک و خون میں غیروں کے ساتھ تیر

ایسے تو نیم کشتے کو ان میں نہ سائے (۱۹۶ ص)

غنچہ ہی وہ دبان ہے گویا

ہونٹ پر رنگِ پان ہے گویا (۲۲۵ ص)

مر گیا جو اسیرِ قیدِ حیات

تنگناے جہان سے نکلا (۱۷ ص)

خوب رو سب کی جان ہوتے ہیں

آبروے جہان ہوتے ہیں

غزۂ چشمِ خوش قد ان زمین

فتنہ آسمان ہوتے ہیں (۱۱۰ ص)

ہم نے کون و مکان دیکھ لیا

پل میں سارا جہان دیکھ لیا

آرزو تھی عدم میں دنیا کی میر سوز، آدوے مٹی (دہلی)

ہے وہم و گمان دیکھ لیا میر سوز نمبر، ص ۷۷

بسیا غم نے اگر اس دلِ دیران کو ہے ہے

وگرہ رفتہ رفتہ تحسن سے آباد میں کرتا (۱۲۵ ص)

اور بھی چاہیے سو کہیے، اگر میر درد

دلِ نامہبران میں کچھ ہے (دیوانِ درد، مکتبہ جامعہ، ص ۸۷)

شہرِ یدم کو تافیلے لاکھوں گئے، نوے چل چل کے نت میں بے سرو سامان رہ گیا

مصفیٰ (انتخابِ سخن، مرثیہ صحرّت موبانی، ص ۱۳)

کب کا اک مرے جھگڑا تھا دل و جان کے سنج

کام دونوں کا کیا پارنے اک آن کے بیچ مصفیٰ (ص ۳۱)

از بس کہ مرے دیدہ حیران میں کچھ ہے

اک آن میں دل کچھ ہے، تو اک آن میں کچھ ہے (ص ۶۶)

گیا ہے چھوڑ کر جس کو تولے آبادیِ عالم وہ مضطر کیا دردِ خار ویران لوٹے ہے

جرات (انتخابِ سخن، ص ۶۸)

کیا لڑکپن کا ہے عالم اس بختِ نادان کا

بھولی بھالی صورت اور پس پردہ بالاکان کا

جرات (ص ۱۳)

دیتا ہوں تجھ کو تختِ سلیمان کی قسم

اور اپنے دین و مذہب و ایمان کی قسم

انشا (کلامِ انشا، ص ۱۳۶)

کھیلے وہ قمری زلف سے، جو کالے کو کیلے

انشا (ص ۱۹۹)

دل مجھ سے لے پری، تجھے قرآن کی قسم

نست میں جس کی ہے تو، اُسی کی قسم تجھے

گر ہاتھ لگاؤں، خطرِ جان مجھے ہے

کب وہ آزاد بھلا موردِ تحسین ہوئے

قمری و لبیلِ نالائیں میں پڑے جو جھگڑے

بھول جو سب کو گئے، دین سے بے بین ہوئے

سو دلِ غم زدہ کے موجبِ تسکین ہوئے

انشا (ص ۲۵۱)

ہے یہ اُس مہجین کی تصویر یا کسی حورِ عین کی تصویر
نظر آتی ہے اشکِ انشا میں جسریلِ امین کی تصویر

انشا (کلامِ انشا، ص ۹۱)

کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرتِ انسان پر فعلِ بد تو خود کریں، لعنت کریں شیطان پر
انشا (ص ۹۹)

جھوٹ ہی جانوں کلامِ اُس رہ زینِ ایمان کا
پہن کر جامہ بھی وہ آئے اگر قرآن کا

ذوق (دیوانِ ذوق، مرقعِ آزادِ محبوب للطایف، ص ۶۵)

جو دل پُر آرزو سے نکلا نالہ عشق میں ایک پُتلا تھا سراپاِ محبت واران کا
ذوق (ص ۶۵)

نفسِ بے مقدور کو تھوڑی سی ہی فرصت ہوگئی دیکھ پھر سامان، اس فرعونِ بے سامان کا
ذوق (ص ۶۶)

مصحفِ رخ پر ترے، رنگِ سنہرا تیرا واہ کیا خوب ہے سوزِ امرِ قرآن چڑھا
ذوق (ص ۷۱)

شرم، آئینہ تراشیں جیہ طوفان ہے آبِ گردِ دین روا، لیکن چکیدنِ منہ ہے
غالب (دیوانِ غالب، نسو، عرشی، ص ۱۱۲)

وہ کہ جس کی صورتِ تنگوں میں مقصدِ چرخ و ہفت اختر کھلا
غالب (ص ۱۲۹)

مشکیں لباسِ کعبہ، علی کے قدم سے جان
نافِ زمین ہے، نہ کہ نافِ فزّال ہے

غالب (ص ۲۰۵)

بٹھا ہے جو کہ سایہ دیوارِ یار میں فرماں روا کے کشورِ ہندوستان ہے

(دیوانِ غالب، ص ۲۰۳)

شرع و آئین پر مدارِ سہی ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

(دیوانِ غالب، ص ۲۳۲)

وہ شورشِ بے سبب آزار دہے گنہ خوں ریز کہ جرمِ قاتلِ عثمان کا نہ ہو قاتل

مومن (تکلیاتِ مرتبہٴ مصلیٰ علی خاں قلاتی، ص ۲۶)

شرطِ ایمان ہے، پیمانِ خلافت اس کا

وہ مسلمان ہے کیا، جس کو ہو اس میں انکار (ص ۳۷)

سیف و قلم ہیں دونوں ستوں کا رخ دین کے

حیراں ہوں، بابِ علم کہوں، یا جہاں تیغ (ص ۵۶)

صاف طوفان اس کو جان گئے دشمنِ جان اس کو جان گئے

(ص ۱۵۲)

چسرخِ مینو، خطربِ آن آن ہیں خضرِ ڈوبے چشمِ حیوان میں

(ص ۲۳۱)

اب قید سے امیدِ رہائی نہیں رہی ہمدردِ پاسبان میں زندانیوں میں ہم

مومن (دیوانِ مرتبہٴ ضیا احمد، ص ۱۲۳)

نہ چاہوں روزِ جزا دار، یہ ستم دیکھو

کب آزماتے ہیں، جب وقتِ امتحان نہیں (ص ۱۵۳)

تابندہ و جوان تو بختِ رقیب تھے ہم حیرہ روزِ کیوں غم، بھراں کو بھاگ گئے

(ص ۲۳۶)

کچھ آنکھ بند ہوتے ہی، آنکھیں ہی کھل گئیں جی اک بلائے جان تھا، اچھا ہوا گیا

(ص ۳۶)

- ع ۱ جتنے انسان کی حیات ہے تو حالی (مجموعہ نظم حالی، ص ۲۲)
- ع ۱ قتل انسان ہمیشہ سے ہے عادت تیری (۰ ص ۲۳)
- ع ۱ حکم و قانون کسی گھر میں مقتیدہ رہا (۰ ص ۳۷)
- ع ۱ جسے اجاب اک قصر رفیع الشان سمجھے میں (۰ ص ۱۰۱)
- ع ۱ اب دیر کیا ہے، دور کرامن و امان کو میر ہندی بھوج (دیوان ص ۱۸۹)
- ع ۱ شکر احسان مگر فطرت انسانی ہے شبلی (کلیات نظم اردو ص ۸۳)

- ع ۱ ہیں لکھے ہوئے سقفِ ایوان سے اسماعیل میرٹھی (کلیات ص ۲)
- ع ۱ ہر اک جنس کا ساز و سامان بھی (۰ ص ۵)
- ع ۱ دامانِ زمین کو کترتی (۰ ص ۶)
- ع ۱ بر آتی سنگین سے تھی آنکھ جھپکتی (۰ ص ۱۳۰)
- ع ۱ امورِ دین میں ظاہر حیا سے عثمانی (۰ ص ۲۲۵)

میر انیس کے کلام میں بھی اعلانِ نون کی مثالیں موجود ہیں۔ مولانا احسن اہرہوی مرحوم نے، میر انیس کے کچھ ایسے اشعار نقل کر کے لکھا تھا،

”اہلِ گشتِ قدیم سے اس کے پابند ہیں کہ ایسے ترکیبی نون کو بلا اعلان نہیں کہتے اور ذوق و غالب تک دہلی والے ایسے نون کا اعلان بے تکلف کیا کرتے تھے، اور اب بھی بعض اہلِ دہلی عموماً اور نچول شعرا خصوصاً اخفا کی قید کے پابند نہیں“ (رسالہ فصیح الملک، جنوری سن ۱۹۷۷ء)

خط کشیدہ عبارت خاص طور پر قابلِ توجہ ہے اور ان مثالوں سے اور اس قول سے مکمل طور پر یہ ثابت ہے کہ بہت سے شعرا نے اس قاعدے کو التزامی صورت میں کبھی

قبول نہیں کیا کہ بہ صورت ترکیب اضافی وغیرہ، ایسے الفاظ میں اخفائے قون ضروری ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ قواعدِ شاعری کے سلسلے میں بھی (جن میں متروکات بھی شامل ہیں)، ساری غیر ضروری پابندیاں لکھنویں وضع کی گئیں اور وہاں یہ ایک طرح کا فیشن بن گیا تھا۔ حام دہلوی شعرا نے اور اُن سے متاثر ہونے والوں نے ایسے استعارات کو کچھ زیادہ اہمیت کا مستحق نہیں سمجھا جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، داغ نے اعلان و اخفائے قون کے اس قاعدے کی طرف بہ طور خاص توجہ کی مگر آقاؤں میں جب کہ وہ دہلی کے اثرات سے باہر نہیں نکل پائے تھے، اُن کے یہاں اعلانِ قون اور آخر کلمہ سے سقوط یا بے معروف جیسے ضابطوں کی لازمی پابندی نہیں ملتی۔ دربارِ رام پور میں لکھنوی شعرا کے هجوم نے اور وہاں کے اُس خاص ادبی ماحول نے اُن کی توجہ کو اس طرف منطقت کیا۔ نواب کلب علی خاں کو متروکات وغیرہ کا بڑا لحاظ رہتا تھا اور اُن کے دربار میں زبان و قواعد کی ایسی بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ اور ذرائع کے علاوہ، نواب صاحب کے دواوین کے آخر میں متروکات کی جو فہرستیں ہیں، اُن سے بھی اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ فرماں روا کے اس دعوٰی نے قواعدِ شاعری و قواعدِ زبان کی بحثوں کو، اور اُن کی سخت گیر پابندیوں کو، لازماً استادی بنا دیا تھا۔ اعتبار کے لیے ایسے قواعد کی پابندی ضروری تھی، بہ صورت دیگر اعتبار و استناد پر حرف آسکتا تھا۔ ایسے حالات میں داغ کے یہاں روکشِ دہلی کے خلاف، قواعدِ ہندی اور ضابطہ پرستی کا پیدا ہونا اور فروغ پانا ضروری تھا۔

اس کی ایک اور دل چسپ مثال بھی ہمارے سامنے ہے۔ اوپر بہ صورت ترکیب اعلانِ قون کے ذیل میں جو اشعار بہ طور مثال نقل کیے گئے ہیں، اُن میں انشائے کبھی چند شعر ہیں، اور ان اشعار کی موجودگی میں، یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ انشائے بہ صورت ترکیب اعلانِ قون کے قائل نہیں تھے؛ مگر دریاے لطافت میں انہوں نے اس کو محب بتایا ہے،

”ہندی شعر میں صفت اور مضاف الیہ میں اگر مضاف اور موصوف ذکر ہوں، تو

نوں کا اعلان غلط ہے۔ جیسے ویدہ گریاں اور سرگمستاں میں نوں کا

اعلان غلط ہے۔ (تذکرہ دربارے لطافت، ص ۲۵۹)

اب اس کے سوا اور کیا کہا جائے گا کہ یہ تضاد، دو دبستانوں کی آئینہ داری کر رہا ہے۔ یہ خیال رہے کہ یہ کتاب لکھنؤ میں مکمل ہوئی تھی اور ان کی شامری نے ابتداً فرنگ دہلی میں پایا تھا۔ یہ جملہ معترضہ تھا، جو یہاں پر ختم ہوا، اب اصل بحث ہر ضرورتاً جاتی ہے۔ اس زمانے کے بعض شعرا کی مثالیں بھی اس سلسلے میں دل چسپی کے ساتھ دیکھی جائیں گی اور ان سے مزید اس بات کا اندازہ کیا جاسکے گا کہ ترکیب کی صورت میں بھی نوں کا اعلان تناسب کی حدود میں رہ سکتا ہے۔ بہ طور مثال محض دو چار مثالیں پیش کی جائیں گی،

تو فتح دستوں سے کیوں دغا داری کی ہے تھک کو کسی کا کون اب شعر زندہ احسان ہوتا ہے
احسان دانش

اجالا ہے شرقی کے ایوان میں سحر ہو گئی شام دیوان میں

سرور جعفری

شکستہ دوش پہ دیوار چین کو لاوے سروں پر مصر کے اہرام کو اٹھائے تھکے

سرور جعفری

دست و پا شل ہیں، کنائے سے لگا ٹیٹا ہوا

لیکن اس شورشِ طوفان سے ہارا تو نہیں (دامق)

مولانا محمد علی مرحوم کے یہ دو شعر بھی دیکھیے،

ما ایں آج دھوم ہے فسحِ مبین کی سن لی خدا نے قیدی گوشِ نشین کا

بہرِ خدا، یہود و نصارا کو دو نکال یہ ہے وصیتِ اُس کے رسولِ امین کی

ان مثالوں سے (جن میں بہت کچھ اضافہ کیا جاسکتا ہے) مولانا احسن مارہروی

کے اُس قول کی بھی تائید ہوتی ہے کہ نچرل شعرا خصوصاً اغنا کی قید کے پابند نہیں۔ ان

ساری مثالوں میں نون کا اعلان گراں نہیں گزرتا۔ اور جو کچھ لکھا گیا ہے اُس کی روشنی میں یہ مان لینا چاہیے کہ ترکیب کی صورت میں نون کا اعلان لازماً غلط، غیر مناسب یا بارِ سماعت نہیں ہو سکتا۔ وہ مناسب بھی ہو سکتا ہے اور غیر مناسب بھی، اور اس کا تعلق صرف محلی استعمال اور انداز استعمال سے ہوگا۔ جہاں سلیقے سے ایسے الفاظ آئیں گے اور اُن الفاظ میں بجائے خود بھی اخفا یا اعلان سے کوئی خاص مناسبت ہوگی وہاں اس طرح کی صورت پیدا ہوگی۔ مناسب اعلان نون کی مثالیں اوپر پیش کی گئی ہیں، ذیل میں چند ایسی مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن میں ترکیب کی صورت میں، نون کا اعلان نہایت آگوار معلوم ہوتا ہے :

- ع : ہو ابر نخل دیدہ نگر یان کے آگے (جرات)
 ع : دم مائے نذل اس دلِ نالان کے آگے (جرات)
 ع : میں طرف تماشا شیبِ بحر ان میں دیکھا (مستغنی)

ان مقامات پر نون کا استعمال بارِ سماعت ہی نہیں، محلی فصاحت بھی معلوم ہوتا ہے، اور اس طرح کی مثالیں بھی بہت پیش کی جاسکتی ہیں۔ بات وہی ہے کہ یہ سب لفظ وہ ہیں جو گفتگو میں بھی بہ اخفائے نون آتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ایسے الفاظ میں نون کا اعلان ہمیشہ بُرا معلوم ہوگا۔

مختصر یہ کہ، ترکیب کی صورت میں نون کا اعلان مطلقاً غلط یا ناقابلِ قبول نہیں، اور یہ کہ اس کو کسی قاعدے کا اسیر نہیں بنایا جاسکتا یعنی مسئلہ غلط اور صحیح کا نہیں، مناسب اور غیر مناسب کا ہے، اور مناسب و غیر مناسب کا فیصلہ محض محلی استعمال کی بنا پر کیا جائے گا اور بس۔ اس بیان کو ایک دل چسپ مثال پر ختم کیا جاتا ہے، مشنوی زہرِ عشق کا معروف شعر ہے :

صبح کو طائرانِ خوش الحان پڑھتے ہیں : مَرْثَمُنْ عَلَیْهَا نَانْ

دوسرے مصرعے کا آخری ٹکڑا، ایک آیت کا جُز ہے اور اُس میں آخری لفظ "فان" ہے جس کو اصولاً بہ اعلانِ نون "فان" پڑھنا چاہیے، کیوں کہ عربی میں اعلان و اخفا کا یہ جھگڑا نہیں اور یوں بھی کہ اس کو اگر "فان" پڑھا جائے تو یہ ایک طرح کی تحریف ہوگی۔ اگر اس کو "فان" پڑھا جائے (اور پڑھنا بھی اسی طرح چاہیے) تو پہلے مصرعے میں عائز خوش الحان "پڑھنا پڑے گا، یعنی بر صورت ترکیبِ نون کا اعلان کرنا ہوگا۔ قاعدہ یہ کہے گا کہ اس کو خوش الحان "پڑھا جائے، مگر خوش مذاقی کا تقاضا یہ ہوگا کہ اس کو "خوش الحان" کہا جائے اور دوسرے مصرعے میں "فان" پڑھا جائے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ اخفا و اعلان کا مسئلہ کسی قاعدے کا اسیر نہیں، بلکہ محض محلی استعمال سے خوب و ناخوب کا فیصلہ کیا جائے گا؛ اس صورت میں کوئی جھگڑا باقی نہیں رہے گا۔ یہ خیال رہے کہ قدیم اساتذہ (خصوصاً اساتذہِ دہلی) کا طرزِ عمل یہی تھا۔ درمیان میں جب شاعری اور زبان کو بہت سے غیر ضروری قاعدوں کے حصار میں مقید کرنے کا رجحان فروغ پذیر ہو گیا تھا؛ اُس زمانے میں اعلانِ نون کا یہ غیر ضروری اور قطعاً غیر مناسب قاعدہ بنایا گیا تھا اور اس کو آیت و حدیث والی اہمیت بخش دی گئی تھی۔ وہ زمانہ ختم ہو گیا، وہ حالات بھی ختم ہو گئے جب شعر گوئی پر، شعر سازی نے غلبہ پایا تھا اور شعریت کے مقابلے میں بے روح صنعت گری نے اہمیت حاصل کر لی تھی؛ اس لیے اُس زمانے کی ایسی غیر مناسب پابندیوں کو بھی ختم ہو جانا چاہیے اور قدیم اساتذہ کے مناسب طرزِ عمل کو اُس کی جگہ لینا چاہیے۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا، اُس کا تعلقِ مرگبات سے ہے مفرد الفاظ کے سلسلے میں اساتذہ نے یہ قاعدہ بنایا تھا کہ کچھ فظوں کے علاوہ، جو کثرت میں بالعموم بہ اخفا سے نون بولے جاتے ہیں، باقی سب مفرد الفاظ کو بہ اعلانِ نون ہی نظم کیا جائے گا۔ کتبِ حسینِ خاں ناؤ نے

لکھا ہے :

”جو تـو آخر الفاظ عربی فارسی میں آتا ہے ، اگر وہ بے کسی ترکیب کے ہو ، تو بہ اعلان موزوں کیا جائے ، جیسا کہ اس مصرعے میں : کپڑے آکر آتے ہیں بلا کر و کلا میں غرض یہ ہے کہ جس طرح سے الفاظ روزمرہ گفتگو میں بولے جاتے ہیں ، اُنہی طرح سے موزوں بھی ہوا کریں ، مگر چند الفاظ ایسے بھی ہیں کہ جن میں یہ قاعدہ قائم نہیں رہتا ، مثلاً گراں ، اور خزاں ، اور رواں ، اور درواں ، اور لپاں ، اور عیاں ، اور نہاں ، وغیرہ ؛ ان میں اعلان نہیں چاہیے ، اس لیے کہ روزمرہ گفتگو میں قصداً بہ اعلان نہیں بولتے ہیں ، اس سبب سے ان کا اعلان جائز نہیں “ (تلمیخیں معلیٰ ، ص ۲۹ ، ۳۰)

بعض اساتذہ نے ، پابندیاں عائد کرنے کے شوق میں ، یہ طے کر لیا کہ مفرد لفظوں کے تون کا اعلان لازماً کیا جائے گا ۔ ان میں متیر شکوہ آبادی اور شمشاد لکھنوی کا نام قابل ذکر ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ لزوم بالایلزام والی بات تھی ۔ یہ سہرت کی بات ہے کہ عام شعرا نے کبھی اس کی پابندی نہیں کی کہ ایسے مفرد الفاظ کو لازماً بہ اعلان تون نظم کیا جائے ۔ مفرد الفاظ کو دونوں طرح نظم کیا گیا ہے ، اور یہی صحیح طریقہ عمل تھا ۔ آخر لکھنوی مرحوم نے متیر کے اس التزام کے سلسلے میں کہ مفرد لفظوں کو لازماً بہ اعلان تون نظم کیا جائے ، ایک دل چسپ روایت لکھی تھی :

”متیر شکوہ آبادی ، شاگرد ناسخ نے ایک مطلع کہا ۔ ہاتھ ملتے تھے اور کہتے تھے ، ہاے کیا خوب مطلع ہے ، مگر دیوان میں نہیں رکھ سکتا ، کیوں کہ ”آسمان بے عطف و اضافت نظم ہوا ہے ، تاہم اعلان تون نہیں ہوتا :
گنبد قبر در دستان ٹوٹے اے زمین تجھ پہ آسماں ٹوٹے“
(رسالہ الحمرا لاہور ، مارچ ۱۹۵۷ء)

یہی تیسرا ایک جگہ نہایت مجبوری کے عالم میں کہتے ہیں،
 تیسرا افسر وہ ہوں پابندی حلف و اضافت کے وگردہ لطف دکھاتا مضامین گریباں کا
 (کلیات تیسرا، ص ۲۲۹)

ششاد لکھنوی کے متعلق، ان کے شاگرد شوق نیوی نے لکھا ہے،
 وہ لوگ جن کو اعلان پر بہت اصرار ہے، ان کے دیوان میں بھی بعض جگہ
 بہ نون غرض متعلق ہے۔ چنانچہ استاذی ششاد لکھنوی، جن کو شروکات سے
 نہایت ہی احتیاط ہے، اور اعلان کے باب میں بڑی کد رہتی ہے، ان کے
 دیوان خزانہ خیال میں یہ اشعار موجود ہیں: (ایضاح، حاشیہ اصلاح، ص ۱۸)
 اور دو شعر لکھے ہیں جن میں عنوان ”اور جنوں“ بہ اغضائے نون نظم ہوئے ہیں۔ شوق نے اسی
 سلسلے میں مزید لکھا ہے کہ: مولف بھی وجوہاً اعلان نون کا پابند نہیں۔ — مفرد الفاظ میں
 اعلان نون کے سلسلے میں ارباب لکھنوی، سب سے زیادہ متوازن اسے خورشید لکھنوی
 کی تھی۔ انھوں نے ”نون“ اور جان کے ذیل میں لکھا ہے:

”گو بعض اساتذہ کل الفاظ فارسی کو، جس میں نون بعد حرف مد واقع ہے، بہ اغضائے
 نون بغیر ترکیب فارسی ترک کر چکے ہیں، براہِ مشنانا ان الفاظ کے جن میں اغضائے
 نون واجب ہے، مثلاً نہاں، عیاں، زیاں وغیرہ کے؛ مگر میں نے ان دونوں
 نظموں کو تو بالکل ترک کر دیا ہے، کیوں کہ خاص ان دونوں نظموں کو بہ اغضائے
 نون بے ترکیب فارسی لانا، زبان پر بہت ہی برا معلوم ہوتا ہے، اور چنداں ان
 کی پابندی میں وقت اور خوف بے مزگی کلام بھی نہیں ہے، بہ خلاف اور جملہ
 الفاظ کے، کہ ان میں دونوں باتیں ہیں، یعنی زبان پر گرا بھی نہیں معلوم ہوتا اور
 پابندی میں خوف بے مزگی کلام وقت بھی بہت ہے؛ لہذا اور سب کو جائز
 رکھا ہے، ترک نہیں کیا ہے، مثلاً زبان، جہان، آسمان وغیرہ کے۔ (اقادات، ص ۳۲)

اصل بات یہی ہے کہ وقت ”اثر بے مزگی کلام“ صحیح معیار ہے اعلانِ نون کے مناسب و غیر مناسب ہونے کا۔ جہاں کلام میں بے مزگی پیدا ہو، وہاں غلط ہے اور یہ بے مزگی، کہیں اخفا سے بھی ہو سکتی ہے اور کہیں اعلان سے بھی ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں ایسا کوئی قاعدہ نہیں بنایا جاسکتا جس کے تحت قطعیت کے ساتھ یہ کہا جاسکے کہ نون کا اعلان یا اخفا، بجائے خود صحیح ہے یا غلط۔ اس سلسلے میں مفرد اور مرکب الفاظ ایک سا کیفیت رکھتے ہیں، ان میں کسی طرح کی تفریق نہیں کی جاسکتی۔ اس ضروری بات کی تکرار کی جاتی ہے کہ حروفِ قلت کے بعد آخر لفظ میں واقع نون کے اعلان یا اخفا کے مسئلے کو کسی قاعدے کا اسیر نہیں بنایا جاسکتا۔ یعنی یہاں یہ سوال سرے سے نہیں پیدا ہوتا کہ نون کا اعلان غلط ہے یا صحیح، بل کہ مسئلہ مناسب و غیر مناسب کا ہے؛ اور مناسب و غیر مناسب کا فیصلہ، قاعدے کی رو سے نہیں، محض کلام کی رو سے کیا جائے گا، جہاں جیسے ضرورت ہو۔

مختارات امیرینائی

ادبی خطوطِ غالب کے مولف مرزا محمد عسکری صاحب نے خدا اُن کی قبر کو
 طعطر اترے، مولانا غلام رسول قہر مرحوم کو ایک خط میں لکھا تھا:
 ”حضرت خود ستانی بہت بُری چیز ہے، مگر اتنا کہ بغیر نہیں رہ سکتا کہ
 ادبی خطوطِ غالب، مطبوعہ ۱۹۲۹ء، مرزا غلام غفران نے وہ کام کیا جو ہوا، اُن
 کے ساتھ کرتی ہے۔ یعنی اُن لوگوں کے دلوں میں، جن میں غالب پر ریسرچ
 کرنے کا سادہ گویا دیا ہوا تھا، اُس کو بہت زور سے اُبھار دیا“ (انقرض،
 مکتب نمبر، ص ۱۸۳۶)۔

مرزا صاحب مرحوم کی اس تالیف کو پڑھ کر مجھے غالب پر تو ریسرچ کرنے کی جرأت
 ہوئی نہیں یہ ہماری پتھر سٹھا، جو بے بغیری چھوڑ دیا۔ ہاں یہ خیال ضرور آیا کہ جس طرح
 انھوں نے غالب کے خطوں کے اقتباسات کو ایک خاص انداز سے یکجا کر دیا ہے، اُسی
 سے لگا جلتا ایک سلسلہ شروع کیا جائے جس میں مشہور سائنسدانوں کے خطوں میں سے
 ایسی عبارتوں کو منتخب کیا جائے جن میں کسی ادبی مسئلے پر رائے ظاہر کی گئی ہو، کسی کتاب پر
 اظہارِ خیال کیا گیا ہو، زبان و بیان سے متعلق کسی استفسار کا جواب دیا گیا ہو، یا اصلاح
 شعر کے ضمن میں کسی نکتے کی وضاحت کی گئی ہو، اور اُن پر توضیحی حواشی لکھے جائیں یہ مضمون

جو اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے، اُسی خیال کا نتیجہ ہے۔

اُردو شاعری کا وہ دور جو ناسخ سے شروع ہو کر، آئبر و جلال پر ختم ہوتا ہے، زبان و بیان کے لحاظ سے اہم حیثیت رکھتا ہے۔ بہت سے قاعدے اُسی زمانے میں وضع کیے گئے۔ شاعری کو نئی نئی پابندیوں میں مقید کرنے کا رجحان اُسی عہد کی پیداوار ہے۔ مترکات کی ساری غیر ضروری بخشیں اُسی دور میں انہیں تذکیر و تائید، تلفظ اور غلط و صحیح کے دبستانی معیار کے ہنگامے بھی اُسی عرصے میں صفت آرا ہوئے۔ خاندانِ ناسخ کے شاعروں نے اور اُن کے زیر اثر دوسروں نے، اُن قاعدوں کی پابندی کو فرض میں قرار دیا جن کو تلامذہ ناسخ نے اور خاص طور پر رشک نے، آیت و حدیث کا درجہ بخش دیا تھا۔ یہی نہیں، رفتہ رفتہ، رجحان بھی فروغ پانے لگا کہ اُن پابندیوں کے ساتھ نئے نئے التزامات کو بھی شامل کیا جائے۔ نوریت یہاں تک پہنچی کہ مستند اساتذہ کے مختارات و مترکات کی فہرستیں الگ الگ مرتب ہو گئیں، جن کی پابندی اُن کے حلقہٴ گوشوں کے لیے لازم تھی۔ اس کا ایک نتیجہ بھی ہونا چاہیے تھا کہ معمول سے اختلافات پر غیر معمولی بخشیں شروع ہو جائیں جن میں اشباتِ حق سے زیادہ، اپنی بات کے برحق ہونے پر زور دیا جائے۔ اور یہ ہوا۔

دلی و لکھنؤ کا اختلاف، پُرانی و داستان ہے۔ سید اشفاق دریاے لطافت میں اُس کی ابتدائی تفصیلات کو دیکھا جاسکتا ہے۔ آئبر و جلال کے ابتدائی زمانے تک یہ اختلافات، بہت سے مرحلے طے کر چکا تھا اور اُن کے آخری زمانے تک یہ معراجِ کمال پر پہنچ چکا تھا۔ داغ کے ابتدائی دورِ شاعری تک، اساتذہ دلی کے یہاں قواعدِ زبان و بیان کے سلسلے میں، اساتذہ لکھنؤ کی طرح سخت گیری نہیں تھی اور التزام کا وہ عالم تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ شاعری کے سارے غیر ضروری ضابطے لکھنؤ ہی میں وضع کیے گئے اور اُن کی لازمی پابندی پر بھی وہیں زور دیا گیا۔ اساتذہ دلی کے یہاں یہ رجحان تقریباً مفقود تھا۔ اخلا و اطلال، نون، سقوطِ حروفِ علت، تراکیبِ مہند جیسے قاعدوں کو اساتذہ دلی نے قابلِ التفات ہی

نہیں سمجھا سکتا۔ اور متروکات کی فہرستیں بھی یہاں نہیں بنائی گئی تھیں۔ داغ نے البتہ ان حضرات کی طرف باقاعدہ توجہ کی اور اپنے شاگردوں کے لیے ان پابندیوں کو ضروری قرار دیا۔ وہ تنہا اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ لیکن یہ بات ہمیشہ نظر رہنا چاہیے کہ داغ کے یہاں اس رجحان کے فروغ پانے کی اصل وجہ، دوبارہ رام پور سے اُن کی وابستگی تھی۔

رام پور میں نواب کلب علی خاں کے زمانے میں، اساتذہ اُردو کا جو بے مثال اجتماع ہو گیا تھا، اُس میں اکثریت اساتذہ لکھنؤ کی تھی۔ دہلی کی ٹائینڈگی کرنے والوں میں نمایاں شخصیت داغ کی تھی۔ نواب کلب علی خاں کو متروکات، تذکیر و تانیث اور اس قسم کے دوسرے مسائل سے خاص دل چسپی تھی، جس کے اثر سے مصاحب منزل کے جلسوں میں ایسی بحثیں برابر ہوتی رہتی تھیں۔ اس صورت حال کا یہ نتیجہ ہونا ہی چاہیے تھا کہ داغ کی توجہ ان مسائل کی طرف منعط ہو یہ وہی صورت حال تھی جو مصطفیٰ کو لکھنؤ میں پیش آئی تھی اور جس کا ذکر انھوں نے اپنے دیوان ششم کے دیباچے میں کیا ہے۔ مصطفیٰ جیسے شاعر اور اُستاد کو، لکھنؤ کے مشاعروں میں کامیاب ہونے کے لیے، تاریخ کے انداز کو اپنا لہجہ بنا سکتا۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے مقدمہ انتخابِ ناسخ، اشائع کردہ مکتبہ جامعہ دہلی)۔

لکھنؤ میں جس تہذیب کی آب یاری ہوئی، اُس میں ظاہر آرائی پر بہت زور تھا۔ دہلی سے متاثر ہو رہنے کے احساس نے، جذبہ رقابت کو فروغ بخشا۔ کوشش کی جانے لگی کہ زندگی کے مختلف مظاہر میں ختمین کی نمود اس طرح ہو کہ امتیاز برقرار رہے۔ ایسے حالات میں بے روح ظاہر آرائی کو فروغ ہوتا ہے اور سلی باتوں کو بنیادی حیثیت مل جاتی ہے۔ شاعری میں بھی اسی کی نمود ہوئی۔ لکھنؤ کی زبان اور انداز کو امتیاز کا شہرت بخشنے کے لیے، اور عناصر کے علاوہ، مختلف قسم کی پابندیوں کو نافذ کرنے کا رجحان بھی اسی کی دین ہے۔ دہلی میں یہ صورت حال تھی ہی نہیں۔ وہاں کسی نئی معاشرت کا نقش درست نہیں ہو رہا تھا، وہاں کی تہذیبی روایتوں کو کسی طرح کے مقابلے کا احساس تھا،

جس کے لیے غیر ضروری التزامات کی ضرورت ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی میں قواعدِ شاعری کی تفصیلات اس طرح مرتب نہیں ہوئیں۔ دارغ کے شروع کے کلام میں قواعدِ شاعری اور متروکات کے لحاظ سے ایسی کئی چیزیں ملتی ہیں جن کو انھوں نے بعد میں ترک کر دیا۔ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ قواعدِ شاعری، متروکات وغیرہ کی بہت سی بکٹیں اُسی زمانے میں اٹھی تھیں، جن کی تہ میں دہلی و کھنڈو کی دبستانی کش مکش کا رفرما تھی، اور اس طسرح دبستانی اختلافات زیادہ وسعت اور شدت کے ساتھ معرضِ بحث میں آئے، جس کے اثرات بہت دنوں تک فضا میں صداے بازگشت پیدا کرتے رہے۔

یہ دور ایک اور لحاظ سے بھی اہم ہے۔ اردو کے کئی مشہور رُفعت اسی زمانے میں مرتب ہوئے، جیسے: نفس اللغات، فرہنگِ آصفیہ، امیر اللغات، گلشنِ بیض (وغیرہ)۔ فرہنگِ آصفیہ کو کچھ لوگوں نے دہلی و کھنڈو کے دبستانی اختلافات کی روشنی میں دیکھا اور حلال کے رُفعت کو مان کے بعض مخالفوں نے اعتراضات کی کسوٹی پر کسا۔ اس طسرح بھی بہت سی بکٹیں اٹھیں، جو دنوں تک اخبار و رسائل کے صفحات پر دل چسپی کے گل کھلاتی رہیں۔ اسی دور میں زبان و بیان کے عام مباحث، متروکات اور تذکیر و تائید پر بھی کئی رسالے لکھے گئے، جیسے کلبِ حسین خاں ناؤر کی کتاب تلفیضِ سنی، صفیر بگلہاری کی رُشحاتِ صفیر، حلال کے رسالے ملید الشعر اور قواعد المختب، شوخی نبوی کے رسالے اصلاح اور ازاحۃ الاغلاط، کمالِ طلع جلال کا رسالہ دستور الفصحا وغیرہ۔ یہ سب اُس زمانے کی بہت سی بحثوں کی دستاویزیں ہیں۔ ان رسالوں کے اثر سے بھی ضروری اور غیر ضروری بحثوں میں اضافہ ہوتا رہا۔

غرض یہ زمانہ معرکے کی بحثوں کا ہے۔ ان بحثوں کے کچھ اجزاء مختلف کتابوں میں محفوظ ہیں اور کچھ اساتذہ کے مکاتیب میں۔ اُس زمانے میں شاگردی و استادی کا رشتہ بہت اُستوار ہوتا تھا۔ اساتذہ کی یہ کوشش رہتی تھی کہ زبان و بیان کے مسائل، خاص طور

ہمرا خطائی امور کو تلامذہ کے ذہن نشین کرایا جاتے اور ان کی پابندی کرائی جاتے۔ یہ فریضہ جواب استفسارات کے علاوہ، اصلاح کلام کے ذیل میں مفید حواشی کے واسطے سے بھی افاد کیا جاتا تھا۔ دوسرے لوگ بھی زبان و بیان سے متعلق سوالات پوچھتے رہتے تھے، اور یہ لوگ فراغ دلی کے ساتھ جواب دیتے تھے۔ اساتذہ کے ایسے خطوں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں قابل قدر معلومات محفوظ ہیں اور ان خطوں کا مطالعہ، بہت سی باتوں کو مختلف انداز سے سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

متعدد اساتذہ کے خطوں کے مجموعے چھپ چکے ہیں جن لوگوں کے مجموعے نہیں چھپے ہیں، ان کے بہت سے خط دوسرے مجموعوں میں محفوظ ہیں۔ صدر مرزا پوری نے مرتبہ ادب کے نام سے دو جلدوں میں خطوں کا ایک نہایت دل چسپ اور قابل قدر مجموعہ لکھی یادگار چھوڑا ہے۔ ان کی ایک دوسری تالیف مطالعہ سخن میں متعدد اساتذہ کی اصلاحیں اور ضروری تشریحات یک جہا ملتی ہیں۔ مجلۂ نقوش (لاہور) کے مکاتیب نمبر کی دو ضخیم جلدیں بے شمار خطوں کی امین ہیں اور خطوط نمبر کی تین جلدیں اب سے چند سال پہلے آئی ہیں، جو نہایت اہم خطوط کا مجموعہ ہیں۔ فن اصلاح پر لکھی گئی کتابوں میں، خصوصاً مطالعہ سخن کی دو جلدوں میں، اصلاحات کے ذیل میں، خطوں کے اقتباسات بھی شامل ہیں۔ مختلف رسائل میں بہت سے خط چھپے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ زبان و بیان پر کام کر کے والوں کے لیے ان سب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

.....

اس سلسلے کی پہلی قسط مکاتیب امیر مہاشی پر مشتمل ہے۔ امیر احمد امیر مہاشی، تلمیذ امیر، اپنے زمانے کے معروف و مستند استاد تھے۔ ولادت ۱۶۱۱ھ شعبان ۱۲۴۳ء۔ وفات: ۱۸ جمادی الثانی ۱۳۱۸ء (سوانح امیر مرتبہ جلیل مانگ پوری)۔ اس زمانے میں امیر وراثت سے زیادہ شاگرد و شاہد کسی کو نصیب ہوئے ہوں۔ امیر مہاشی کے خطوں کے مطالعے سے

نیز ان کے سوانح سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وسیع الاخلاق انسان اور شفیق استاد تھے، اور نکات زبان دیان مٹانے میں فراخ دل۔ ان کے شاگرد احسن اللہ خاں نائب نے مکاتیب امیر کی ترتیب کے سلسلے میں ان کے بعض تلامذہ و اخلاص کے مددگاروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "اس بے پروائی کے ساتھ جب جناب مرحوم کا خلق اور محبت و ادائیگی تو زانا نکمہوں میں تیرہ و تار ہو جاتا ہے۔ ایسا کوئی عرب نہیں نے استاد کی خدمت میں نہیں بھیجا کہ جس کا جواب دیا گیا ہو اور کوئی ایسا مسد فن شعر کے متعلق دریافت نہیں کیا کہ جس کی جانب تو ہم ذفرائی ہو" (دیباچہ مکاتیب امیر) یہی وہ ہے کہ امیر کے خطوں میں مختلف مساکں بکھرے ہوئے ہیں۔ امیر اللغات کے مولف کی حیثیت سے بھی ان کو بہت سے استفسارات کا جواب دینا پڑتا ہوگا۔

امیر کے سب خط شائع نہیں ہو سکے۔ بہت سے خط جو ان کے کسی شاگرد نے جمع کیے تھے، گم ہو گئے۔ انہوں نے اپنے شاگرد آزاد سہارن پوری کو ایک خط میں لکھا تھا: "خطوط جب میں فکر سے اچھے لکھتا تھا، وہ ذخیرہ ایک سو کئی تیز کا میرے ایک شاگرد نے جمع کیا تھا۔ سولہ برس ہوئے کہ وہ بے چارہ مر گیا اور اس ذخیرے کا پتا نہ لگا۔ تین چار شاگردوں نے کبھی کبھی کچھ خطوں کی نقلیں اپنی پسند کے موافق لکھ لیں، وہ بجا کہا ہیں۔ بعض تحریروں کی نقلیں لڑکوں نے کر لی ہیں۔ اور جب سے دفتر امیر اللغات کھولا گیا ہے، مخزنان دفتر بعض مکاتیب لکھ لیتے ہیں یہ سب بھی جمع ہوں، تو ایک مجموعہ ہو سکتا ہے؟" (مکاتیب امیر پٹائی، ص ۱۶۳۔ مکتوبہ ۷، اپریل ۱۸۹۱ء)۔

احسن اللہ خاں نائب نے بہت کوشش کی، لیکن مجموعہ مکاتیب امیر کے دوسرے اڈیشن میں وہ ۲۳۲ سے زیادہ خط جمع نہیں کر سکے۔ ان کے لکھنے کے مطابق، امیر کے بعض تلامذہ اور اخلاص نے بالکل تعاون نہیں کیا۔ امیر کے شاگردوں کے پاس یقیناً خطوں کا

اچھا خاصہ ذخیرہ تھا، مگر مختلف وجوہ سے، وہ سب خط سائے نہیں آ سکے۔ تاہم سہ ماہی پوری نے ایک خط میں ثاقب کو لکھا تھا:

”عمر ہوا، میرا وہ کس جس میں ضروری کاغذات رہا کرتے تھے، چوری گیا تھا۔ اس میں ۱۸۸۷ء کے قبل کے اکثر خطوط تھے۔۔۔ بعض خطوط اس لیے نقل نہیں کر سکا کہ جناب مرحوم نے ان کو نظیر غیار سے محفوظ رکھنے اور کسی کو نہ دکھانے کی تاکید کردی تھی۔ باقی ارسال خدمت شریف ہیں؟“ (مکاتیب امیر پٹانی ص ۱۵۳)

اسی خط میں آگے چل کر تاہم نے لکھا ہے: ”جناب مرحوم کے خطوط اگر زیادہ مطلوب ہوں تو آخری منشی محمد احمد صاحب گمر سے رام پور میں، اور منی حافظ جلیل حسن صاحب سے جہد آباد دکن میں، اور مشفق ممتاز علی صاحب آہ۔۔۔ سے ضرور خط و کتابت کیجیے، جن میں سے آخر الذکر کے پاس یقیناً پورا ذخیرہ جمع ہو گا، کیوں کہ انھوں نے بھی کچھ دن ہوئے ایسا ہی قصد کیا تھا، جواب تک بعض وجوہ سے انجام کو نہیں پہنچا۔“ لیکن ان لوگوں میں سے کسی نے خط ثاقب کے حوالے نہیں کیے۔ تاہم نے جو امیر کی سوانح طری لکھی ہے، اس میں صورتِ آٹھ خط درج کیے ہیں۔ اس مقالے میں مکاتیب امیر کے اقتباسات کے لیے درج ذیل مآخذ پیش نظر رہے ہیں:

(۱) مکاتیب امیر پٹانی: امیر کے شاگرد مولوی احسن اللہ خاں ثاقب نے ۱۹۰۳ء میں ان کے خطوط کو جمع کرنے کی طے تو یہ کی۔ ۱۹۱۰ء میں یہ مجموعہ مکمل ہوا (دیباچہ) مجھے پہلا ایڈیشن نہیں مل سکا۔ دوسرے ایڈیشن کے آخر میں جو قطعات تاریخ طبع ہیں، ان میں ایک قطعہ وحشت کلکتہ کی کا بھی ہے جس کا آخری شعر یہ ہے: فکر تاریخ دا شتم وحشت و گشت ہائے ہائے بیخ مکتوبات؟ اس سے سال طبع ۱۹۱۱ء نکلتا ہے۔ اس کا تاریخی نام ”خطوط منشی امیر احمد“ ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن نظر ثانی اور اضافے کے ساتھ، ۱۹۲۳ء میں مطبع ادیبیہ

راٹوش روڈ لکھنؤ سے شائع ہوا یہی اڈیشن پیش نظر ہے۔ اس مجموعے میں کل ۲۲۲ خط ہیں۔ بشرودع میں ایک مفصل مقدمہ ہے، جس میں امیر کی سوانح، تصانیف اور تلامذہ کے مختصر تذکرے کے ساتھ ساتھ، امیر و داغ کی شاعری کا اقبال بھی کیا گیا ہے۔ اشاعتِ اول پر جو تبصرے ہوئے تھے، وہ بھی آخر میں شامل کر دیے گئے ہیں۔ خطوں کے پیش تر اقتباسات اسی مجموعے سے لیے گئے ہیں۔

(۲) مربعِ ادب : صدقہ مرزا پوری نے اساتذہ کے خطوں کا ایک مجموعہ، دو جلدوں میں مرتب کیا تھا۔ اس کی پہلی جلد میں امیر کے ۲۲ خط ہیں۔ ثاقب نے مکاتیب امیر دہلوی کے دوسرے اڈیشن میں ان خطوں کو شامل کر لیا ہے۔ اس کی دوسری جلد میں امیر کے دس خط ہیں۔ یہ دسوں خطوں کو شاہ جہاں پوری کے نام ہیں۔ ان میں سے تین خطوں کے اقتباسات اس مقالے میں شامل کیے گئے ہیں، ان کے نمبر ہیں: ۵۵، ۵۶، ۵۷۔

(۳) نقوش : اس کے مکاتیب نمبر میں امیر کے جو وہ خط ہیں۔ ان میں سے چھ خط تو واقعتاً پہلی بار شائع ہوئے ہیں (دو خط نام و حکم خیر آبادی، ایک خط نام داغ، دو خط نام راز رام پوری، ایک خط نام احسن مارہروی) باقی آٹھ خط جو بہ نام دل شاہ جہاں پوری ہیں، وہی ہیں جو مربعِ ادب کی دوسری جلد میں شامل ہیں۔ ان میں سے سات خط تو مکمل ہیں، اور ایک خط نام، نامکمل ہے۔ یہ مربعِ ادب میں مکمل صورت میں موجود ہے۔ اول الذکر چھ خطوں کا کوئی اقتباس اس مقالے میں شامل نہیں۔

(۴) سوانحِ امیر : امیر کے شاگرد اور عزیز، شاہ محمد ممتاز علی آہ لے امیر کی سوانح عمری لکھی تھی، جو ان کے انتقال کے بعد، ادبی پریس لکھنؤ سے ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی۔

اس نا تاریخی نام "سیرت امیر احمد دہلوی" ہے۔ آہ کا انتقال ۵ ہر رمضان ۱۳۵۳ھ کو ہوا تھا۔ دوبارہ سوانحِ امیر اس کتاب میں امیر کے آٹھ خط ہیں۔ یہ آٹھوں خط آہ کے نام ہیں۔ ان میں بھی زبان و بیان سے متعلق کوئی خاص بات نہیں۔ ان خطوں سے بھی کوئی

نہ خارجی طور پر، نہ داخلی سطح پر۔

مشاطہ سخن : صفدر مرزا پوری نے اسانڈہ کی اصلاحوں کو دو جلدوں میں جمع کیا ہے۔ اس میں امیر کی اصلاحات کے ذیل میں متعدد خطوں کی مختصر عبارتیں بھی درج ہیں ان میں سے تین عبارتیں ایسے خطوں کی ہیں جو مجموعہ مکاتیب مرثیہ ثاقب میں موجود نہیں، دکھیں اور ملتے ہیں۔ ان عبارتوں کو بھی پرنٹل مکاتیب شامل کر لیا گیا ہے۔ حاشیے میں نشان دی کر دی گئی ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ مشاطہ سخن میں ان مذکورہ عبارتوں کے علاوہ، امیر کے کچھ ان خطوں کی بھی عبارتیں مع اصلاحات منقول ہیں جو ثاقب کے مرثیہ مجموعے میں شامل ہیں، متعدد مقامات پر مشاطہ سخن اور مجموعہ مکاتیب کی عبارتوں میں اختلاف ملتا ہے۔ میں نے ایسی عبارتوں کو عموماً مشاطہ سخن کے مطابق لکھا ہے اور بالعموم اس کی صراحت بھی کر دی ہے۔ اگر کہیں اس کے خلاف کیا ہے تو اس کی بھی نشان دی کر دی ہے۔ کئی جگہ یہ صورت ہے کہ مشاطہ سخن میں امیر کے کتب کی جو عبارت منقول ہے، اس عبارت کا کچھ حصہ مشاطہ سخن میں تو ہے، مگر مجموعہ مکاتیب میں موجود نہیں، ایسی عبارتوں کو قوسین میں لکھا گیا ہے اور حاشیے میں اس کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

سوانح امیر پینائی : جلیل مانک پوری دہلی (پنڈت امیر) نے امیر کی مختصر سی سوانح عمری اور طویل انتخاب کلام پر مشتمل ایک کتاب مرثیہ کی تھی، جو مطبع سیدی دارالشفاحہ رباباد سے ۱۳۴۷ء میں شائع ہوئی تھی اس کتاب میں امیر کا کوئی خط یا کسی خط کی عبارت تو موجود نہیں، البتہ لفظ "سدا سے متعلق امیر کا ایک قول درج ہے۔ چوں کہ اس لفظ کے متعلق امیر نے کہیں اور اسے ظاہر نہیں کی ہے اور کہا ہے خود یہ اسے بہت اہم ہے خصوصاً بحث متروکات کے سلسلے میں، اس لیے اس قول کو بھی اس مقالے میں شامل کر لیا گیا ہے، اس کا نمبر ہے ۷۱۔

ہماری زبان : رسالہ اصلاحِ سخن (لاہور) میں امیر کے تین خط شائع ہوئے تھے۔ ہماری زبان (علی گڑھ) کے شمارہ یکم نومبر ۱۹۶۳ء میں سلطان اشرف صاحب نے ان خطوں کو اصلاحِ سخن سے نقل کر کے شائع کرایا ہے، مگر انہوں نے یہ نہیں لکھا کہ یہ خط اس رسالے کے کس شمارے میں شائع ہوئے تھے۔ یہ تینوں خط حقیقتاً جون پوری دکنیہ امیر کے نام ہیں۔ ان خطوں سے بھی کوئی اقتباس نہیں لیا گیا ہے۔ اے، اے، 'اصلاحِ سخن' کے اوٹپر، دانش کے معرود شاگرد و ماہر ہت جھنجھاری تھے، جن کی کتاب آٹھ اٹھانِ افسانہ دلی دکنیہ کی دبستانی کش مکش کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

نقوش : نقوش کے خطوط نمبر کی پہلی جلد میں امیر کے سات خط چھپے ہیں مگر ان میں سے اکثر خط مطبوعہ ہیں۔ صرف ایک خط سے ایک اقتباس اس مضمون میں شامل کیا گیا ہے۔ اس کا نمبر ہے ۷۱۔

ساجد نثار اردو : تالیف مولانا احسن مارہروی، متوفی : ۱۲، اگست ۱۹۴۰ء (جلوہ احسن، ص ۱۶۷) اس میں امیر کا ایک خط ہے۔ اس خط کو اس مضمون میں شامل کیا گیا ہے (۷۱) مولف کی صراحت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب دو جلدوں پر منقسم کی گئی تھی پہلی جلد ۱۹۳۰ء میں، مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں چھپی تھی۔ دوسری جلد کے متعلق یہ لکھا گیا تھا کہ یہ 'زیر طبع' ہے، مگر یہ دوسری جلد شائع نہیں ہو سکی۔ مولانا کے صاحبِ نام رفیق احسن مارہروی نے اپنی کتاب جلوہ احسن میں لکھا ہے : 'افسوس اس کتاب کی دوسری جلد مولانا مرحوم ترتیب زدے تھے، مالاں کہ مواد سب موجود تھا۔ وہ مواد میری دسترس سے دور ہے، ورنہ ساجد نثار اردو کی دوسری جلد ضرور طبع اور شائع ہوتی' (جلوہ احسن، ص ۷۷) معلوم نہیں صحیح صورت حال کیا تھی۔

جناب ابو محمد محمد نے اپنی کتاب مطالعہ امیر میں لکھا ہے کہ "سوانح اسلاف مولفہ ولایت علی خاں عزیز صنفی پوری ۱۶ء اور رسالہ نیرنگ روٹی، کے امیر نہیں ہیں، بلکہ امیر کے بعض

خط ہیں اور دو خط ارشاد میری رام پوری ہیں۔ میں ان خطوں کو نہیں دیکھ سکا۔ ممکن ہے ان میں کوئی خط ایسا ہو جن میں کوئی ادبی مسئلہ زیر بحث آیا ہو۔

اتیر کے خط کئی جگہ چھپے ہیں، عبارتوں کا مقابلہ کرنے پر معلوم ہوا کہ بعض جہوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف لوگوں نے خطوں کی نقلیں تیار کیں۔ اظہار کتابت مزید برآں مثلاً لفظ "پارسل" ایک خط مشمولہ محمود مکاتیب میں موٹا لٹا ہے، "پارسل دیوان کی رواد کرتا ہوں" مکاتیب امیر میثانی، مرثیہ ثاقب، ص ۲۴۱۔ مرتبہ ادب کے دوسرے صفحے میں ص ۳۱ پر اتیر کا ایک خط یہ نام دل شاہ جہاں پوری ہے، "اُمس میں یہ لفظ مذکر ہے" آپ کا پارسل آیا ہوا ہے۔ لفظ "دُمل" محمود مکاتیب میں ایک جگہ موٹا ہے: "ایک دُمل نعل آئی تھی" ص ۲۵۲، اسی جگہ کے ایک دوسرے خط میں یہ مذکر ہے: "میری ران میں ایک دُمل نعل آیا ہے" ص ۳۴۳، یہ خط مرتبہ ادب حصہ اول سے ماخوذ ہے، اور وہاں بھی مذکر لکھا ہوا ہے۔ ایسی اور مثالیں بھی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ یہ پہلو بھی نظر میں رہنا چاہیے۔ ہاں، یہ عرض کر دوں کہ اتیر نے "پارسل" کو مذکر ہی لکھا ہے۔ نقوش کے خطوط میر کی پہلی جلد میں اتیر کے خط کا عکس چھپا ہے، "اُمس میں" آپ کا پارسل آیا ہوا رکھا ہے" لٹا ہے۔

اتیر کی یہ تحریروں اس لحاظ سے بھی دیدنی ہیں کہ قواعد زبان و بیان پر کام کرنے والوں کو ان میں بہت مسالا ملے گا۔ بہت سے جملوں کی بناوٹ، ترکیبیں وغیرہ قابلِ توجہ ہیں۔ بعض انور کی طرف اشارے کیے جاتے ہیں۔ قوسین میں مکاتیب امیر میثانی مرثیہ ثاقب کے صفحات نمبر ہیں۔

(۱) عبارتوں میں تراکیب مہند کا استعمال بے تکلفی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ جیسے ۱

لوچ دار (۱۸۷۷) متعلیٰ شریک (۳۰۹) جگ آشتا (۲۵۷) پر واپسی ڈاک (۲۳۹)

کیونٹی انتخاب (۲۳۶) مزے دار (۱۸۷۷) مہر ان کیشتی (۲۲۸) ارکان اشاف (۲۳۸) وغیرہ

(۲) بعض الفاظ کا استعمال مثلاً آئیر نے ہر جگہ ”سر سری“ کے بجائے ”سراسر“ لکھا

ہے یا جیسے: لغت میں مصروفی اور محنت کی بہت حاجت ہے؟

(۳) بعض صفتیں جیسے: خوب صورت نیا قتلص (۲۹۵) بعض محاورے جیسے:

خیر بھائی، تمہاری ہی آنکھ اونچی رہے (۲۰۶) ”آنکھ اونچی رہتا“ ذوق فریبگ آصفیہ میں ہے
ذوق واللغات میں۔ امیر اللغات بھی اس سے خالی ہے۔

کئی خطوں میں امیر اللغات کا ذکر ہے اور اس کے واسطے سے کچھ ایسی ہی باتیں آگئی
ہیں جن سے ہم معلوم ہوتا ہے کہ لغت نویسی کے سلسلے میں آئیر کا انداز فکر کیا تھا۔ اور یہ کہ محنت
پسندی اور فصاحت کے معیار کے سلسلے میں اُن کے سوچنے کا کیا ڈھنگ تھا۔ خطا انھوں
نے ایک خط میں لکھا ہے کہ کلامِ فقیر اکبر آبادی نے ایک لفظ کا فائدہ نہیں دیا۔ اس سے ہم
اندازہ ضرور کیا جاسکتا ہے کہ لغت نویسی کا محدود تصور اور معیار پسندی کا مسلہ انداز
اُن کے بھی سامنے کا پھر تھا۔ ایسی ہی بعض اور باتیں نتائج کے کام کرنے والوں کے سامنے
یہ سارے مسائل و معاملات رہنا چاہیے اور اس لحاظ سے ان خطوں کی بھی اہمیت ہے۔
متروکات، بعض قواعد اور متعدد الفاظ کے سلسلے میں جو رائیں ظاہر کی گئی ہیں، اُنچ زبان و
بیان پر کام کرنے والوں کو اُن سے بھی واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔

ان خطوں میں بہت سے مختلف فہم مسائل کا ذکر ہے اور آئیر کی کچھ رائیں، موقوف
معلومات کی روشنی میں، نظر ثانی کی طلب گار نظر آتی ہیں، حواشی میں ان امور کو ملحوظ رکھا
گیا ہے۔ آئیر کے خطوں میں جن کتابوں کے نام آئے ہیں، ان میں سے بیش تر کے متعلق
ضروری معلومات کو یک جا کر دیا گیا ہے۔ خطوں میں جو اشارے آئے ہیں، شعرا کے
دواوین سے اُن کا مقابلہ کر لیا گیا ہے اور دواوین کے صفحات نمبر بھی لکھ دیے گئے ہیں۔
خطوں میں سے انہی عبارتوں کو لیا گیا ہے جن میں زبان و بیان سے متعلق ایسی کتاب
کے متعلق یا کسی اہم فرد کے متعلق کچھ ملتا ہے۔ طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے خط کا

اقتباس درج کیا گیا ہے، پھر اُس سے متعلق ماثیے کی عبارت لکھی گئی ہے۔ جن خطوں میں تاریکین موجود ہیں، ان کے اقتباسات کے آخر میں اُن تارہ کنوں کو بھی لازماً لکھا گیا ہے۔ یہی صورت مکتوب الیہ کے نام کی ہے۔ اس مقالے میں بیش تر اقتباسات مکاتیب امیرِ وٹانی، مرتبہ ثاقب سے لیے گئے ہیں اور ان اقتباسات کے ذیل میں ماخذ کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔ جو اقتباسات دوسری جگہوں سے لیے گئے ہیں، ماخذ کے ذیل میں اُن کا ذکر آچکا ہے۔ ہر اقتباس کے اوپر نمبر شمارہ والا گیا ہے خطوں کی جو عبارتیں منتخب کی گئی ہیں، ان کو صفحے پر اسی طرح لکھا گیا ہے جس طرح اقتباسات لکھا جاتا ہے، اور اس کے بعد غشی کی عبارت، نسبتاً خفی قلم سے لکھی گئی ہے۔

اقتباسات میں جو مباحث آئے ہیں یا جن کتابوں کے نام آئے ہیں اور ان پر حواشی لکھے گئے ہیں، اُن کی فہرست ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔ اس سے مطلوبہ بحث کو برآسانی دیکھا جاسکتا ہے۔ ہر لفظ کے سامنے خط کا نمبر شمار بھی لکھ دیا گیا ہے:

متروکات

ابر کی بوند	۳۲، ۳۳	ساکھا	۳۵
انگھڑیاں	۱۲	سدا	۶۱
باٹ دیکھنا	۳۳	مہیں (میں ہی)	۱۳
سہانا	۱۳، ۳۵	واں	۳۶
پرے	۳۴	دیا	۳۷
پہ (پہر)	۳۷	ہووے، ہوئے	۱۹
ڈھونڈھے ہے	۲۷	یاں	۳۶
رکھیں	۳۵		

تذکرہ و تانیث

۳۵	سہا شا، سہا کا	۱۳	ایجاد
۳۵، ۳۶	بلعم با عور	۵۳	برس
۱۹	بعد میں	۲۹	تو
۱۳	بعد نا	۱۳	دشنام
۳۹	پیار	۹	دولت سرا
۳۹	پیراک، تیراک	۵	م
۵۵	تیروں کا گنہاں ہو کر بیٹھنا	۵	مردم دیدہ
۵۹	ہاے سے باہر ہونا	۲۴	مشری
۲۳	جرس کھڑکنا		
۱۵	چچقلش		
۵۶	چلن		
۱۱	چھڑے		
۱۶	خبر کا دورا ہونا		
۲	خورد نوش		
۵۶	دامن بھلنا		
۳۳، ۳۴، ۳۵	ذہیل، دتل		
۳۸، ۳۹	زکریا		
۵	سن (سنہ)		
۹، ۱۰	گلخانہ		
۹، ۱۰	شہنوا		
۲۵	قدس		

الفاظ، محاورات، تلمیحات

۱	آری
۵۶	آستین بھلنا
۵۲	آنچل اور دامن
۱۳	اتجا اچھا
۱۳	ایک نکلے کا شرمندہ نہ ہونا
۱۳	ادیر سویر
۲۶	باٹ
۵	بانگی
۳	باہم در

قرار	۲۹	تاریخ گونی	۵۱
قرن	۳۰	تبیین	۳۰
کبر	۵۳	تعقید	۱۴
کشش اور جذبہ	۶۰	تعداد اشعار	۲۵
کبے کا گھر	۱۵	تضمین	۳۰
گریبان بھگنا	۵۶	تلاذہ کی تعداد	۶۲
گھاتل	۶۳	سقوطِ حرمینِ بخت	۱۴، ۲۳، ۳۹
گھر ڈبا، گڑھنا	۱۱	سنگارِ زمینیں	۲۵
مدفن	۱۵	سحر فی الفاظ میں حرمینِ ساکین	
مسالا	۱۰	کو متحرک کرنا	۲۵
مایقرا	۳۰	شتر گربہ	۳۰
موتی کی لڑی	۱۱	گل دستوں کے متعلق راے	۱۵
نشہ	۳۹	مجموعہ مکاتیب	۱۹

قواعد، عروض، دیگر امور

اخفائے نون	۵۹	مصطفیٰ کے استاد کا نام	۶۲
اطلاقِ نون	۳۹	ہدایات متعلق شاعری	۶
اضافہ مہندہ	۵۵	استغناء اور بحث کے	
ایضا	۵۲	متعلق راے	۳۳
اسیرِ لکھنوی	۶۲		
بعض ناگوار تضمینیں	۲۵		

کتابیں، رسالے، اخبار

۹۔	شکوہ ہند	۱۵۔	افادۃ تارک کونئی
۶۔	شرح قصیدۃ خورشید	۱۲۔ ۱۳۔ ۱۹۔ ۲۰۔	امیر اللغات
۲۔	منہم خاۃ معشوق	۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔	۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷۔
۲۱۔	فرنگ فرنگ	۳۔ ۴۔	انتخاب یادگار
۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔	گلشن فیض	۲۳۔	نہر بان قاطع
۲۷۔	گوہر انتخاب	۲۱۔ ۲۲۔	بہار ہند
۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔	مخزن المماورات	۲۲۔	خزینۃ الامثال
۲۔	مرآۃ الغیب	۱۵۔	داسن گل جبین
۳۔ ۶۔	معیار الاشعار	۲۵۔	رسالہ سند کیر و تانیث رنگ
۲۲۔	نجم الامثال	۶۔	رسالہ عروض باقافیہ
۱۔	نفس اللغۃ	۱۔	(یوسفیہ فی علم العروض و القافیہ)
		۲۷۔	سرمد بصیرت (معیار الاخطا)

(۱) آری (ماری)۔ مسالا :

”آری، میرے نزدیک ہندی ہے اس لیے کہ ”ماری“ تریہ و تنگ و ماہر کے معنوں میں فارسی عربی میں کہیں نظر سے نہیں گزرا۔ ہندی میں تو جیسے لکھنا خلافت اصول ہے۔ ہندی ^۱جین کہاں !

۱۔ ماری اور اصل عربی کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں : برہنہ (منتخب اللغات) عربی میں یہ تریہ و تنگ و ماہر کے معنوں میں مستعمل نہیں رہے معانی، اردو کا اضافہ ہیں۔ اردو میں عربی کے ایسے بہت سے لفظ

مسالاً، معلوم ہو رہا ہے کہ ”معالجہ کا مہندہ ہے، جو عربی میں مصطلح کی جیسے ہے اور

ہیں جن کے معنی کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں، لیکن اس تبدیلی سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایسے ہر لفظ کا اطلاق بدل جائے۔ ایسے اکثر الفاظ میں اطلاق تبدیلی نہیں ہوتی ہے۔ لفظ ”ماری“ بھی اسی فہرست میں شامل ہے، اس میں اطلاق تبدیلی کو لازم قرار دینا کچھ ضروری نہیں۔ یہ لفظ بالعموم آری سے لکھا جاتا ہے، اور یہ استعمال عام قلمی طور پر اس ہر دلالت کرتا ہے کہ اس لفظ میں معنوی تبدیلی کی بنا پر، اطلاق تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ آئیر نے امیراللفات میں اور ان کی تعلید میں صاحب نوراللفات نے اس لفظ کو حرفت العت کے ذیل میں درج کیا ہے (آری، لیکن کسی اور تحریر میں اس لفظ کا یہ اطلاق نظر سے نہیں گزرا۔ مستندین لکھنؤ کے لغات میں ان دونوں کے علاوہ، میر علی اوسط رشک شاگرد آج کا لغت نفس اللغات، ان کے شاگرد حلال کا لغت سرایۂ زبان اردو، اور مرزا یحییٰ یگانہ ما حق کا لغت بہار ہند قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے سرایۂ زبان اردو میں تو لفظ ”ماری“ یا ”آری“ موجود ہی نہیں باقی دونوں لغتوں میں ”آری“ ہے، مگر اس کو ”آرے“ کا مصغر لکھا گیا ہے، لفظ ”ماری“ کے معانی کو اس سے متعلق نہیں کیا گیا ہے۔ فرہنگ آصفیہ میں ”ماری“ اور اس کے جملہ مرکبات جین سے لکھے ہوئے ہیں۔ اس سے اہل دہلی کی رائے کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اس لفظ کو العت سے آری لکھنا، آئیر کی ایجاد تھی۔ یہ اطلاق ان کے لغت تک، اور اس خط کے زیر اثر نوراللفات تک محدود رہا۔ اردو میں ”آری“ ایک جدا گانہ لفظ ہے، ”آرے“ کا مصغر اس امتیاز کے لحاظ سے بھی ”ماری“ کو جین سے لکھنا انسب ہے۔ آئیر کا یہ لکھنا ”آری“ میر سے نزدیک ہندی ہے، ممکن نظر ہے۔ ہندی میں یہ لفظ ”زچ“ و ”شک“ و ما جز کے معنی میں نہیں ہے۔ ان معانی کے لحاظ سے ”ماری“ کو مہند کہا جائے گا۔ یہ ہر صورت آئیر کی اس رائے کو، اور اس لفظ سے متعلق امیراللفات و نوراللفات کے اندراجات کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔ ماری جو نہ، ماری آ جانا، تنگ آ جانے اور شک جانے کے معنوں میں عام طور پر اسی طرح لکھے جاتے ہیں۔ آر آر و لکھنؤ مرحوم

فارسی دالے ہر چیز کی تیاری کے لوازم اور ضروریات کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اور یہی ملتی استعمال ہندویوں کے یہاں بھی ہے، جیسے: عمارت کے لیے چوڑا سرخنی وغیرہ۔ تالیف کے لیے وہ کتابیں وغیرہ جن سے اس تالیف میں مدد مل سکے۔ کپڑوں کی رونق اور چمک دمک کے لیے گونا، پنچا، سنت، کنارہ۔ کھانے کے لیے لونگ، الائچی، دھنیا، مرچ۔ بال دھونے کا مسالا، عرم کا مسالا۔ مسالے کا تیل۔

دلی دالے اصل کی طرف متعلق جاتے ہیں۔ مگر چون کہ زبانوں پر ”مصالح“ نہیں ہے،

کا شعر یاد آیا:

وقتِ آخر چلتے چلتے، سانس بھی مانی ہوئی ساتھ دے مرے گا، اتحاد دم و سخا دم سدا میں

(جہان آرزو دہس ۱۰۳)

اے فرہنگِ آصفیہ میں ”مصالح“ ہے۔ اس کے مرکبات کی بھی یہی صورت ہے۔ یعنی گرم مصالح، مصالح بنانا، مصالح پکانا، مصالح داں مصالح رگڑنا، مصالح کا تیل، مصالح کی سیل۔ نیز ”میم“ میں ”کی فصل میں“ مسالا، ککھ کر، لکھا گیا ہے کہ صحیح لفظ ”مصالح“ ہے۔ اہل دلی اس لفظ کو اسی طرح صحیح سمجھتے تھے۔ دلی دانوں کی تحریروں میں یہی لفظ ملا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے مقدمہ ”آبِ حیات“ میں وضاحت بھی کی ہے۔ انھوں نے اس عنوان کے تحت ”بہت سے الفاظ ہیں کہ عربی فارسی نے اردو کو دے، اردو نے کہیں تو لفظوں میں کچھ تصرف کیا، معنی دی رکھے، کہیں لفظوں کو قسٹ رکھا، معنی کچھ سے کچھ کر لیے“ ”مصالح“ کا بھی ذکر کیا ہے: ”مصالح جمع مصلحت یا ”ماصلح“ کا مخفف ہے۔ اردو میں گرم مصالح وغیرہ، اور سامانِ عمارت کو بھی مصالح کہتے ہیں: اس سے بہ خوبی معلوم ہوتا ہے کہ اہل دلی اس لفظ کا شمار ان (عربی) الفاظ میں کرتے تھے، جن کی صورت نہیں بدلی ہے، معنی بدل گئے ہیں۔

یعنی یہ کوئی نہیں بولتا کہ گوشت کا مصالحہ پیس لیا، گرم مصالحہ ہو گیا، مگر تکی میں مصالحہ کم پڑا، اب کے خرم کا مصالحہ ہم کو نہیں دیا، اس لیے میری رائے ہے کہ اُردو میں جو بولیں، وہی لکھیں، جس طرح ”مسالہ“ بولتے ہیں، اسی طرح لکھا ہی جلتے۔ اور یہی مشرب متوسطین و متاخرین شعرا نے لکھنو کہا ہے، جیسا رنگ نے اپنے لغت میں لکھا ہے: ”مسالہ، میم مفتوح، سسین، مہر و لام، بالفت کشیدہ، ضروریات، ہر چیز یا شد کہ ہوا ضروریات، رونق و لذت، آں چیز شود بخا ہوا میں لغت از

آج کل اس لفظ کا اطلاق لیا ہے اور عام طور پر لوگ ”مسالہ“ کہتے ہیں اب بھی امارت ہے، مگر دینی دالوں کی پُرانی تحریروں میں ہر نام ”مسالہ“ ہی باقی رکھا جائے گا۔ جلال نے سرائے زمان اردو میں ”مسالہ“ لکھا ہے، لیکن اس کا عربی مادون ”مسالہ“ ہی کیا ہے۔ یہ بھائے خود درست نہیں لکھی، مصالحہ جمع ہے ”مصلحت“ لکھی۔ اُردو کے ان معانی سے کہیں کو کچھ علاقہ نہیں یہ صراحت کرنا چاہیے تھی کہ لفظ ”مسالہ“ میں لفظی اور معنوی تغیر ہوا ہے، اور ”مسالہ“ اُردو میں ایک نیا لفظ بن گیا ہے۔ جلال نے دینی و لکھنو کے اطلاق اختلافات کا بھی ذکر نہیں کیا۔ یہ بھی ضروری بات تھی۔

رائس خیر آبادی نے ایک خط میں لکھا ہے: ”سہ ماہ ۱۰۵۰ء سے صحیح اُردو ہے جو مکتوب ہنام صفحہ ۴۴ پر لکھی۔ مرتبہ ادب، جلد دوم، ص ۱۶۲، صحیح لفظ ”مسالہ“ مع الف ہے، جیسا کہ آئینہ لکھا ہے۔

میر علی اوسطاً رنگ لکھنوی، تلمیذ ناسخ، متوفی ۱۲۸۳ھ (مقدمہ نفس اللہ) کے لغت کا نام نفس اللہ ہے۔ یہ تاریخی نام ہے (۱۲۵۶ء) اس کا صرف حصہ اول، جو حروف تہجی کے اُن کی وفات کے بعد نیز پیر میں لکھنو سے شائع ہوا، اپنی حصوں کا پتا نہیں چلا تاہم نے جو اقتباس پیش کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لغت کم از کم حرف تہجی تک، نقل ہو

”صالح“ ہاشد“ اور اسی کی تقلید جلال نے بھی اپنے لغت گلشن فیض میں کی ہے۔ ”تیرہ روم نے بھی یہی مشرب اختیار کیا ہے :
 نمک چھڑکنے کو مانگے حراحت دل پر جو دیکھے آپ کے موبان کمالا سانپ
 ”کالا سانپ“ اور ”پالا سانپ“ زمین ہے۔ جان صاحب کے ایک شعر سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ محلاتو کھنڈ میں بھی یہی بول چال تھی :
 اے جان، ایسا چھاتی ہے لٹایا بچھ کر انگیا کامیری سارا سالاسل گیا“

چکاستا اور اس کا غلطی نسوان کی نظر سے گزرا سنا۔ ممکن ہے کہ وہ ان کے پاس ہی ہو۔
 جلال رشک کے شاگرد تھے، انھوں نے اپنے لغت گلشن فیض میں، نفس الافق کی بہت سی عبارتوں کو، لفظ یا معرکے کی ترتیم کے ساتھ نقل کر لیا ہے، اور کہیں حوالہ نہیں دیا، اس سلسلے میں مزید دیکھیے حواشی، کتاب ۱۲، ص ۵۵۔

سکے کھیات، حیر، مطبوعہ مطبعہ ثریہ کھنڈ، ص ۳۹۔ نیز کی ایک رباعی میں بھی یہ لفظ بطریقاً آیا ہے :
 ہے قوط میں مشکل اک نورالاکھا
 رکھتا ہے دگھی دیکھ مسالا، کھا
 ہر لغت خشک، طلق میں پھنسا ہے
 تیار ہوا ہے کیا اُبالا کھا
 (کھیات، ص ۵، ص ۳۴)

۵۵ دیوان جان صاحب، حشر، تبیین نقوی، ص ۱۱۰۔ صاحب نورالافات نے لفظ ”سک“ کے ذیل میں لکھا ہے :

”سک ہانا، کپڑے کا خفیہ سا بھٹ جانا، دبا ویا زور پڑنے سے کپڑا سک جانا۔
 اے جان، ایسا چھاتی ہے لٹایا بچھ کر انگیا کامیری سارا سالاسک گیا“
 قطع نظر اس سے کہ ”کپڑا سک“ ہانا کو ”سالاسک گیا“ سے کیا قلع ہے، یہ شعر غلط طور پر نقل ہوا ہے، جب کہ لفظ ”سالاسک“ کے ذیل میں یہ شعر صحیح صورت میں ان کی نظر سے گزر چکا تھا۔

[ہنام نورالعین پیر کا کردی (موتلف نور اللغات، ۸ اگست ۱۸۹۱ء)
(۲۱) صنم خاؤ عشق:

”صنم خاؤ عشق کو نظر ثانی سے میں نے کئی دم تہذیب کر لیا ہے، کچھ کسر باقی ہے۔
بعض احباب سخت مصر ہیں کہ چھپے امتیڈ ہے کہ اب کے ایسا ہی ہو گا۔ اتنا تم سے کہتا
ہوں کہ یہ دیوان، دیوانِ اول سے بہ درجہ بااؤلی ہے، بہ اعتبار زبان اور مزے
کے، اور یہ اعتبار ملافت کے بھی“

[ہنام حکیم برکتم۔ ۲۲ نومبر ۱۸۹۵ء]

۱۔ مکتوب الہ نے اپنے لغت نور اللغات میں، لفظ ”سال“ کے قول میں، تیسرے کے اس خط کی مکمل
متعلقہ عبارت بہ تبدیل بعض الفاظ درج کی ہے، لیکن حوالہ نہیں دیا۔ اس خط میں تیسرے نے جہاں
”میری رائے میں“ لکھا تھا، موتلف نے وہاں ”موتلف کی رائے میں“ لکھ دیا ہے۔

۲۔ صنم خاؤ عشق پہلی بار ۱۳۱۳ھ میں مطبع مقیدہ مام اگرہ میں چھپا تھا۔ اس کے آخر میں گورہ انتخاب
اور جوہر انتخاب، دونوں مجموعے شامل ہیں جس ۱۹ تک دیوان ہے، اس ۲۰ سے گورہ انتخاب
شروع ہوتا ہے، اور اس ۲۴ سے جوہر انتخاب کا آغاز ہوتا ہے۔ آخر کے چھ صفحوں میں قطعہ است
تاریخ طبع ہیں۔

۳۔ مراد ہے مرآۃ الغیب سے۔ اس کا نام تارکھی ہے۔ اس کی پہلی اشاعت میری نظر سے نہیں گزری۔
۴۔ شاد عظیم آبادی نے، بہ سلسلہ تبصرہ مکاتیب امیر ہندانی، صنم خاؤ عشق کے متعلق لکھا تھا: وہی
زبان سے اتنا عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حضرت امیر کا پہلا دیوان جس قدرائے کی پختہ کلائی دستاویز
یا کہانی پر روشنی ڈالتا ہے، اس قدر جدید روش کا دیوان روشنی نہیں ڈالتا۔ مکاتیب امیر ہندانی،
ص ۱۲۰۔

مولانا حسرت موہانی نے، بہ سلسلہ تبصرہ مکاتیب امیر ماس سے مختلف مائے کا اظہار کیا تھا۔

(۳) تسبیح - قرن - مایہ قرآن - شتر گریہ :

”بجز متقارب کی تخصیص نہیں، ہر بحر سالم میں تسبیح کراہت سے خالی نہیں۔ محقق

”صنم غادہ عشق کی غزلوں میں ہر رنگ کے اشعار موجود ہیں، یہ بات امیر کی قادر الکلامی پر دلالت کرتی ہے“ (ایضاً ص ۳۹۶) یہ دونوں تبصرے مکاتیب امیر چنانکی کے آخر میں شامل کر دیے گئے ہیں۔ امیر نے خود بھی ایک قطعے میں اس دیوان کے متعلق اعلیٰ خیال کیا ہے جو قابلِ توجہ ہے :

بچھلا کلام بھی ہے جو اس میں فریک آجبر دیوان میں اب کارنگ کہیں کچھ نہیں
(صنم غادہ عشق ص ۱۳۴)

۱۔ تسبیح، معروف زحمان ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رکن کے آخر میں جو سبب خفیف (دو حرفی جزا ہو اس کے حرب ساکن و متحرک کے درمیان الف بڑھا دیا جاتے۔ جیسے : فحولان۔ محقق نے تو اس کو اس لیے کہ وہ بتایا ہے کہ وزن، دائرہ عرضی سے نکل جاتا ہے رہ مضابطے کی بات ہے اس عرض کروں کہ سالم بھر میں ایسا شعر یا مصرع اکثر ناگوار سماعت بھی ہوتا ہے جیسے یہ مصرع : مرے پاس بھل میں بیٹھے ہیں کیوں آپ۔ اس میں آخری جزا ”آپ“ کس قدر بار سماعت ہے اس کے باوجود اس آئندہ قاری و آکر دو نے اس کی تابندی نہیں کی۔ بحر سالم میں تسبیح کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں امیر نے ”اڑا“ کا ذکر نہیں کیا لیکن اصولاً رکن تسبیح و ذوال، ایک ہی قاعدے کے ذیل میں آتے ہیں۔ ذیل میں ایسی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن میں بحر سالم میں رکن تسبیح و ذوال آتے ہیں :

ذخا قانیم گر بھی عزم ستھو لی مصنم ازیں کلاہ قسم مدارم
دعا بات گفتم، بہ خسرات پندیر اگرچہ دماہی مقسم مدارم غامگی
(کلیات، طبع تہران، ص ۲۳۹)

ط: زجگہ دی و فردا رستہ ام بے منتہ امروز عرقی (دیوان، نول کشور پریس ص ۷۷)
ط: راہ بند خری الزام اس و سرخی الزلب با قوت سائب و کلیات، شائع کردہ کتاب خانہ نظام، طبع ثانیہ
(ص ۱۸۶۶)

نصیر الدین طوسی نے میاں الاشعار میں اس کی تصریح کی ہے، اور یہی عشق۔ بکر
مستغارب میں ہم شعر،

بہا لا نکارا چہ آزادہ سروی ولیکن بر خسار ما ندر نگسار

دارا محمد شاہ راد، آقا نصیر کسرا نثار

آن کز سوم حد دل دوا، آئینہ یزدان پرورد

ایں نظم را ناگفتہ گیر، ایں مدح را نشنفتہ گیر

ایں بندہ را آشنفتہ گیر، ایما کہ ہذاں پرورد قافی

(تکلیات مطبوعہ تہران، ص ۱۵۲)

انقتضای صدمہ سچ دتاب، از جای جستم با شتاب

از خجالت جان در خراب، از حسرت خم خوں در جگر قافی

(تکلیات مطبوعہ تہران، ص ۲۳۳)

انوار عرفان سے ترا سینہ ہوا ایسا ہے صامت

جس کی پہنچت روشنی ہے قاف سے لے تا پہ قاف

نور شید و ہم کو رو بہ رو تیرے کہاں مقدور لاف

کرتے ہیں دونوں رو رو شب اگر ترے در کا طواف ذوقی

(قصائد ذوقی، مرثیہ سر شاہ میلان، ص ۹۸)

وہ، موتیں بہ اچھی بو غزل، ستمنا اس لیے بہ زور شور قوتیں (دوہاں مرثیہ) احمد پابری ص ۸۳

بکر سال میں ادا لے کی مثال خود اتیر کے یہاں موجود ہے، ضم غاۃ عشق میں ص ۹۰ پر ایک

دو غزل ہے جس کا یہ صورت پائی جاتی ہے۔ مطلب سے لکھے جاتے ہیں،

واں چشم دایرہ ہم نہیں اوں با جگر ہے دل کپاس

قاف دل و قافی کے قریب پس ہے بہ بسمل کے پاس

لکھ کر لکھتے ہیں: وائیں ناپسندیدہ است چہ حرفوں آخر از دائرہ بیرون است؟ اور یہ
مستعار بہ مزاحمت میں ہاں فارسی اور اہلِ اُردو نے تصبیغ کا استعمال کیا ہے اور اس
کو کسی نے کمرہ نہیں جانا۔ ملاحظہ:

نغمہ گایا یک تیرے اے ترک میرے دل کے پاس
نغمہ بھی ترزا پا دیر تک۔ آیا جو مجھ بسمل کے پاس

اور یہ مصرع: پیری میں اے زادِ نغمہ تیرے گیسوے سفید۔ حقیقت یہ ہے کہ
شاعری میں اس قسم کی پابندیاں ٹوٹ پھوٹ جایا کرتی ہیں شاعری کو زیادہ قیدیں داس آہی نہیں
سکتیں یہی وجہ ہے کہ بہت سے قاعدے کتابوں میں موجود ہیں مگر ان کی مکمل پابندی نہیں کی جاسکتی۔
سالم بھریں رکنِ بسنج و ندال، بارِ ساعت ہوتے ہیں، مگر ان کا استعمال عام ہے اور اب ان پر سختی
نہیں ہونا چاہیے۔

۱۔ برٹش میوزیم (لندن) کے فارسی مخطوطات کے فہرست نگار رچرڈ لے، فہرستِ مخطوطات کی دوسری
جلد میں، معیارِ الاشعار کے ذیل میں لکھا ہے کہ مفتی سعد اللہ نے اس کی شرح میزان الافکار میں اس کو
کسی ثبوت کے بغیر محقق طوسی کی تصنیف بتایا ہے (ص ۵۲۵) قزوینی مرحوم نے المعجم فی معایر الاشعار کے
مقتضے میں، اریو کے اسی قول کی بنیاد پر، اور اس کا حوالہ دے کر لکھا ہے: کتاب مرغوب معیار الاشعار
است در اطمِ عروض و قوافی کہ در ۶۳۹ھ تألیف شدہ، و معتقہ آن معلوم نیست، و مفتی محمد
سعد اللہ مراد آبادی این کتاب را شرح نفیسی و تازی نمود و موسوم بہ میزان الافکار فی شرح
معیار الاشعار وی تألیف این کتاب را بہ خواجہ نصیر الدین طوسی معروف بہ ستونی در
۶۷۲ھ خود، ولی معلوم نیست از روی چہ ماخذی؟

ان دو ناضل حضرات کی تحریروں سے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ سب سے پہلے مفتی سعد اللہ
صاحب نے اس کو محقق طوسی کی تصنیف بتایا ہے، حالانکہ یہ کچھ نہیں ہوگا۔ شیعرائی صاحب کے طویل

گر تیغ بارو در کوی آن ماه گردن نہادیم الحمد للہ

مقالے "تفہیم شعراہم" کی پہلی قسط اکتوبر ۱۹۴۲ء کے رسالہ اردو میں شائع ہوئی تھی اور باچہ تنقید شعراہم، اس میں انھوں نے رباعی کی بحث کے سلسلے میں "معیار الاشعار مولفہ، محقق طوسی کا حوالہ دیا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی کتاب ختام (مطبوعہ ۱۹۴۳ء) میں اس پر اعتراض کیا کہ "تفہیم شعراہم کے فاضل مولفہ پر وفیر شیرانی نے... اس کو کسی تہذیب کے بغیر محقق طوسی کی تالیف بتایا ہے معلوم نہیں ان کے سامنے اس کی کیا سند ہے، وہاں حالیکہ مشرق و مغرب کے فضلا اس نسبت کے قبول کرنے میں تاقل کرتے ہیں مگر ختام، ص ۱۲۱، اور حوالہ ربو اور قزوینی کے مذکورہ بالا اقوال کا دیا تھا۔ شیرانی صاحب کا یہ مقالہ ۱۹۴۲ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا، اس وقت انہوں نے اس کے آخر میں ایک ضمیمہ شامل کیا جس میں سید صاحب کے اس اعتراض کا بھی مختصر جواب دیا۔ شیرانی صاحب نے ایسی تیرہ کتابوں کے نام لکھے ہیں، جن میں اس کتاب کو محقق طوسی سے منسوب کیا گیا ہے۔ ان میں دو حوالے اُن مصنفین کے بھی ہیں جن کا سال وفات ۷۶۳ھ ہے۔ گویا کم از کم آٹھویں صدی ہجری سے معیار الاشعار کو محقق کی تصنیف بتایا گیا ہے۔

معیار الاشعار میں ایسی کوئی صراحت نہیں جس سے اس کے مصنف کے متعلق قطعی طور پر کچھ کہا جاسکے۔ محقق کی فہرست تصانیف میں ایک رسالہ عروض کا ذکر ملتا ہے جس کا نام کسی نے نہیں لکھا۔ پر خوبی ممکن بن کر قریباً یقین ہے کہ وہ رسالہ ہی ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے ختام کے آخر میں "اسند راگ و اضافہ کے تحت لکھا ہے کہ قوافی کی بحث میں ایک جگہ مصنف (معیار الاشعار) نے کمال اسماعیل اصفہانی کے ایک قصیدے کا اس طرح ذکر کیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قصیدے کی تصنیف کے زمانے میں یہ رسالہ لکھا گیا ہے۔ کمال کا یہ قصیدہ قاضی رکن الدین اللہ علیہ السلام مسعود صمدی اصفہانی کی طرح میں ہے۔ قاضی رکن الدین

تقطیع مصرعہ اول: فعلن فعلن فعلن لعللان۔ تقطیع مصرعہ ثانی: فعلن فعلن لعللان
فعلن لعللان۔ تیسرہ:

اب حال اپنا اس کے ہے دل خواہ کیا پوچھتے ہو، الحمد للہ

مشقت کو، محنت کو جو مار بھیں ہنراور پیشے کو جو خوار بھیں

کالمادہ ۶۱۵ھ سے ۶۲۲ھ تک معلوم ہے۔ اس سے کم از کم یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کتاب کا نائد
تصنیف، مفتی موسیٰ کارا دہیات ہے۔

امیرپناتی کے شاگرد جلیل بک پوری نے اپنی کتاب سوانح امیرپناتی میں معیار الاشعار کو مفتی
سعد اللہ صاحب کی تصنیف بتایا ہے۔ مفتی سعد اللہ صاحب کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے: "عرض
میں مفتی صاحب کی تصنیف معیار مشہور ہے جس کی شرح زبکامل عیار، حضرت امیر نے لکھی ہے"
(ص ۷۳)۔ دونوں باتیں صحیح نہیں۔ امیر نے دراصل معیار الاشعار کا ترجمہ کیا ہے۔ عبارت فارسی کے
ترجمے کے بعد جو قشر بہات ہیں، وہ امیر کی نہیں، ماوراس کا اظہار امیر نے مقدمہ کتاب میں کر
دیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ امیرپناتی نے بھی تذکرہ انتخاب یادگار میں امیر کے ذکر میں "زبکامل عیار
شرح معیار الاشعار" لکھا ہے بشیرانی صاحب نے تنقید شعرا المعجم میں کئی جگہ زبکامل عیار کا ذکر کیا
ہے اور ہر جگہ "زبکامل عیار ترجمہ معیار الاشعار" لکھا ہے۔ امیر نے دیباچہ کتاب میں بھی اس کو
ترجمہ کہا ہے۔

۳ مصرعے کی صحیح صورت یہ ہے: گردن نہادیم الحکم لشد۔ دلو ان حافظ، مرتبہ قزوینی
و ڈاکٹر مفتی، طبع تھران)

لکھ کلیات تیسرہ، مرتبہ مولانا عبدالباقی آفسی، ص ۱۳۷۔

۴ مسند سہجائی، شائع کردہ انجمن الفرض، علی گڑھ، ص ۳۲۔

میری رائے میں یہ سالم ہے، دستِ بخ -
قرن، ہفتین صحیح ہے۔ اتوری:

دو قرن از کرمت برود جہاں برگ دلوا
توچہ دانی کہ جہاں بے توچہ بے برگ دنواست

شعہ اخیر نے اتوری کے اس شعر کی بنا پر "قرن" کو ہفتین بھی صحیح کہا، مگر اتوری کے شعر میں حقہ بقا
یہ ہ سکون دوم ہی نظم ہوا ہے اور اس لیے یہ قول ملکی نظر قرار پایا ہے۔ اصل میں ایک چند بہار نے
بہارِ نجم میں اس شعر کو ہفتین کی سند میں لکھا ہے، نیز اپنے رسالے ابطالِ ضرورت میں بھی
اسے ہفتین کی سند میں لکھا ہے۔ اخیر کا ماخذ غالباً بہارِ نجم ہے۔

غالب بہت پہلے بہار کی پیش کی ہوئی اس سند پر اعتراض کر چکے تھے۔ غالب نے
وآرستہ، خان آرزو اور بہار کی کتابوں پر بھی اختلافی حواشی لکھے ہیں یہ کتابیں جن کے حاشیوں
پر غالب کی یہ تحریریں موجود ہیں، رضاؔ تجربہ ہی رام پور کے لوہار و سکشن میں محفوظ ہیں۔ مولانا
استیاز علی خاں عرقی نے غالب کی ایسی فارسی تحریروں کو ایک مقالے کی صورت میں مرتب کیا
ہے جو دہلی یونیورسٹی کے شش ماہی رسالے اردوے مطلی کے غالب نمبر حصہ اول میں شائع
ہوا ہے۔ ذیل میں اس مقالے کی متعلقہ عبارت نقل کی جاتی ہے۔ بہار کے رسالے ابطالِ
ضرورت کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

["قرن، ہفتین، مذہب ہی سال یا ہشتاد سال یا ایک صد و بیست سال،
دایں ایں است... اتوری:]

دو قرن از کرمت برود جہاں برگ دلوا۔

توچہ دانی کہ جہاں بے توچہ بے برگ دنواست

غالب نے لفظ قرن پر ۲۵ کا ہندسہ بطور ملامت لکھ کر مافیہ میں لکھا ہے:

مابقہ آکا استعمال خط و کتابت کے ساتھ ہے، جیسے کہیں: فلاں شخص کا خط
مابقہ آ ہے، خوش نویس نہیں۔ اور کسی چیز کے ساتھ استعمال میں نے نہیں سنا۔
تجربہ شدہ جو ایک شعر میں:

۱۰ "استغفر اللہ! رحمت ہمارا فروغ و غور وں دآوازہ در اٹھندن کہ اتوری قرن را بھکتو
رات قرشت آور زہ است، حال نگہ لفظ "اے" لفظ بیباں نمون ماندا
اے دو قرن از کرمت ہر وہ چہاں برگ دروا ۱۲ غالب ۹۲

غالب کا یہ اعتراض درست ہے۔ اقول تو کیا ہے اتوری (طبیعی کارخانہ لٹا صالح،
تہذیب ۱۲۲۷ء، ص ۲۰) میں مصرعے کا آغاز غالب کی تجویز کے مطابق ہوا ہے۔
اور رضا لا تہیری کے نسخہ اے قلمی نوشتہ ۱۰۰۲ء اور ۱۰۶۳ء اور قیصر
غیر مؤثر مگر قدیم میں "اے" کی جگہ "وے" ملتا ہے، جو معنائیک ہے۔ دوسرے
کسی آنت میں کوئی شعر ایسا ملا جس میں "قرن" کو پہنچ رہا نہ دھاکا ہو؟

لفظ "قرن" پر سکون دوم ہی استعمال کیا گیا ہے۔ بہار نے اتوری کا جو شعر تہذیب میں
میں پیش کیا تھا، وہ قابل قبول نہیں۔ آمیر نے خود تحقیق کرنے کے بعد بھلے نقل پر بھروسہ کیا۔
چون کہ ماند کا حوالہ نہیں دیا، اس لیے بہار کی نوتی داری "ان کے حصے میں آجاتی ہے۔

لفظ "مابقہ آ" اصفت۔ ایسی تہذیب کو کوئی وقت نے پھٹنے کے اس کا استعمال خط و کتابت کے ساتھ ہے اور
کسی چیز کے ساتھ نہیں اتورہ لفظات، یہ لفظ آج کل بہت کم استعمال میں آتا ہے۔ کبھی کبھار کسی خاص آدمی
کی عبارت میں دکھائی دے جاتا ہے۔ ایک مثال اس وقت یادداشت میں محفوظ ہے: "لیکن بجز چند مقامات
کے، جہاں عبارت مابقہ آ نہیں، مطالعہ کرنے والے کو کوئی خاص دشواری کا سامنا نہیں پڑتا۔"

وجہ سید حسن عسکری، رسالہ عامر شمارہ ۱۰۔

۱۱ شیخ امداد علی بک گھنوی، غلط شیخ نام، پیش آمد، تاریخ و انتخاب یادگار، متوفی ۱۲۹۵ھ و تاریخ

اب مجھ سے انقیام کی باتیں نہ کیجیے
دل تم سے پھٹ گیا، جگر افکار ہو گیا

مصرعہ اولیٰ میں ”کیجیے“ کے ساتھ خطاب کیلئے ہے اور دوسرے مصرعے میں ”تم“ ہے یہم تحریر موقوف نہیں، بلکہ اس زمانے تک اکثر معاصرین تحریر جن کا شمار اساتذہ میں ہے، اس کے تارک نہ تھے۔ اُن کے بعد متاخرین نے اس اختلانِ خطا سے احتراز کیا۔ میں بھی انھیں آراکین میں ہوں؟

[بہ نام حکیم برہم، ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۷ء]

(۳) انتخابِ یادگار :

”تذکرۃ انتخابِ یادگار“ حسبِ فرمایش سرکار مرثب ہوا اور چپ کر سرکار میں

لطیف (قلمی) رضا کا تجربہ ہی رام پور۔

۱۔ اس شعر کی روایت غلط ہے۔ صحیح مصرعہ یہ ہے: دل تم سے پھٹ گیا، جگر افکار ہو چکا

(ریاض الجنان، ص ۱۱۸)

۲۔ آئینہ کے غلطوں میں ایسے ”خطابات“ کی مثالیں موجود ہیں اور خاصاً تعداد میں۔ صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے:

”یہ لوکاٹ اعلیٰ قسم کے نہ تھے جیسا کہ سہارن پور کے لوکاٹ مشہور ہیں اور تم بھیجا کرتے ہو تاہم آپ کے غلوں و محنت کے ساتھ تہہ بے کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں؟“

(مکاتیب امیر پٹانی، ص ۱۶۶)

۳۔ یہ تذکرہ دو طبعتوں میں منقسم ہے: ”طبعت اولیٰ میں“ ”والیائے ملک کا ذکر“ و ”ترتیبِ زمانہ“ حکومتِ ریاست“ ہے، اور دوسرے طبعت میں ریاست کے متوشل و متوشل شعرا کا ذکر ہے۔ مولف کی مرثب کے مطابق یہ ایک سال میں مرثب ہو گیا تھا۔ ”انتخابِ یادگار“ تاریخی نام ہے جس سے سالِ تکمیل

داخل ہوا میں اپنی مالیات کو اس قابل نہیں جاننا کہ یہ یہ اصحاب کروں ،

۱۲۹۰ء تک ہے۔ اعلیٰ نفی قنی دیکھتے ہیں اس کی تقریباً گھسی سخی جو تذکرے کے آخر میں شامل ہے اس میں انھوں نے لکھا ہے: ”ہنگامِ ثابت، چار سو دس شعرا کے نام تھے، مگر چھپنے میں تاخیر ہوئی، آفتاب الدولہ قلیق، ملا گوہر لال قضا، شیخ امیر القسیم وغیرہ ملازمین میں شامل ہوئے لہذا چھپنے کے وقت تک، چار سو پندرہ شعرا کے نام اس تذکرے میں داخل ہوئے؟“ یہ تذکرہ ۱۲۹۰ء میں مطبعہ جامع الطابع رام پور میں چھپا تھا۔ تذکرے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ شعرا کے علاوہ، بعض اور اضافے بھی ۱۲۹۰ء کے بعد کیے گئے ہیں۔ مثلاً تنویر کا ایک قصیدہ ان کے نمونہ کلام کے ذیل میں ملتا ہے جس کا آخری شعر یہ ہے:

”وصف پاکب خدیو دیں بدو“

مصرعہ آخری ۱۲۹۱ء تک ہے۔ گریہ اضافہ ۱۲۹۱ء میں یا اس کے بعد ہوا ہے۔ کل صفات ۵۱۸۔ بعض اعتبارات سے یہ تذکرہ بہت کارآمد ہے۔ اس کی خصوصیات کی طشتِ آئینہ بھی اشارہ کیا ہے: ”ہر شاعر کے استاد کا نام اور مقدار عمر اور ولدیت اور در صورت متوفی ہونے کے تاریخ و ماہ و سال رحلت لکھنے کا اس تذکرے میں التزام کیا ہے۔ صوبہ پنجاب، ص ۸۸، اس اختتام نے اس تذکرے کو بہت کارآمد بنا دیا ہے۔ آئینہ شعرا کی عمر لکھ دی ہے اس سے ان کے سبب ولادت کے تئیں مدد ملتی ہے۔ ایسے کئی شاعر ہیں جن کے سبب ولادت کا تعین کسی اور ذریعے سے نہیں ہو سکا۔ مثلاً جگر کے قصائد کے چند شعر جو اس تذکرے میں موجود ہیں، وہ ان کے مطبوعہ دیوانِ ریاض البحر میں موجود نہیں، اور ان اشعار سے جگر کے تعلق دوبارہ رام پور کے زمانے کے تئیں مدد ملتی ہے۔ مثلاً حسین علی خاں شادان کے فارسی شعر وغیرہ۔

ڈاکٹر ابوالولیت صدیقی نے اپنے تحقیقی مقالے کھنڈ کا دبستان شاعری میں کئی جگہ لکھا ہے

کہ ملاحظہ ہو تذکرہ کا ملاں رام پور مرتبہ آئینہ جانی تذکرہ کا ملاں رام پور بھی ایک تذکرہ ہے لیکن

علی الخصوص یہ تذکرہ جس میں مجھ کو حالاتِ تاریخی اور انتخابِ اشعار میں ایسی مداخلت ہے جیسی قلم کو دوستِ کاتب میں؛ مگر اب جو آپ نے یا فرمایا تو ضرور ہوا کہ ایک نسخہ بھیجوں۔“

[بہ نام احسن الشفاں ثاقب ۱۹ نومبر ۱۸۹۱ء]

(۵) انتخابِ یادگار

”بندہ پرور! اس تذکرے میں اگر کچھ محاسن ہوں تو ان کو آپ سے ہنرمیں جانیں اور جہ اس میں بہ مجھ ہی تباغ ہیں، قراردادیں ان کو میرا دل جانتا ہے مگر گرا کر دنا مامور تھا، معذور تھا۔ ویسا ہے میں اس کا اشارہ بھی کیا ہے۔ آپ غور سے پڑھیے گا تو کچھ جائے گا کہ مولف مجبور تھا۔“

[بہ نام ثاقب۔ یکم ربیع الاول ۱۲۹۹ھ]

اس کے مولف امیر پشٹانی نہیں۔ اس کتاب کی دوسری اشاعت میں بھی غلطی بدستور موجود ہے۔ لہٰذا ویسا ہے کی متعلقہ عبارت یہ ہے:

”ایک دن ہندوستانی حضور کو خیال آیا کہ ایک تذکرہ شعراے ماضی و حال کا ایسا تیار ہو کہ اس سے خاص اس دارالریاست کے متوطن اور متوطن شاعروں کی مختصر کیفیت، سخن گوئی کی حقیقت نقشِ صفحہ روزگار ہو۔ اس ضمن میں اعزاز اس ہیچ مداف کا بھی منظور ہوا، لہٰذا یہ ہیچ میرزا اس خدمت پر مامور ہوا۔ اور محض بہ انتہائے عطف و خسروانی، آغاز سے انجام تک حضور نے التفات فرمایا، تب یہ تذکرہ تمام ہوا۔ اگر ناخن امداد حضور گرہ کشائی نہ فرماتا، ممکن نہ تھا ایسا تذکرہ جامع.... ترتیب پاتا۔ اس مہم کا سرانجام ہونا محض قیصرِ توحید سرکار ابد قرار ہے۔ اس بے حقیقت کی سنی، مانند حرکتِ خام بہ دستِ نامرنگار ہے۔ حق یہ

(۶) ہدایات متعلق شاعری کتب عروضی عربی :

”ہدایات متعلقہ شاعری جو آپ مجھ سے پوچھتے ہیں، ح: بانویشتم گیم اگر دہری
کنیم۔ ایک مرکز رگی گرا آج تک وہ بائیں پیش آتی ہیں کہ خود تحریر رہتا ہے۔ آپ
سے زمین اور جوہر قابل کے واسطے کچھ ہدایت نامہ لکھنے کی ضرورت نہیں، جو سم
شرکیہ، ابتدا میں کسی استاد سے اصلاح لیجیے، اس کے محو اثبات سے چند
روز میں خود راہ راست پر آجائیے گا۔ رہا منزل مقصود پر پہنچنا، یہ بہت مشکل
ہے۔ اسباب سب فراہم ہوں، تب بھی ح: عمرے باید کہ یار آید بہ کنار۔
عروض عربی کے رسائل بہت ہیں۔ بعضے چھپ بھی گئے ہیں۔ معیار الاشعار محقق
نصیر الدین طوسی، جامع عروض عربی و پارسی ہے۔ اور اگر عروض عربی، زبان
عربی میں مقصود ہو، تو شرح قصیدۃ خنجر تجیہ دیکھیے۔ اور مولوی محمد سعد اللہ

ہے کہ چند گانہ عالی نے صدام اموات بے نام و نشان کو زندہ فرمایا ہے، در حقیقت

الجانہ سمائی دکھایا ہے۔“

یہ شعرا و ادباء خصوصاً نور سیدہ حضرات کو، ایک واقعہ رسم و راہ منزل کی یہ تحریر غور سے پڑھنا
چاہیے۔

یہ معیار الاشعار کے لیے دیکھیے حاشیہ مکتوب ۲۔

یہ قصیدہ، علامہ ضیاء الدین ابی محمد عبداللہ بن محمد خزرجی ناگنی اندلسی کی تصنیف ہے۔ یہ عروض و
قافیہ کے بیان پر حاوی ہے۔ اس کی دو شرحیں ہیں، ایک ہی جلد میں، ایک عرض میں دوسری طائی
ہے۔ عرض میں جو شرح ہے، وہ مفصل ہے۔ یہ شرح علامہ بدر الدین ابو عبداللہ محمد بن ابی بکر خزرجی
کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ میں نے پہلے ایک مختصر سی شرح اس قصیدے کی لکھی تھی، پھر بعض
اندلسی طلبہ نے مجھے اس کی ایک شرح دکھائی، جو فرناط کے قاضی امام علامہ السید الشریف

مرحوم نے عروض باقافیر، ایک متن مع شرح لکھا ہے، وہ چھپ گیا ہے۔ وہاں
ذیل تو میں تلاش کر کے بھیج دوں؟

[یہ نام ثاقب۔ ۳ مارچ ۱۸۸۲ء]

ابن عبد اللہ محمد بن احمد لمح بیخی السبیتی کی لکھی ہوئی تھی۔ میں نے خیال کیا کہ میں اب ایک
اور شرح لکھوں جو فیثا مفصل ہو "فوق الوجیز دون البسیط" میں نے اس کا نام
"عمون العاقرۃ علی خبايا الراقرۃ" رکھا۔

حاشیہ والی شرح شیخ الاسلام زکریا انصاری کی ہے، جس کا نام "فتح البرۃ بر شرح
العقیدۃ الخرزجیۃ" ہے۔ میرے سامنے جونہی ہے وہ ۱۳۱۲ء میں مطبع الخیرۃ مصر میں
چھپا تھا۔ بڑے ساخر کے ۱۰۲ صفحات پر مشتمل ہے

کتاب اس کا نام "لوسفی فی علم العروض والبقافیر" ہے۔ یہ عربی میں ہے؟ عروض باقافیر فارسی
کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۷۵ء نکلا ہے۔ یہ رسالہ مشتمل ہے دونوں پر: فن اول مشتمل ہے
ایک مقدمے اور پانچ فصلوں پر اور فن دوم میں ایک مقدمہ اور تین فصلیں ہیں۔ حاشیہ پر
فارسی میں ضروری تشریحات بھی ہیں۔ یہ متن مع شرح ہے۔ اصل متن علاحدہ بھی چھپا ہے دو
اور مختصر رسالوں کے ساتھ۔ اُس مجموعہ رسائی میں پہلا رسالہ تو یہی متن عربی ہے۔ دوسرا رسالہ
فارسی میں ہے، اُس کا نام جواہر عروض ہے اور تیسرا رسالہ بھی فارسی میں ہے اُس کا نام ہے:
کیفیت ایجاد رباعی۔ یہ دونوں رسالے بھی مفتی صاحب مرحوم کے ہیں۔ یہ مجموعہ سہ رسالے،
نظامی پریس کانپور میں ۱۹۲۳ء میں چھپا ہے۔ اول الذکر متن مع شرح، ڈکٹوریٹ میں چھپا تھا۔
مفتی سید اللہ صاحب اپنے زمانے کے جید عالم تھے مآثرِ دینی نے ان سے معنولات کی کتابیں
پڑھی تھیں، سوانح امیر، مرتبہ جلیل ملک پوری، ص ۳، تذکرۃ علماء ہند میں مفتی صاحب کی
اکتیس تصنیفات کی فہرست موجود ہے۔ آخر میں رام پوری میں "عہدۃ تضاء، انشا اور مراۃ" پر

(۷) ہانگی :

”ہانگی، ہر معنی خود کو، آپ نے درج کیا ”ہانگی“ بہ اخاذی والی مہلکہ نون لکھا ہے، حالانکہ دال اس میں نہیں ہے۔ اُمید ہے کہ یہ اطلاع، طبع نازک پرگراں نہ ہو۔“

[بہ نام ناقب، ۷ اپریل ۱۸۸۹ء]

(۸) شگفتاندر :

”غنی ابراہیم بہرچی شگفتاندر“ میں کلمات کا سکون بے تکلف جاترہی کہ فیض ہے۔ البتہ مثال اس وقت یاد نہیں، پھر بھیج دوں گا۔ [بہ نام ناقب]

(۹) شگفتاندر شبنوا :

”پوسٹ کارڈ کے جواب میں تاخیر اس وجہ سے ہوئی ہو کہ شگفتاندر بہ سکون کات فارسی کی سند تلاش کرنے کا خیال رہا، مگر ہنوز نہ ملی تھی کہ قصہ بہتر آیا اور بدلا ہوا مصرع پایا۔ آپ نے بہت ہی خوب کیا کہ مصرع بدل دیا۔ خدا جانے

صرفراز ہوئے اور وہیں ۲۳، رمضان ۱۲۹۳ء کو وفات پائی (مذکورہ علماء جند)۔

لے یہ ہفتے داراخبار ستہ مالک و مدیر تھے مولوی احمد حسن شوکت میرٹھی، جو خود کو ”مجدد الشرق“ کہتے تھے اور اپنے زمانے میں مرکز ہنگامہ تھے یہ اخبار مملہ اندر کوٹ، میرٹھ دیوڑی، سے شائع ہوتا تھا۔ تاریخ اجراء: ۲۰ جنوری ۱۸۸۳ء۔ مقاصد اخباریں سے چند یہ تھے، جن سے مجدد صاحب کے تیوروں کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے :

”دیس زبان کی انشا پر دازی کی اصلاح کرے گا اور بتائے گا کہ مہذب و

فیض و طبع انشا پر دازی اس کو کہتے ہیں۔۔۔ مدبرانہ و مصلحانہ و حکیمانہ و

شاعرانہ و مالانہ و فاضلانہ، غرض کہ ہر قسم کے خیالات شائع کرے گا بنیاد پر

سند ملحقہ ملحقہ نتیجہ کامل کی فرصت نہیں ہے۔ میں نے دیکھا ضرور ہے،
 مگر یاد نہیں کہاں دیکھا ہے۔ خیر اب وہ قصہ ہی مٹا۔ احتیاط ہمیشہ اچھی ہوتی
 ہے۔ مشجبے کی بات سے، جہاں تک ممکن ہو، بچنا ہی چاہیے۔
 ”شنوا“ پر سکون لون کہاں ہے؟ تو میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ یہ حرکت لون
 ہی چاہیے۔

[برنامہ آئب، ۷، فروری ۱۸۹۱ء]

(۱۰) شنوا:

”شنوا“ پر سکون لون، اگر کلام میں ہو تو بدل دیجیے۔“

[برنامہ آئب]

(۱۱) گھڑنا۔ چھڑے۔ موتی کی لڑی:

”گھڑنا اور گھڑنا، دونوں صحیح ہیں مگر ”گھڑنا“ شعرا کے کلام میں نہیں پایا۔
 لکھنؤ، گھڑنا کو ترجیح دیتے ہیں۔ رشک مرحوم نے جب ”گھڑے“ نہیں، چھڑے

و نتائج نگاری کے اصول بتائے گا، اور ویسی اخبارات جو کچھ غلطیاں کریں گے

یا کر رہے ہیں، ان پر تنقید کرے گا۔ الغرض اپنے کو اسم ہاستی کر دکھائے گا۔“

مدرجہ بالا تفصیلات اور عبارت، اقتصر شہنشاہی سے ماخوذ ہے۔

لے فارسی کے متعلق قوفی الوقت میں کچھ نہیں کہہ سکتا، البتہ اردو میں ہر سکون قون کی مثال میں
 قائم چاند پوری کا یہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے:

گوش شنوا جب ہم پہنچا نہ کوئی یاں تو آہ

لے گئے ہم ساتھ اپنے وہ جو دل میں بات تھی

(دیوان قاتم، کھمبہ سنہ اشہاء ۱۲۸۵، لندن)

نہیں بطرح کی تھی، تو مجھے یاد آتا ہے کہ شعرا نے ”گھڑے نہیں“ بھی انہی مسنوں میں
 کہا تھا۔ رشک مرحوم کا شعر یہ ہے:

اے صاحبِ نور اللغات نے اس کے بر غلاف لکھا ہے کہ ”کھنٹوں میں زبانوں پر گڑنا“ اور دہلی
 میں ”گھڑنا“ ہے۔ لفظ ”گڑنا“ کے ذیل میں انہوں نے لکھا ہے: ”گھڑنا اور گڑنا دونوں صحیح ہیں۔
 شعر کے کلام میں گڑنا کہیں نہیں ملا۔ کھنٹوں میں زبانوں پر گڑنا اور دہلی میں گھڑنا ہے۔“ پھر
 لفظ ”گھڑنا“ کے ذیل میں انہوں نے ایک بار پھر وضاحت کی ہے کہ یہ دہلی سے متعلق ہے۔ اور سند
 میں داغ کا یہ شعر لکھا ہے:

”ادھر وحشت لیے جاتی ہے مجھ کو ادھر حذا د نے بیٹری گھڑی ہے“

”پٹری، دھڑی، قافیہ؟ اس کے بعد رشک کا وہ شعر لکھا ہے جس کو امیر نے بھی اپنے خط

میں لکھا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں ”گڑنا“ موجود نہیں، اُس میں صرف ”گھڑنا“ ہے۔ داغ کے شعر
 سے اور آصفیہ کے اندراج سے، مولفِ نور اللغات کے اس قول کی پوری طرح تائید ہوتی ہے
 کہ ”دہلی میں گھڑنا“ ہے۔ رشک کے مذکورہ شعر اور لغات کے اندراجات کی بنا پر یہ کہا جاسکتا
 ہے کہ کھنٹوں میں ”گڑنا“ اور ”گھڑنا“ دونوں صورتیں ہیں۔ مگر یہاں پر یہ کہنا ضرور ہے کہ کھنٹوں
 میں ”گڑنا“ اکثر اور ”گھڑنا“ کم تر ہے۔ ”گھڑنا“ کی سند میں رشک کے اسی ایک شعر کو پیش کیا گیا ہے
 جلال نے سرمایۂ زبان اردو میں دونوں لفظ اپنی اپنی جگہ پر لکھے ہیں اور ”گھڑنا“ کے ذیل میں
 رشک کے اسی شعر کو پیش کیا ہے۔ آخر کھنٹوں مرحوم نے فرہنگِ آخر میں ”گھڑنا“ کے متعلق لکھا
 ہے کہ: ”کھنٹوں میں گڑنا ہوتا ہے۔ اس کی وہی صورت ہے جو ”پہنا“ اور ”پھنا“ کی ہے۔“
 فرہنگِ اثر، ص ۵۰۶، جلال مولفِ نور اللغات اور صاحبِ فرہنگِ اثر کی تحریروں سے
 واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ کھنٹوں میں مستعملِ عام لفظ ”گھڑنا“ ہے۔ اور ”گھڑنا“ کی حیثیت شافعی ہی
 ہے اور دہلی میں ”گھڑنا“ اصل لفظ ہے۔

ٹھکانے ہوئے ہیں سانچے میں یہ بھی بدن کی طرح
 ہر گوشہ سارے ترے زیور گھڑنے نہیں
 چھڑے، ہر منی تھا، البتہ میں نے لکھنویں فصاحت نہیں سنا، اور کلام میں بھی
 نہیں رکھا۔

اس دبستانی اختلاں سے قطع نظر کر کے، اب یہ دونوں مصدر راگڑنا، گڑنا ایک ہی
 حیثیت رکھتے ہیں، جس کو جو لفظ پسند ہو، وہ اُسے استعمال کر سکتا ہے، دبستانی اختلاں کے
 جھگڑے کا خیال کیے بغیر۔
 ۱۔ محمود و داد بن رشک، ص ۲۲۹۔

۲۔ فرنگ آصفیہ، سرائے زبان اردو اور نور اللغات میں ”چھڑا“ موجود ہے۔ ”چھڑا عرویل
 کے ہالو کا ایک زیور ہوتا ہے۔ اور کتا ہے مرد یکہ و تنہا سے بھی ”سرائے زبان اردو“
 آصفیہ میں حیر کا یہ شعر سنا لکھا ہوا ہے:

”فراد و قیس ساتھ تھے سب کب کے چل بسے
 دیکھیں نہاہ کیوں کے ہوا اب ہم چھڑے رہے“

اکلیات تیر، مرتبہ آتشی، ص ۱۷۲

تو میں بھی یہی شعر منقول ہے۔ البتہ موقوف نور نے یہ صراحت کر دی ہے کہ ”اب
 قلیل الاستعمال ہے“۔

اسی سے ایک مرتب ”چھڑی سواری“ بھی ہے۔ یہ آصفیہ و نور میں ہے۔ آصفیہ میں بھر
 لکھنوی کی یہ رباعی سنا درج ہے:

جس وقت چلی یہ جان بیماری اپنی یاروں کو ہوتی دریغ یاری اپنی
 دو گام دیا نہ چوب و تنہا کی ساتھ دنیا سے چلی چھڑی سواری اپنی
 (ریاض البصر ص ۲۸۲)

”موتی کی لڑی“ کی سند آپ نے ایسی دی ہے کہ اب میں اس میں کچھ کلام نہیں کر سکتا۔ جنہوں نے مجھ کو منع کیا تھا، جب انہیں کے یہاں ”جہ“ دے تو مجھے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔“

[ہ نام کو شہر آدی، ۲۹ اکتوبر ۱۸۹۲ء]

(۱۲) مخزن الماوارات۔ گلشن فیض :

”ماوارات و لغات کی تحقیق کے واسطے مخزن الماوارات اور گلشن فیض

آصفیہ میں اس رباعی کا متن قدرے مختلف ہے اس نے اس کو بحر کے دیوان کے مطابق لکھا ہے۔

کچھ ناٹبا آسیر کی طرف اشارہ ہے۔ سراسر ایہ زبان اردو اور آصفیہ میں ”موتی کی لڑی“ موجود ہے۔
نور میں آسج کا یہ شعر سدا لکھا ہوا ہے :

”اپنی تری موتی کی لڑی سے چلڑی آنکھ

توڑے گی اب اے جانِ دانشگوں کی تجڑی آنکھ [مس ۲۲۵]

اور شائیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں، مثلاً :

دانتوں کی صفاء کیا کہوں، موتی کی لڑی ہے لب، لعل کے ٹکڑے

مستی ہے بلا، تہس پر رکھے پان کا لاکھا سوشنی کی رنگت و جرات

(ذکرۃ، مجمع الانتخاب)

”موتی کی لڑیاں“ بھی کہا گیا ہے :

کبھو ٹوٹا نہ مڑگاں سے مری آنسو کا زنجیرا

نہ جانے انگ کے قطرے تھے یا موتی کی لڑیاں (قائم چاند پوری)

اے یہ منش پرچی الال دلجو کی تالیف ہے۔ منش صاحب، بہ سلسلہ گفت، مولوی سید احمد دہلوی

کسی قدر مفید ضروری ہیں، مگر غیر محقق کو درحوقا دینے میں بھی یہ کتابیں استاد ہیں۔ دعا کیجیے کہ امیرالافتات مکمل ہو جائے تو خدا سے اُمید ہے کہ وہ ان سب سے مستغنی کر دے گا۔

[بنا نام کوثر خیر آبادی - ۱۰ فروری ۱۸۹۳ء]

مؤلف فرہنگِ اصفیہ کی طرح قلیں کے معاون تھے۔ قلیں نے اپنے لغت کے دیباچے میں ان کا نام بھی فہرستِ معاونین میں لکھا ہے۔ اس کتاب میں ہندی اور اردو کے ہر قسم کے محاورے اور اصطلاحیں دس ہزار کے قریب بڑی تلاش اور جستجو سے جمع کر کے درج کی گئی ہیں۔ ان کے ثبوت میں ناظرانِ بے مثال و ناظرانِ باکال کا کلام اور روزمرہ کے معنی فیز فقرے اور ضربِ الامثال ہمیش کی گئی ہیں۔ اکثر محاوروں کی وجہ تسمیہ اور شانِ نزول بھی حقی الوسیع بڑی تحقیق اور تدقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ ”عبارتہ سید رقی“ اس کتاب ۱۸۸۶ء میں مطبعِ محبہ ہند، فیض بازار دہلی میں چھپی تھی اور غالباً اس کے بعد دوبارہ نہیں چھپ سکی۔ اخیر نے اس کتاب کے متعلق ایک اور خط لکھا ہے: ”مخزن المادواتِ جہ و نخی لال کا کیا اعتبار! اس میں ہزاروں محاورے گنواروں کے لکھے ہیں۔“ (مکتوب بہ نام تراۃ سہارن پوری) امیر کدہ راسے، فن لغت کے نقطہ نظر سے، نہایت غیر مناسب انداز بیان کا مجموعہ ہے۔ ہزاروں کامبالغہ مزید برآں یہ بالکل ضروری نہیں کہ جو محاورہ یا لفظ آج مستعمل نہیں یا ایک خاص علاقے میں مستعمل نہیں، وہ گنواروں کی زبان کا جُز ہو یہ بخوبی ممکن ہے کہ اس کتاب میں غلطیاں ہوں، مگر وہ کہاں نہیں! اصل میں اس طرح کی رائیں، لغت نویسی اور قصورِ زبان اور معیارِ فصاحت کے قہریم اور محدود تصور کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ اس تصور نے لغت نویسی کو بہت نقصان پہنچایا کہ آج نہ معلوم کتنے پرانے لفظ ہیں جن کا حال احوال معلوم کرنا مشکل ہو کر رہ گیا ہے، کیوں کہ وہ معیاری لغات میں جگہ نہیں پاسکے۔ پھر مخزن المادوات

(۱۳) یہ سلسلہ امیر اللغات :

”آپ نے جو امیر اللغات کو شروع سے آخر تک دیکھا اور اس کی بعض

کے مولف نے تو خود ہی صراحت کر دی ہے کہ اس میں ”ہندی اور اردو کے ہر قسم کے محاورے، اور اصطلاحیں“ ہیں۔ ہارڈنگ لائبریری وطن میں اس لغت کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔

۲۔ گلشن فیض، جلال کے لغت کا نام ہے۔ جلال نے فارسی میں، اردو کا ایک لغت لکھا تھا جس کا نام ”گنجۂ زبان اردو“ لکھا تھا۔ گلشن فیض ”اسی کا تاریخی نام ہے جس سے مولف کی صراحت کے مطابق، سال اختتام تا ۱۲۹۰ء نکلتا ہے۔ یہ لغت نول کشور پریس لکھنؤ میں ۱۲۹۸ء میں چھپا تھا۔ آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔

جلال کا اردو لغت ”سرائے زبان اردو“ کچھ قریبات کے ساتھ اسی کا ترجمہ ہے۔ گلشن فیض پر کچھ لوگوں نے اعتراض کیے تھے۔ سرائے زبان اردو اور گلشن فیض کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ جلال نے لوگوں کے اعتراضوں سے فائدہ اٹھا لیا ہے۔ کچھ الفاظ کو خارج کر دیا ہے یا عبارت میں ضروری ترمیم کر لی ہے۔ میں ایک مثال پر اکتفا کروں گا: گلشن فیض میں لفظ ”حسن“ کے ذیل میں لکھا تھا: ”حسن“ سینہ پہلہ مفتوح بہ نون، بہ معنی سال آئندہ۔ جس سبب یہ فقہین و درافتلے موقوف۔ و بعض سینہ پہلہ، عضویکہ بہ حس و حرکت مشدہ باشد، و امر پوزار شتیدن عوض (۱۲۸۰ء) سرائے زبان اردو میں صرف یہ عبارت ہے: ”حسن بہ حس و حرکت عضو، اور خاموش و حیران آدمی“۔

یہ لکھنا دل چاہی سے خالی نہ ہو گا کہ جلال کے استاد رشک کے لغت نفس اللغات کا اگر گلشن فیض سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ جلال نے رشک کے لغت کی بہت سی عبارتیں بہ لفظ یا معمولی لفظی ترمیم کے ساتھ، اپنے لغت میں درج کی ہیں اور کہیں حوالہ نہیں دیا، دیکھیں ذکر کیا ہے۔۔۔ امیر نے مہدی حسن خاں شادآب رسول پوری کو ایک خط میں گلشن فیض کے متعلق

فروگذاشتوں سے مجھ کو مطلع کیا، میں اس کا جگر گزاں ہوں۔ بے شک
کاتب نے غلطی کی اور تصحیح کرنے والے بھی چوک کھٹے، جو بحر کے شعریں چھوڑا۔

لکھا ہے کہ لغت در حقیقت میرے مسودہ لغت کا ایک ٹکڑا ہے، جس میں تصرفات ہے جا
بھی شامل ہیں۔ دیکھیے مکتوب ۱۵۷۔

۱۷۰ امیر اللغات کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوا کہ غلطی دوسری جلد کے ص ۳۷۲ پر لفظ "نور" کے
کے ذیل میں ہوئی ہے۔ بحر کا شعر دراصل یوں ہے:

پیٹ سے پاؤں نکلے ہیں کچھ اب تو تم نے جھویا ہم نے جانوٹ کو تو بھجوا کھینچا
(ریاض المعر ص ۳۵)

امیر اللغات میں "پہنچا کھینچا" چھپا ہوا ہے۔

ایک بات اور، "امیر اللغات" میں "انوٹ" کے صرف ایک معنی لکھے ہوئے ہیں: "ایک زیور
ہوتا ہے جسے ہندو عورتیں ہانوکے انگوٹھے میں پہنتی ہیں"۔ فریبگ آصفیہ میں، معنی زیور گھوڑے کے
لکھا گیا ہے: "آں کی تصغیر، جب، انداز، ادا، لیکن کوئی سندھ کو نہیں، البتہ نور اللغات میں
دراغ کا شعر سندا ملتا ہے:

"وہ جس، وہ انداز، وہ پھر بکپیں اس کا بھل بل ہے قیامت کی توانوٹ ہے فضیلت"

نور اللغات میں اس معنی میں اس لفظ کو دہلی سے منصوص بتایا گیا ہے۔ "امیر اللغات" کی طرح
سرائے زبان اردو اور نفس اللغات میں بھی "انوٹ" کے صرف ایک معنی (زیور) لکھے ہوئے ہیں۔
اس سے صاحب نور اللغات کے اس اندراج کی تائید ہوتی ہے کہ "انوٹ" بمعنی "انداز و ادائیگی
سے متعلق ہے اور لکھنؤ میں اس کے صرف ایک معنی تھے، یعنی ہانوکے انگوٹھے میں پہننے والا زیور۔
امیر اللغات اور نور اللغات میں "انوٹ" بمعنی زیور کو نہ ذکر لکھا گیا ہے اور نور اللغات میں "انوٹ"
کو انداز و ادائیگی کے معنی میں نوٹ لکھا گیا ہے۔ دراغ کا شعر اس پر دلالت کرتا ہے۔ اور آصفیہ میں اسے

کی جگہ پہنچا پہنچ گیا۔
 اچھا اچھا کی مثال میں تھی کا شعر بے شک بہت مناسب اور اچھا تھا۔
 سگرادل تو تھی مستند استادوں میں نہیں ہیں، دوسرے آج تک ان کا
 کلام گفت میں دیا نہیں گیا۔
 ”ایک تنکے کا شرمندہ دھونا“ میں تنیر کا شعر ضرور دیا جائے گا، اگر پہلے سے
 ملتا اتفاق کی بات ہے کہ مستقر اسے یہ شعر رہ گیا۔

دونوں معانی میں موثق لکھا ہے۔ یہ ایک اور اختلاف ہوا کہ ایک معنی کے لحاظ سے تو
 لکھنؤ میں مذکور ہے اور دہلی میں (دونوں معانی میں) موثق۔
 اُسے مکاتب امیر جہانی میں ”پہ پہنچا“ لکھا ہوا ہے، لیکن امیر اللغات میں ”پہنچا“ ہے اور یہ
 اٹلا بھی کہی ہے۔

اُسے تھی غمگین کے کئی شاعر ہوئے ہیں، جن میں سے نمین قابل ذکر ہیں: (۱) سید پرورش
 علی تھی، متوکل کڑا، ضلع (آباد)، متوفی ۱۲۹۳ھ۔ ان کے دو دیوان مطبوعہ ہیں (غم خاۃ جاوید)
 (۲) سید حسن حسین امرہوی، برادرِ صوفی امرہوی۔ (۳) سید محمد جعفر حسین خاں
 عرت نئے مرزا لکھنوی، تلمیذ عشق لکھنوی (غم خاۃ جاوید)۔ میر خیال ہے کہ امیر کی مراد اول
 الذکر تھی ہے۔

اُسے تنیر کا شعر ہے :

بھولے سے پھانس نکالی دھارے دل کی
 ایک تنکے کے بھی شرمندہ تھا مجھے دھتھرے

(کلیات تنیر، ص ۱۲۵)

امیر اللغات میں اس محاورے کے ذیل میں ایک فقرہ بطور مثال لکھا ہوا ہے۔

ادیر سوسر فصل الصانع الواحہں لکھا گیا ہے، آپ کی نظر اس پر نہیں پڑی۔
اب ملاحظہ کر لیجیے — حصہ سوم کی ترتیب ہو رہی ہے، مقصد ہے کہ
تباہ حرفن اسی حصے میں تمام کر دیا جائے۔ اگرچہ اس حرفت میں بھی بڑی وسعت
معلوم ہوتی ہے، مگر یہاں حتی الامکان اختصار پر نظر ہے ؟
[بدنام کوثر۔ ۱۹ اگست ۱۸۹۳ء]

(۱۳) سبحانا۔ ہمیں۔ اکھڑیاں۔ بھدنا۔

ایجاد۔ دشنام ۱

”سبحانا، پسند آنا کے معنی میں، اگلی زبان ہے۔ اب میرے نزدیک بھی مستحسن
الفرق ہے۔“

لے اس لفظ کو مستحسن الفرق کہا، زبان پر ظلم کرنا ہے۔ اردو کے بہت کم شاعر ایسے ہوں گے
جنہوں نے اس لفظ کو استعمال کیا ہو یا استعمال ذکر کرتے ہوں، دوچار مثالیں پیش کی جاتی
ہیں، سبحانگی کون سی وہ بات جنوں کی دردناک کیفیت، مطبع مولائی، ص ۸۸ (۱۸۸۸ء) سبحانی انہیں
خون فشائی کسی کی دستبرکات، ص ۳۹، کوئی کھانا اے سبحان! سبحان ایضا، ص ۵۷۶ مجھ کو بھانے
ہیں وہ الفاظ جو ہوں پہلو دار درختک۔ مجموعہ دواوین، ص ۱۰۵ اور کوئی نہیں سبحانی مجھے برسات
میں بات دایضا ص ۱۰۳، چوچلا تیرا مجھے سبحان! انہیں (زند۔ دیوان، نول کشور پریس، ص ۱۰۲)
روستے میں ہنسائیں جو ادا بھاگتی مجھ کو (شوق قدوائی۔ فیضانِ شوق، ص ۱۱۸)۔

”سبحانا“ جو مفہوم ادا ہوتا ہے، وہ اس کے مراد الفاظ سے اس طرح ادا نہیں ہوتا۔
مثلاً شوقِ میر حسن کے اس شعر میں: ”میں اس طرح کا دل لگاتی نہیں کہ یہ حرکت تو بندی کو بھاتی
نہیں“ یہ لفظ جس مفہوم کو جس انداز سے ادا کر رہا ہے، اس کا کچھ بدل نہیں ہو سکتا۔ اس
سلسلے میں یہ لکھنا دل چاہی سے غالی نہ ہوگا کہ آئینے خود بھی اس لفظ کو استعمال کیا ہے،

مہیں، میں ہی کی جگہ، بول چال میں چاہے آجاتا ہو مگر کسی معجز کلام میں

داد و مشر کو بھائی میری اس کی چیز چھاڑ چیز کو پوچھا سخن کیا ہوا، کیوں کر لکھا
(مرآۃ الغیب، ص ۶۲)

شوق قدوائی (متوفی ۱۱۹۲ھ) نے ایک خط میں لکھا ہے :
”آپ نے مجھے ”بھانا“ کے لفظ کو پوچھا ہے۔ میں نے حضرت امیر مرحوم کے
اس خط کو دیکھا ہے جس میں اس لفظ کو وہ متروک تحریر فرمائے ہیں۔ میرے
خیال میں ان سے سہ ہوا۔ وہ خود بھی اپنے کلام میں اس لفظ کا استعمال کر چکے
ہیں۔ اس کے معنی ہیں : پسند آنا یہ لفظ اب بھی استعمال میں ہے اور اس کے
مزک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔“

[بہ نام صفدر مرزا پوری مرتب ادب، اول ص ۱۵]

صاحب نور اللغات نے جلد اول میں بہ ذیل متروکات، اس لفظ کے متعلق لکھا ہے :
”لکھنؤ میں صرف غورتوں کی زبان پر ہے۔ ”مندرجہ بالا مثالوں سے اس کی تردید خود بہ خود
جاتی ہے۔ اس سلسلے میں آخر لکھنؤی مرحوم کی یہ تحریر بھی قابل توجہ ہے :

”بھانا، کو متروک بھنا ہی غلط ہے۔ ایک تقریب میں جس میں میں نے بھنا موجود
تھا یہاں سے صاحب رشید مرحوم نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا تھا، جو مجھے اب
نکس یاد ہے :

یہ آپس کی شادی مجھے دل سے بھائی کہ سمدھی کے سمدھی ہیں بھائی کے بھائی“
(فرنگی آبادی، ص ۸۸)

جلاک نے سرمایہ زبان اردو میں رسالی طبع : ۱۳۰۳ھ = ۱۸۸۶ء میں اس لفظ کے
متعلق لکھا ہے : ”بعض فصحاء متاخرین کے نزدیک متروک الاستعمال ہے۔“ ان کی اس عبارت

اب تک نظر سے نہیں گزرا۔ حکم اس کو اس کے ۱۰ استعمال کا نہیں دیا جاسکتا۔

سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود اس وقت تک اس کو متروک نہیں سمجھتے تھے۔ اس کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنے تیسرے دیوان "مضمون ہائے دلکش" میں رسالہ طبع ۱۰۱۳-۶ء اپنے متردکات کی جو فہرست شامل کی ہے، اُس میں یہ لفظ موجود نہیں۔ البتہ ان کے صاحبزادے حکیم سید مہدی کمال نے اپنے رسالے دستور القصاص میں (رسالہ طبع ۱۰۱۳-۵ء) اس لفظ کو متروک لکھا ہے مگر غور شنید لکھنوی نے اپنے رسالے اقادات میں "بھانا" کو متردکات کے ذیل میں شامل نہیں کیا۔

امیر نے اپنے ایک شاگرد آجہ سہارن پوری کے نام ایک خط میں اس لفظ سے متعلق ایک تیز فقرہ لکھا ہے :

"بھانا پسند آنا کے معنی میں، فقہائے کھنڈر بولتے ہیں نہ کہتے ہیں۔ اگر آپ دہلی بولتے ہیں تو آپ ضرور لکھیے۔ توسیع زبان کا بھی آپ کو بہت خیال ہے؟"

[مشاطہ سخن، بہ ذیل اصلاحات امیر پٹنائی]

مندرجہ بالا تفصیل سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس لفظ کے متعلق امیر کی رائے قریب صوبہ نہیں۔ ذہان کلیم لکھنا صحیح ہے کہ "فقہائے کھنڈر بولتے ہیں نہ کہتے ہیں"۔ تاہم کے نام امیر کا جو خط ہے جس کا اقتباس اوپر درآگیا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کے سلسلے میں دراصل دبستانی چشمک امیر کے ذہن پر مادی تھی۔ بہر حال، جیسا کہ شوقِ قدوائی نے لکھا ہے، اس مقام پر امیر کو "بھوڑا" اس پہلے کی طرح آج بھی یہ مصدر اور اس کے مشتقات عام طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے :

ہر منظر خوب و زشت بھاتا ہے مجھے ہر زرد، نئی جھلک دکھاتا ہے مجھے
بھولوں میں بھی امتیاز کرنا تھا کبھی کاتوں پہ بھی اب تو بہا رہا ہے مجھے

حضرت اسیرِ محرم کی نظر سے آپ کے شعر میں نہیں معلوم کیوں کر رہ گیا اور میں نے بھی اُسے دیکھا ہے تو سوا اپنے سپہ نظر کے اور کیا کہا جائے۔
انکھڑیاں چشمِ معشوق کے لیے مخصوص ہے اور یہ لفظ مجھے پسند نہیں ہے۔

جوش ملیح آبادی (جنون و حکمت، طبع بہمنی، ۱۲۰۲)

اے جلال نے میرا یہ زبانِ اردو میں "میں کو صبح اور میں ہی کو غلط لکھا ہے۔ اُن کی عبارت ہے:
"میں، تنہائی معرور و اخلائے نون کے ساتھ، ایک کلمہ کہ کافہ و اپنی نوات کے مصرع کے معنی کا دیتا ہے۔ اور جو اس لفظ کو "میں ہی" پڑھتے ہیں یا لکھتے ہیں، موانعِ بیچِ ممال کے عندیے میں غلط ہے؟

جلال کے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے، دہات بہت جھنجھائی (کینہ و آغ) نے اپنے رطلے اختلافِ اللسان رسالہ طبع، ۱۹۰۶ء میں لکھا ہے:

"جناب جلال کا یہ اجتہاد باقائدہ ضرور ہے۔ کیوں کہ جب "تم ہی" ہم ہی ہو
"تصیں" اور نہیں کہتے ہیں تو اس قیاس پر میں ہی کو "میں" کہنا چاہیے مگر میں
اور "میں" کے مقابلے میں یہ لفظ نہایت غیر فصیح معلوم ہوتا ہے، شاید اہمیت کی
دہم سے۔ اور پچھلے مجھے قریب اجتہاد ایسا ہی ہے جیسے کوئی "یہاں" وہاں کے قیاس
پر کہ ان کا مختلف "یاں" اور "واں" آتا ہے یہاں کا مختلف "کاں" کرنا چاہے شعرا
وہی دیکھتے ہیں۔ اور کوئی اس کا مال نہیں لایا جاتا، صرف جناب جلال اور اُن
کے شاگرد لکھتے ہیں؟

اے اسیر نے خود اس لفظ کو استعمال کیا ہے:

کاجل یہ نہیں ہے انکھڑیوں میں اُسٹھا ہے دھواں تری مسی کا

دھنم ناؤ مٹی میں وہاں بیچ کے صلیب

نیز امیر اللغات میں اس لفظ کو درج کیا ہے اور ناپسندیدگی یا ترک کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا۔ ان کی عبارت یہ ہے: ”اٹکھڑیاں، اٹکھ کی جمع یہ بارے معشوق کی آنکھوں کو کہتے ہیں۔ اور سند میں متودا، اُنقش اور تلق کا ایک ایک شعر لکھا ہے۔

امیر کے شاگرد حکیم برہم نے ایک طویل خط میں، اصلاحِ زبانِ اردو نوآئم و خواجہ عبدالزوق عشرت لکھنوی پر تصریح کرتے ہوئے، اس کی تردید کی ہے کہ ”اٹکھڑیاں“ متروک ہے۔ مولفِ اصلاحِ زبانِ اردو نے لکھا تھا: ”اٹکھڑیاں اب بول چال میں نہیں۔“ برہم نے اس کی تردید کی ہے اور امیر اللغات و گلشنِ فیض کا حوالہ دیا ہے (مترقے ادب، دوم ص ۷۷) شوقِ نبوی نے رسالہٴ اصلاح میں اور مولفِ نور اللغات نے اس لفظ کو متروکات کے ذیل میں درج کیا ہے ”اٹکھڑیاں“ آنکھوں کے معنی میں... اکثر فصحاءے حال استعمال نہیں کرتے۔“ (اصلاح، ص ۱۲)۔ اس کے برخلاف، خورشید لکھنوی نے لکھا ہے:

”اٹکھڑیاں، اس لفظ کو گو بعض فصحاءے حال، بہ قول بعض، ترک کر چکے ہیں، مگر میں متفق ان سے نہیں ہوں۔ غشی تیسرے مرحوم سے متفق کہ جنھوں نے اس قدر متروکات کی پابندی کی ہے کہ دوسرے نے کم کی ہوگی، وہ فرماتے ہیں:

نشیبی اٹکھڑیاں، نیچھی نگاہیں سپنسا لینے کی، بہکانے کی راہیں

اور گنوٹے وغیرہ کی آنکھوں کی تعریف میں جس کی نظم کی ضرورت مرثیوں میں اکثر پڑتی ہے، تو ”اٹکھڑیاں“ ہی ”آنکھوں“ سے فصیح تر ہیں ”اغانادات ص ۲۹

اور ”بحث متروکات مندرجہ نور اللغات“ کے ذیل میں آخر لکھنوی مرحوم نے لکھا ہے:

”اٹکھڑیاں، آنکھیں۔ دونوں کے معنی استعمال میں فرق ہے؟ ”آنکھیں“ عام لفظ ہے۔

”اٹکھڑیاں معشوق کی خوب صورت آنکھوں کو کہتے ہیں۔ میرا شعر ہے:

اُن اٹکھڑیوں کی اُفت نیمِ خوانی ڈورے پڑے تھے جن میں گلابی

اٹکھڑیوں میں جو ہانک رہی ہے، وہ آنکھوں میں کہاں؟“ (فرنگی و اثر، ص ۷۷)

نواب عزیز جنگ و لا حیدر آبادی نے اپنے رسالے معیار فصاحت میں یہی بات کہی ہے:
 ”آنکھوں میں آنکھڑیوں کی تخصیص معنوی کا لطف کہاں ہے جو یہاں سے متعلق ہے“ (معیار فصاحت،
 ص ۲۳)۔

نواب کلیب علی خاں (والی رام پور، تلمیذ امیر) کو متروکات کا بہت لحاظ رہا تھا۔ نواب
 صاحب کے دوسرے دیوان دستنبو سے خاقانی (مطبوعہ ۱۲۹۵ء) کے آخر میں ان کے متروکات
 کی ایک فہرست ہے، اس میں مذکور لفظ بھی موجود ہے لیکن عملاً انہوں نے اپنے تیسرے دیوان معنون
 اے دل کش (مطبوعہ ۱۳۰۶ء) میں اپنے متروکات کی جو فہرست شامل کی ہے، اس میں ”اکھڑاں“
 موجود نہیں۔ انہوں نے آخر تک اس کو متروک نہیں سمجھا، کیوں کہ ان کے چوتھے دیوان نظم نگاریں
 میں یہ لفظ موجود ہے:

اپنی شوخ آنکھڑیوں میں کچھ تو چھاپ آنے دو

راہ ہر آئیں جو یہ خانہ خراب، آنے دو (ص ۱۰۶)

اس بات پر پیش تر حضرات نے زور دیا ہے کہ ”اکھڑاں“ چشم معشوق کے لیے آئے،
 مگر مطلق آنکھوں کے لیے بھی اس کو استعمال کیا گیا ہے، جیسے یہ تہذیب شعری:

جب تک آنکھیں کھلی ہیں دکھ پہ دکھ دیکھیں گے یار

مُنہ گئیں جب اکھڑاں، اے توڑ سب اکھڑاں

(دیوان سوز، خٹکی، رضافا تہریری رام پور)

اور یہ قول خورشید کھنوی ”گھوڑے وغیرہ کی آنکھوں کی تعریف میں، جس کی نظم کی
 ضرورت مرثیوں میں اکثر پڑتی ہے“ یہ لفظ آتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس لفظ کو متروک قرار
 دینے کی کوئی وجہ نہیں۔

اس بحث کے بعد اس لفظ ”اکھڑاں“ کے سلسلے میں امیر کی اس تحریر کے متعلق ایک بات
 اور کہنا ہے: امیر کے خط کی عبارت جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ”یہ لفظ مجھے پسند نہیں ہے“

بجھنا، لفظ نہیں ہے، ”بدھنا“ ہے اور سرایت کرنے کے معنی میں مستقل

مکاتیبِ امیرِ عثمانی مرتبہ نقابِ لطیف دوم میں اسی طرح ہے، اور یہی میرا مآخذ ہے۔ ریاضِ خیر آبادی، التیذِ امیر، کے شاگرد عبدالحکیم حکمت عظیم آبادی نے، دبدبہ امیری کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی، جس میں بہت سی عبارتیں بہ لفظ یا معمول تغیر کے ساتھ، طرۃ امیر مرتبہ امیر احمد علوی سے منقول ہیں۔ اس کتاب میں مکاتیبِ امیر کے کچھ اقتباسات بھی جمع کیے گئے ہیں۔ حکمت نے یہ مباحث نہیں کی کہ یہ اقتباسات، مکاتیبِ امیرِ عثمانی کے پہلے اڈیشن سے لیے گئے ہیں یا دوسرے اڈیشن سے۔ دبدبہ امیری میں منقول عبارتوں میں اور مکاتیبِ امیرِ عثمانی مرتبہ نقابِ لطیف دوم، کی عبارتوں میں کئی جگہ کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ امیر کے زیرِ بحث خط کے اقتباس کی بھی یہی صورت ہے کہ دبدبہ امیری میں آخری جملہ اس طرح ملتا ہے: ”یہ لفظ مجھے پسند ہے“۔ مکاتیبِ امیرِ عثمانی کا پہلا اڈیشن مجھے یہاں باوصفِ تلاش نہیں مل سکا کہ اُس سے تقابل کیا جائے۔ اگر دبدبہ امیری والا حملہ صحیح ہے تو پھر صورتِ حال بدل جاتی ہے۔

لکھ سرایہ میں جلال نے اس معنی میں ”بجھنا“ لکھا ہے: ”بجھنا یہی ہوتی مریج یا تنگ و غیرہ کا کسی چیز میں سرایت کر جانا“۔ رخصت نے بھی نفس اللغہ میں اسی کو مانتا ہے: ”بجھنا، ماضی، سرایت کر دینا تنگ یا شدہ پر چیز ہے“۔ اس کے بعد مقتدی مصدر ”بجھنا“ لکھا ہے: ”تنگ و غیرہ پر سرایت کثافتیں بودہ یہی بول چال میں ہے۔ امیر نے قبا کے شعریں اس لفظ کی کتنی صورت پر اعتماد کیا ہے، حالاں کہ اس سے فائدہ استناد حاصل نہیں ہو سکتا۔ فائدہ استناد اُس وقت حاصل ہو سکتا تھا جب یہ لفظ شعریں اس طرح درِ بطورِ قافیہ آئے کہ لازماً اس کو ”بدھنا“ پڑھنا پڑے۔ اور قبا کے زیرِ بحث شعریں یہ صورت نہیں پائی جاتی، اس لیے اُس کو سننا پیش نہیں کیا جاسکتا۔

تو رہیں اس معنی میں ”بدھنا“ کو صحیح بتایا گیا ہے رہ گیا امیر کے قول کی تائید ہوتی عبارت

شور جس کا ہے۔ وہ ہے عشق جنوں لڑا دل میں بدھ گیا ہے تمکین محسن کا سودا دل میں
ایجاد، مذکر ہے۔ سند کے شعر ذیل میں دیکھیے۔ آج کل اس لفظ کی مذکر و
ثانیث میں بحث چھڑی ہوئی ہے۔ اخباروں میں مضامین دیکھے جاتے ہیں،
اور جاہر جاے میرے پاس استغنیے آتے ہیں بسنا جاتا ہے کہ نقاب مرزا خان
صاحب داغ کا قول ہے کہ دلی میں موٹ ہے، مگر کلام میں کہیں موٹ کا پتا
نہیں چلتا۔ اگر ایک معبر شاعر نے بھی موٹ کہا ہوتا تو کہا جاتا کہ مختلف فیہ
ہے۔ اور بغیر کلام میں آتے ہوئے کہیں کہیں بول چال میں ہونا کافی نہیں ہے۔
تفہیم دہلوی :

قبر پر آیا ہے، دینے کو مہانک باؤرگ یہ نیا ایجاد ہے میرے ستم ایجاد کا

تجربہ :

یہ تازہ لگا ہونے ایجاد گلستاں میں راتوں کو لگا رہنے متیا دگلستاں میں

۱۔ غنیمۃ آرزو، ص ۱۱۱۔

۲۔ اس لفظ سے متعلق مفصل بحث اس کتاب میں شامل مضمون مشرک الفاظ میں کی گئی ہے۔ یہاں پر
صرف یہ کہنا کافی ہو گا کہ داغ کے متعلق یہ روایت قطعاً درست نہیں کہ وہ لفظ ایجاد کو موٹ کہتے
تھے۔ اس کے برخلاف، داغ بھی اس لفظ کو مذکر ہی مانتے تھے۔

۳۔ اصغر علی خاں نسیم دہلوی، تلمیذ نسیم، متوفی ۱۳۱۳ھ رمضان ۱۲۸۲ھ، دیباچہ دیوان نسیم، موسوم بہ
دفتر شکرت، نوشتہ امیرالندۃ نسیم (تلمیذ نسیم)۔

۴۔ دفتر شکرت، مطبوعہ مطبعہ مصطفائی گھنٹہ سال، طبع ۱۲۸۵ھ، ص ۴۴۔

۵۔ شعر بہ شعر، کفایت مرقدہ آسی اس سے خالی ہے اور مخدومی قاضی عبدالنور درو صاحب کی

اگرچہ اس شعر میں "ایجاد" کا لفظ جس صورت میں آیا ہے، وہ سند کے لیے پورے طور سے کافی نہیں ہو سکتا، مگر دیوان میں اسی طرح چھپا ہے اور ثقافت کو اسی طرح پڑھتے سنتے ہیں۔
 قائل لکھنویؒ:

اتنی بینائی کہاں، دیکھیں جو سیرِ جزو و کل
 عالمِ ایجاد میں تو سیکڑوں ایسا رہیں
 دشنام، زیادہ موٹا ہے، مگر ظفر نے ایک جگہ نڈر کہا ہے، فلہذا نمکت
 غیر کہا جا سکتا ہے۔
 ناسخ:

کسی نے جو حیدر کو دشنام دی تو گویا پیمبر کو دشنام دیؒ

تحقیق کے مطابق یہ شعر تنہا، شاگردِ مقصنی کا ہے۔ قاضی صاحب کی عبارت یہ ہے:
 [اب اور لگا ہونے ایجاد گستاہیں راتوں کو لگا رہنے صیاد گستاہیں
 شیفہؒ ص ۸۵ و نساخ ص ۷۶، اذم غازی ص ۳۹ میں یہ نام راسخ عظیم آبادی
 لیکن ان کے دیوان کے کسی نسخے میں نہیں۔ اور انتخاب دیوان تنہا، شاگردِ مقصنی، مولفہ
 حسرت موہانی میں، بہ تہدیل بعض الفاظ موجود ہے۔ بل کہ اس میں اس زمین کے
 اور اشعار بھی ہیں۔ اس میں کچھ حک نہیں کر رہے تنہا کا نتیجہ نگر ہے۔]

آوارہ گرد اشعار، نقوش (لاہور، جون ۱۹۵۶ء)

ؒ متورخاں قائل لکھنوی، خلفِ ملاہیت خاں، تلمیذِ مقصنی و سخنِ شعرا۔

ؒ دیوانِ قائل، اشاعت ثانی، نول کشور پریس کان پور ص ۵۶۔ سالِ طبع: ۱۹۷۹ء۔

ؒ کلیاتِ ناسخ، مطبع مولائی ص ۴۰۲ (سالِ طبع: ۱۳۶۲ھ)۔

(۱۵) مدفن۔ چچاقش۔ کعبے کا گھر؛

”مدفن، ہسپرنا، لفظ صحیح، پھر موزوں کرنے کو کون منع کرتا ہے۔ اچھا نہ معلوم ہو، نہ کہیے۔ میں نے بھی کبھی نہیں کہا۔ غلط آشیانے موزوں کیا تھا، بہت چرچا رہا، مگر حجت انہی کی تھی کہ لفظ صحیح ہے۔

چچاقش، بمعنی جنگ شمشیر، قیاف میں بہ فتح لام ہے۔ اور اردو میں ہسپر لام، انبوہ کے معنی میں ہے۔

اسے مراد ہے نواب کلب علی خاں نواب، غلط نواب یوسف علی خاں اعظم، والی رام پور سے۔ ولادت ۱۲۵۰ء تحت نشیمن ۱۲۸۱ء، وفات ۱۳۰۴ء۔ حواشی مکاتیب غالب، مرتبہ عرض صاحب، نواب صاحب کے پانچ مطبوعہ دیوان ہیں (۱) نشید خسروانی، مطبوعہ ۱۲۹۳ء (۲) دستنبوے خاقانی، مطبوعہ ۱۲۹۵ء (۳) درۃ الانحباب، مطبوعہ ۱۲۹۵ء (۴) توفیق سخن، مطبوعہ ۱۲۹۷ء (۵) مضامین رفیع، مطبوعہ ۱۳۰۳ء۔ نواب صاحب کو صحت الفاظ کے ساتھ ساتھ، مترذکات کا بہت خیال رہتا تھا۔ دیوان دوم کے آخر میں انہوں نے اپنے مترذکات کی فہرست شامل کی ہے۔ مصاحب منزل میں اسانڈہ کا جمع رہتا تھا اور اس اجتماع میں زبان و قواعد کے مختلف مسائل خاص طور پر موضوع بحث بنتے تھے۔ نواب صاحب ایسی بحثوں میں، بطور خاص دل چسپی لیا کرتے تھے۔ دیگر اسانڈہ دہلی کے برخلاف، آغ کے یہاں جو اسانڈہ لکھنؤ کی طرح، قواعد پسندی کا رجحان شدت کے ساتھ کار فرما ہوا، اس میں رام پور کے اس ماحول شعر و سخن کو بہت کچھ دخل تھا۔

۲۔ لغت کا نوشتہ سرائیکھوں پر، مگر یہ لفظ، ہسپرنا، اردو کے لحاظ سے قطعاً غیر فصیح ہے۔ ہسپرنا کو عربی سے مخصوص سمجھنا چاہیے اور اردو میں صرف، فتح نا کو جگہ دینا چاہیے۔

۳۔ اصطلاح لفظ چچاقش ہے، فتح اول فہم سوم و فتح چہارم اور اس کے معنی ہیں، جنگ شمشیر

خاند کعبہ کا ترجمہ ”کعبہ کا گھر“ بالکل مستقل نہیں، اور نہایت بُرا معلوم ہوتا ہے۔
 وجہ یہ ہے کہ ”خاند کعبہ“ ترکیب اضافی نہیں ہے، ترکیب توصیفی یا بدل بدل
 منہ ہے؛ پھر ”کعبہ کا گھر“ کیوں کر درست ہوگا۔ آپ کسی سے تولڈے نہیں،
 اور کعبے کے غلط ہے، ہاں معتبرین کے کلام میں لکھے تو خیر! اگر کوئی آپ سے پوچھتا
 ہے تو تمھارا دیکھ کر میرا تو یہ خیال ہے۔ بہرہ نادرات کرے تو چپ ہو رہے۔
 [بہ نام کوثر خیر آبادی]

(فیث اللغات)۔ اردو میں حرکات کے لحاظ سے یہ تفریق ہوا کرتی کہ پیش زبر سے بدل گیا،
 اور دل مضبوط اور کسور دونوں طرح رہا۔ اور معنی بھی بدل گئے۔ نور اللغات کی عبارت ہے :
 ”چقلش، رت۔ بالغ و خم سوم و فتح چہارم : انبوہ، نجوم، تلوار کی لڑائی۔ موثق : لڑائی،
 جنگجو، بھڑا، جنگ کی تنگی، انبوہ، بھڑ۔
 داغ :

جوتی لوگوں میں چقلش کیا کیا رہی آپس میں کش مکش کیا کیا

... اردو میں بالغ و فتح سوم و کسر چہارم بھی زبانوں پر ہے ؟

قائم کی ایک غزل ہے : کشش دل اور تشش دل، اس میں ”چقلش“ دل بھی آیا ہے :

کس طرح کوئی گوسہ تری رہے کہ پیارے

ہر گام پہ اس کو پہے میں ہے چقلش دل

جوں کہ اس غزل میں حرف ماقبل شین کی حرکت کی پابندی ہر شعر میں کی گئی ہے، اس

پے اس شعر کو، ہر کسر ل کی مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ پہنچ چہارم کی مثال میں اور یہ

داغ کا شعر آجکا ہے۔ آئینہ میں حرکات کی صراحت نہیں کی گئی، البتہ قی پر زبر اور دل پر کسر

لگا ہوا ہے۔ بول چال میں پہنچ چہارم اور یہ کسر چہارم، چقلش، چقلش، دونوں طرح آتا ہے۔

(۱۶) خنجر کا دونا ہونا؛
 ”خنجر کا دونا ہونا، صحیح ہے“

[بہ نام کو خنجر آبادی۔ ۱۹ مئی ۱۹۳۰ء]

(۱۷) تعقید۔ سقوط یا بے معروف؛

”جو شبہات آپ نے لکھے ہیں، ان میں سے بعض تو میں رفع کیے دیتا ہوں،
 اور بعض اس پر موقوف ہیں کہ پورا شعر اپنا اور اصلاح میری لکھیے۔
 واضح ہو کہ ”کسائے پھرتے ادھار ہم بھی ہیں“ ماحورہ فصحا کا نہیں ہے اور
 بندش بھی تعقید سے خالی نہیں: ”کسائے پھرتے“ ”ادھار اور“ ”ہیں“ ”ادھار،
 اور“ ”ہیں“ ”ادھار ہم بھی“ خوش نما نہیں۔ چاہو، رہنے دو۔

قی پر ہر صورت زبر رہتا ہے۔

اُردو میں اصل معنی یعنی ”تلاوار کی لڑائی“ تو ختم ہو گئے۔ اُس کے بہانے، جگہ کی تنگی، جنگلاں،
 بھیڑ کے معنوں میں مستعمل رہا ہے۔ آئندہ کہ یہ حمد یہ کہ ”اُردو میں یہ کسر لَام“ ہے اور صرف ”انہوہ“
 کے معنی میں ہے، صحیح نہیں۔ دآغ کے مندرجہ بالا شعر سے اس قطعیت کی خود بخود ذہنی ہوجاتی ہے۔
 دآغ کے شعر میں ہنچ لَام، اور ہ معنی ”ہنگراؤ“ نظم ہوا ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے یہ لفظ اردو
 میں ہنچ لَام اور یہ کسر لَام، دونوں طرح مستعمل ہے اور ہنگراؤ، جنگلاں، انہوہ، جگہ کی تنگی کے معنوں
 میں آتا ہے، اور قاف ہر صورت میں مفتوح رہتا ہے۔

لے ”دونا ہونا“ یا ”خنجر کا دونا“، دو آصفیہ میں ہے ”دو دریں۔ الہ دو دونوں میں“ ”دونا ہونا“
 موجود ہے۔ کور کی عبارت یہ ہے: ”دونا ہونا (دکھن) تلوار یا نیچے کا دھرا ہونا، خمیدہ ہونا،
 مہا، جان شیریں ہم نے کس سختی سے دی۔ نیمپہ قاتی کا، دونا ہو گیا“
 مقابلہ کرنے پر معلوم ہوا کہ صاحب کور نے ذرا سی ترمیم کے ساتھ، آصفیہ کی عبارت کو

”سیچہ بخنی میں مدیم اثل“: ”سیچہ بخنی“ میں یاے تختائی کا اسقاط دہا ہے ،
ترکیب فارسی ہے ، اگرچہ بعض اساتذہ اردو کے کلام میں مستعملی ہے ،
مگر کیا ضرور ہے ۔

”نہا شد جز ہوائے شوق عیار“: اس میں اگر محو ہو تو ”پسند نہیں تو غیر تو“
رکھے ، کچھ مضائقہ نہیں ۔

(ہدایم کوثر خیرآدوی)

نقل کر لیا ہے ۔ ہر صورت ”دونا ہونا“ اور ”دونا ہونا“ میں کچھ زیادہ فرق نہیں ۔
اسے ترکیب فارسی کی شرط نہیں ، ترکیب ہریانہ ہو ، ہر صورت میں عربی و فارسی الفاظ کے آخر سے
ی کے سقوط کو غلط بتایا گیا ہے ؛ مگر یہ اس قدر بے اصولی یا جندی تھی کہ پوری طرح ناپائی نہیں
جاسکی ، اور ”بعض اساتذہ“ نہیں ، اکثر اساتذہ کے یہاں اس کی مثالیں ملتی ہیں ، اس کتاب کے
ایک دوسرے مضمون میں اس پر مفصل گفتگو کی گئی ہے جو اسی موضوع پر ہے ؛ اس کو دیکھا
جاتے ۔ یہاں پر صرف امیر چنائی کے یہاں سے سقوط یاے معروض کی چند مثالیں پیش کی
جاتی ہیں ، اور ان کو دیکھ کر اس بات کا بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جب امیر خود اس
”لزوم مالا یزوم“ کو نہیں نہاد سکے ، تو دوسروں کو کیا کہا جائے گا !

پاس یکتائی کا اس شوق کو ایسا ہے امیر رستم خاں عشق ، محبوب پریس حیدر آباد (ص ۳۲۸)

تیری بے دردی ہی اچھی تھی ترس کھانے سے (ایضاً ص ۲۸۰)

چپ کے تنہائی میں افکار سے رویا ہو گا (ایضاً ص ۱۱۳)

تنہائی میں درونے دنگانے کا لکنت ہے (ایضاً ص ۳۱۲)

رسائی کچھ نہیں دشوار ہاں تک اُس کے (ایضاً ص ۲)

یہ شیخ سعدی ہے جس نے کہ چشم روشن کو (مرآۃ الغیب ص ۲۷)

(۱۸) گل دستوں کے متعلق رائے، گل دستہ دامن گل چھیں :

"سلام نیاز کے بعد مذ مانگار ہوں کہ نور چشم محمد احمد کے چھوٹے بھائی،
برخوردار لطیف احمد کی طبیعت شعر سے بہت مناسب واقع ہوتی ہے،
اس زمانے میں بہ سبب بے شغلی کے، اُن کو خیال پیدا ہوا کہ دامن گل چھینانے
قابل ہے جاں میں پھرتے سرے سے روح پھونگی جاتے۔ مجھ سے سرا کیا
کہ اس گل دستے کی نگرانی پر مثل سابق پھر توجہ کی جائے۔ اگرچہ میں اپنے اُلام و
استقام کی وجہ سے کٹھا ہو رہا ہوں مگر اُن کی خاطر سے منظور کرنا پڑا۔

گل دستوں کی کثرت ایسی ہے کہ ابد ہم مشغلہ بھی ابتذال سے خالی نہیں اور
زیادہ تر اسی ابتذال کی وجہ سے طبیعت گریز کرتی ہے۔ اور پرچے کو رونق بھی
مشکل معلوم ہوتی ہے۔ موجودہ گل دستوں سے فروغ کی صورت اگر ہے تو
- یہی کہ محاسن معنوی میں کوشش کی جائے۔ اس کا دارا صرف اس بات
پر ہے کہ معدودے چند عمدہ نامور شعراء خوش فکر و خوش مذاق کا کلام
ہمیشہ اس میں چھپے۔

آپ کی ذات سراپا صفات اس طبقہ نامور کی انسر ہے، اور غایت مشاقی
سے اب غزل کہو دینا، آپ کے بانی ہاتھ کا کھیل ہے؛ لہذا خواست گاریوں
کہ اپنی طبیعت نازک پر مبر کر کے، بالالستزام غزل دینے کا وعدہ کیجیے۔
مگر پہلے سے کہہ رکھتا ہوں کہ غزل ایسی کہا کیجیے گا کہ ہم سے غریبوں کو بھی

طرف العین میں وہ روشنی پہنچی جو قریب (ایضاً ص ۳۵)

دے دفائی کا فم سنا، دُورِ جدائی کا (ایضاً ص ۸۳)

بھٹیاں ہوتی ہیں آبادی سے اکثر باہر (ایضاً ص ۱۲۶)

کہنے کی گنجائش رہے یہ نہ ہو کہ پہلے ہی سے دنیا بھر کے قلم توڑ دیے جائیں۔
 پرچہ ابتداء نے جنوری میں نکلے گا۔ مصراع طرح بابت جنوری ۱۸۹۹ء و گیسو
 بچپان کی گلیاں ہیں مری چھانی ہوئی۔ مہانی، تافیہ ۹

[برنامہ داغ دہلوی، ۳۱ نومبر ۱۸۹۸ء]

(۱۹) بد سلسلہ مکاتیب و امیر اللغات۔

بعد میں، ہووے، ہوتے ۱

”تم نے میری انشا پردازی کی ستائش کر کے، اور مجھے شرمندہ کیا۔ شرمندگی
 کے ساتھ، تمہاری قدر دانی کا جو محض محنت سے ہے، شکر گزار ہوں خطوط
 میں فکرے اچھے لکھا تھا، وہ ذخیرہ ایک سو کئی جو کامیرے ایک شاگرد نے
 جمع کیا تھا۔ سولہ برس ہوئے کہ وہ بے چارہ مر گیا اور اس ذخیرے کا پتہ نہ
 لگا۔ پھر کسی نے جمع نہیں کیا۔ تین چار شاگردوں نے کہیں کہیں کچھ خطوں کی نقلیں
 اپنی پسند کے موافق لکھ لیں، وہ جا، جا ہیں بعض تحریروں کی نقلیں لڑکوں نے
 کر لی ہیں۔ اور جب سے دفتر امیر اللغات کھولا گیا ہے، مختصران دفتر بعض
 مکاتیب لکھ لیتے ہیں۔ یہ سب بھی جمع ہوں تو ایک مجموعہ ہو سکتا ہے،
 مگر یہ کام کون کرے۔ اس قدر ضرور ہے کہ کوئی خوش سلیقہ فہیدہ و
 سنجیدہ آدمی ترتیب دے کہ ان کو یک جا لکھ دے اور میں ایک نظر دیکھ کر
 جو مطلب شائع کرنے کے ذہنوں، ان کو نکال ڈالوں، تو بہنے بنگراس کی

لے۔ اسی سلسلے میں آئبر نے اپنے شاگرد آزاد سہارن پوری کو بھی لکھا تھا: ”گل درخشاں گل ہیں
 جنوری سے بہ اہتمام نو تہم لطیف اصحاقر بھر نکالے گا۔ یہ وہی پرچہ ہے جو ۱۸۸۵ء میں میری
 نگرانی میں نکل کر مقبول عام ہو چکا ہے۔“ (مکاتیب امیر بھٹائی، ص ۱۲۲۲)۔

(۲) ڈھونڈھے ہے۔ خور و نوش :

”ڈھونڈھتا ہے“ کی جگہ ”ڈھونڈھے ہے“، اب زبان نہیں ہے۔ قدر ماکنتے ہیں، متاخرین نے ترک کر دیا ہے۔

ہے۔ برگزائے کلام میں ”ہو دے“ نہیں لاتے ہیں۔

ادویہ جو ”ہو“ کے آخر میں کہی جترو اور سی بڑھا کر ”ہوتے“ بولتے ہیں، بنی کہ شعرا روئے، سوئے، دھوئے وغیرہ کا قافیہ بھی گزرتے ہیں، ایہ مولف کے نزدیک نرد اند میں کیسا، محض غلط ہے۔ ”دس ۱۳۔

لے ایسے افعال کو متروک قرار دینا، زبان اور حسن بیان، دونوں کی جان پرستم کرنا ہے۔ شکر ہے کہ اس زمانے میں بھی سب نے اس غیر مناسب فیصلے کو تسلیم نہیں کیا تھا، اور آج تو اکثر لوگ اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ فراق نے اپنی کتاب اردو کی عشقیہ شاعری میں اس سلسلے میں ایک نہایت عمدہ بات لکھی ہے :

”ہندی یا اردو فعل کی ایک قدیم صورت ایسی تھی جو مذکر و مؤنث دونوں کے لیے آتی تھی، جیسے، آتے ہے، یا آوے ہے... وغیرہ جن کی جگہ پر اب ”آتی ہے“ یا ”آتے ہے“... دے دیتے ہیں۔ اس قدیم شکل میں واحد و جمع بھی صرف ”ہے“ کو ”ہیں“ کر دینے سے بن جاتا تھا۔ یہ شکل وہ لطیف، نازک، رنگین بہام پیدا کر دیتا تھا، جس کا ذکر میں فارسی تغزل کے سلسلے میں بھی کر چکا ہوں۔
وہی دکنی کلام شعر ہے، جس پر مہذب دنیا کی مہذب سے مہذب شاعری دھد کرے گی، اور جس میں محبوب کے بارے میں یہ کھلتا ہی نہیں کہ وہ مرد ہے یا عورت : وہی اس گوہر کاں حبابہ واہ کیا کہنا
مرے گلاس طرح آوے ہے چوں سینے میں ماز آتے“ (دس ۱۰)

فراق لے کر دو کے انداز بیان کی ایک خوبی کی طرف جو اشارہ کیا ہے، وہ بہت اہم ہے۔ اس اہام رنگیں کے علاوہ، ایسے افعال عام صورتوں میں بھی کہیں کہیں بہت لطف دے جاتے ہیں۔ اردو کے اہم شعرائے ہر ایک ایسے افعال کو استعمال کیا ہے۔ یہاں پر خاص قسم کے اساتذہ سے بحث نہیں، اور ایسے مصرعے یا شعر کسی طرح کی عدم فصاحت سے گماں بار نہیں معلوم ہوتے۔ اس کے برعکس، جن بیان کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ جیسے: آئے ہے بے کسی عشق پر رونما غالب، غالب، ڈھونڈ رہے ہے اُس مفتی آتشِ نفس کو جی غالب، آج کل تو ایسے افعال کو بے محنت استعمال کیا جاتا ہے، جسے ضرورتاً لایا جانے کے طور پر، خود فراق لے کر ایسے افعال کو نہایت خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے، جیسے: اُن کی وہ غزل، جس کا ایک سادہ و تہ دار شعر یہ ہے:

جو بے خواب رکتے ہے نازِ بنگی وہی غم کسی دن سُلا جاتے ہے

یہاں پر اس کتنے کی طرف تو تم دلانا بھی فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ ایسے بہت سے مقامات آتے ہیں، مصرعے کے درمیان میں یا قافیے کے محل پر، جہاں ”آتا ہے“ جانا ہے“ جیسے افعال اگر لائے جائیں تو ”آتا“ اور ”جانا“ وغیرہ کا کثرتِ دہرائے اور نہایت درجہ ناگوار صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ میں صرف ایک مثال سے اپنی بات کو واضح کرنا چاہوں گا، داغ کی ایک غزل ہے، جس کا ایک مصرعہ یہ ہے، ح: میں نے وہ رنجِ اشاعتے ہیں کہ جی ہانتا ہے داغِ اشاعتے داغ، ص ۱۴۳، قافیہ کس قدر محلی فصاحت اور بارِ سامت ہے اگر دنگ اساتذہ دلی (ذوق، مومن، غالب وغیرہ) کی طرح داغ یہاں پر بھی جاتے ہے“ لکھتے تو وہ خرابی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، آج کل، اساتذہ متروکین کی طرح، ایسے افعال کو بے محنت استعمال کیا جاتا ہے اور وہ واقعی لطف دے جاتے ہیں۔ مثلاً اس زمانے کی ایک ممتاز غزل گو فاقون کی ایک غزل کے یہ دو شعر دیکھیے:

کیا قیامت ہے کہ رامِ عشق میں ہر گام پر منزلوں کا فاصلہ کچھ اور بڑھ جاتا ہے

اس شبہ تاریک میں تنہا ہوں میں تنہا ہوں
کئی جگہ، کئی ٹارا، جی بہت گہرائے ہے
(خانم ممتاز مرزا)

اصل بحث کے بعد، ایک ضمنی بات کہنا چاہتا ہوں: قزاق نے دلی کے جس شعر کو پیش کیا ہے، وہ اس طرح صحیح نہیں۔ کلمات دلی، مرتبہ مولانا آحسن مارہروی نیز کلمات مرتبہ ذاکٹر نور الحسن انجمی میں یہ شعر اس طرح ہے:

"دلی اس گوہر کاں حیا کی کیا کہوں خوبی

مرے گھر اس طرح آتا ہے، جیوں پہننے ملا آئے"

رضا لاہوری رام پور کے ایک مخطوط کربان دلی میں، دوسرے مصرعے میں "آتا ہے کی جگہ
"آتا ہے" ہے، یعنی: "مرے گھر اس طرح آتا ہے، جیوں پہننے میں رانا آوے"۔ بہر حال وہ شعر تحقیق
مزید کا محتاج ہے۔ مگر اس اختلاف متن سے قزاق کی بات پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ قزاق کی بات اپنی
جگہ پر بالکل صحیح ہے اور مثلاً اس ایک شعر کی جگہ اور بیسیوں شعروں میں کیے جاسکتے ہیں۔

مولانا حسرت موہانی نے اپنے رسالے نکات سخن میں، اس سلسلے میں اساتذہ متقدمین و
متاخرین کے یہاں سے بہت سی مثالیں ہمیش کی ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ افعال کی یہ
صورت کس قدر مرتبہ رہی ہے اور کس قدر در عمل استعمال ہوا ہے ان کا۔ میں یہاں پر مولانا
مرحوم کی مکمل عبارت اور کچھ مثالیا شعار نقل کرتا ہوں:

"آئے ہے" اور "جائز ہو" قزاق دہلی مثیل میر تقی، بلند شہر، علی گڑھ میں آج تک
عوام کی زبان پر جاری ہے مگر تحریر و نظم میں اب کلمت کے مانند دہلی میں
بھی یہ الفاظ بالافتاق متروک سمجھے ہیں۔ راقم حروف کے نزدیک بھی اس قسم
کے الفاظ کا ترک جائز ہے لیکن ضرورت شاعری کے خاص موقعوں پر،
بشرط مشافی کامل، ان کے استعمال میں بھی کچھ مضائقہ نہ ہونا چاہیے۔ مثلاً مرزا
نہیم دہلوی کا ایک مصرع ہے: "رحم آجاتا ہے دشمن کی گرفتاری پڑ مرزا صاحب

اگر زبانِ کشتو کی باندی سے آزاد ہو کر "رہ آجاتا ہے" کی جگہ "وہم آجاتے ہے"
 لکھتے تو کچھ ہرج دہو تامل کہ غالباً بہتر ہوتا۔ یہی حال بنجور دہلوی، شاگردِ دانگ کے
 اس مسئلے کا ہے :

کوئی چل جاتا ہے جب تیر نظر، تیر کے ساتھ
 خود تڑپ جاتا ہے مینا د بھی، پنچیر کے ساتھ
 اب متقدمین سے لے کر متوسلین و متاخرین و شعراے دوہر حاضر کے کام سے
 اس کی مثالیں ملاحظہ ہوں :

پل مارتے کرے ہے اشاروں سے منہم
 ملک اُس ستم ظریف کا بہتان دیکھو (قائم)

دل لے گیا ہے میرا وہ سیم تن چڑا کر
 شرمہ کے جو چلے ہے سارا بدن چڑا کر (مقتدی)

کون آئے ہے کہ سینے میں بیدار ہو گئی
 صدا آرزوے خفت، صداے قدم کے ساتھ (ممنون)

مستانہ طے کروں بہوں رہ وادی خیال

تا باز گشت سے نہ رہے مدد مانجھے (غالب)

اب یہ حالت ہے کہ تجھ سا بے درد

میسرے بچنے کی دعا مانگتے ہے (ملکین)

برے سے بے لہو، جنبشیں ابرو کی ادا میں

خنجر کو ڈلو دیجیے خونِ شہدا میں (بنواری لال قلعہ)

دورنہ، اکہ فاکسترو جنت، شہرِ حرام

ڈھونڈے ہے ٹھکا اول بے بال و پراپنا (شاکی برکشی)

”خود نوشتن“ زیادہ مستعمل ہے۔ نقطہ ”نوشتن“ اس عمل پر زبان نہیں، اور کوئی عیب بھی نہیں۔ مضمون اچھا ہے اور معیار درست ہے، لہذا رہنے دیجیئے۔ اصلاح سے زیادہ ہر جگہ وجہ اصلاح لکھا دشوار ہے۔ اور اکثر درجہ وجدانی ہوتے ہیں، جن کو طبع سلیم سمجھ لیتی ہے۔“

[برنامہ ناظم سہارن پوری، ۲۶ جولائی ۱۸۹۱ء]

(۲۱) ہوا ہند۔ انگریزی الفاظ۔ فرہنگِ فرہنگ:

”میرے پاس بھی الف سے سی تک مسلسل معنی و شل کے ساتھ لغت موجود ہے۔“

کام یابہر عشق بے حد ہے دلِ محفرت نصیب

آرزو کے سرے گزرا جائے ہے آبِ لظاف [حسرت برہان]

(نکاتِ سخن، انتظامی پریس حیدرآباد، ص ۲۲-۲۳)

۱۔ ناظم کا شعر یہ تھا:

”دعویٰ گے پڑوں کو پہنچتی ہے آن کے گھر ہے میرے آبلوں کا لہو، نوشتن نقش“

(مشاطہ سخن، اول، ص ۵۹)

مشاطہ سخن میں اس شعر کی اصلاح کے ذیل میں اسی کے خط کا اس سے متعلق اقتباس

ہی ہے مجبوراً سکتا ہے اور اس میں بعض الفاظ کا فرق ہے۔ میں نے ”خود نوشتن“ سے متعلق عبارت مشاطہ سخن کے مطابق رکھی ہے۔

جیل سہوانی نے مسند مرزا پوری (موتلف مشاطہ سخن) کے نام ایک خط میں ناظم کا یہی

شعر نقل کر کے لکھا ہے:

”منشی صاحب تھے اس شعر کی تعریف فرمائی اور کچھ اصلاح دی، لیکن میرا خیال

ہے کہ آبلوں میں لہو نہیں ہوتا، پانی ہوتا ہے۔ معلوم نہیں جناب منشی صاحب کی

تہ نے جو انگریزی الفاظ امیر اللغات میں کم پائے، اس کی وجہ یہ ہے کہ کہیں میں یہ اتفاق یہ رائے قرار پائی کہ امیر اللغات میں وہی الفاظ انگریزی کے داخل کیے جائیں، جن کی جگہ اردو میں کوئی فصیح، مختصر اور ٹھیک معنی میں لفظ موجود نہیں ہیں۔ آفس، آفٹر، آڈر وغیرہ کھسے کھسائے مستوی سے خارج کر دیے گئے، کیوں کہ "آفس" کی جگہ کپڑی اور دفتر اور آفٹر کی جگہ مصنف "آرڈر" کی جگہ حکم موجود ہے۔ آنر، آنر بیل، انگریزی وغیرہ کھسے گئے ہیں۔"

[بہ نام ذابدا، ۲۶ ستمبر ۱۸۹۱ء]

(۲۲) نجم الامثال خزینۃ الامثال :

"امیر اللغات میں مدد دینے سے ہاتھ نہ روکو، یعنی جو کچھ ہو سکے وہ لکھا کرو اور ممنون و مشکور کیا کرو۔ اگر نجم الامثال لے کے سوا کوئی ذخیرہ متلون اردو

الفاظ پر مشتمل کوئی کتاب ہوگی، مگر مولف فرہنگ آخند راج دسالی ترتیب: ۱۳۰۶ھ نے اس کو اپنے آخذ میں گنا یا ہے اور لفظ "باہرہ" کے قول میں اس کا حوالہ دیا ہے، اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ کسی مشرق کا لغت ہو گا۔ لغت نامہ دہمدا کے چالیسویں صفحے میں لغات فارسی سے متعلق جو مقالہ ہے، اس میں مقالہ نگار نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے فرہنگ آخند راج کے آخذ کا ذکر کرتے ہوئے فرہنگ فرنگ کے متعلق لکھا ہے: "مقصودش از فرہنگ فرنگ درست معلوم نہ شد۔ گویا کتاب لغت جانسن یا استینگس است کہ ہر دو لغت عربی و فارسی بہ انگلیسی است" (ص ۲۲۰)۔

لے یہ کتاب مولوی محمد نجم الدین دہلوی کی تالیف ہے۔ مولف اینگلو سنسکرت اکیول دہلی میں مدرس اولی فارسی و ریاضی تھے۔ یہ پہلی بار مطبعہ مجتہبان دہلی میں ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء میں

شانِ اِخْطال کا سب سے اوجڑا کام نکلتے۔ جنھیں تو خزینۃ الامثال میں ملتی ہیں، مگر
شانِ اِخْطال نہیں ملتی۔

[پہ نام نمابر، ۳۱ جنوری ۱۸۹۲ء]

پہلی سنی اقطعات تاریخ طباعت، شامل کتاب، یہ اڈیشن کم باب ہے۔ رضا الانجری رام پور
میں اس اڈیشن کا ایک نسخہ موجود ہے۔ اس کا تیسرا اڈیشن مولف کی زندگی ہی میں شائع ہوا تھا
جس میں مولف نے دریاچہ کتاب کی صراحت کے مطابق، خاصی ترمیم و ترمیم کی تھی یہ اڈیشن
میری نظر سے نہیں گزرا، البتہ اس کا چوتھا اڈیشن پیش نظر ہے، جس کو کارخانہ چپ اخبار
(لاہور) نے ۱۹۲۵ء میں شائع کیا ہے۔ مولف کی صراحت کے مطابق یہ کتاب پانچ حصوں پر
مشتمل تھی، باقی چار حصے ناقابلِ شائع نہیں ہو سکے۔ مولف نے اس کتاب کے حصوں کی تفصیل
درج کی ہے، اس کی بنا پر یہ مطبوعہ جلد حصہ پنجم ہے، اور اس پانچویں حصے میں کئی جملہ ضرب
الامثال یعنی کہاوتیں مع ان کے معنی استعمال اور قصص کے بہت ایجاز اور اختصار کے ساتھ،
سلیس اردو میں بیان ہوئی ہیں، یہ اڈیشن، نہایت خراب یاد دہانی کا غنہ پر چھاپا ہے اور
۳۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلا اڈیشن ص ۱۶۸ صفحات پر جاری تھا۔ موضوع کے لحاظ سے
یہ کتاب ایسی دوسری کتابوں سے زیادہ جامع اور مفصل ہے، بل کہ بعد میں شائع ہونے والی
کتابوں کا ماتخذ رہی ہے۔

۳۔ اس کے مولف ہیں سید حسین شاہ حقیقت۔ یہ عربی، فارسی، اردو، تینوں زبانوں کی
ضرب الامثال پر مشتمل ہے۔ ہر حرف کے ذیل میں پہلے عربی امثال ہیں، پھر فارسی، پھر اردو۔
عربی امثال کا بین السطور ترجمہ بھی ہے اور حواشی پر مزید تشریح بھی کی گئی ہے۔ یہ ترجمہ اور
حواشی مولوی خراب علی صاحب کے ہیں، جو انھوں نے عبدالرحمان شاکر ابن ماجی محمد روشن خاں
دہرادہ محمد مصطفیٰ خاں، صاحب مطبع مصطفائی کی فرمائش پر لکھے تھے۔ مولف کی صراحت کے

(۲۳) یہ سلسلہ ۳ امیر اللغات - سقوط العت - جس کھڑکنا :

”امیر اللغات کی جلد ثانی غالباً العت مقصورہ ہی پر تمام ہو، یا شاید باے موقوفہ کا بھی کوئی ٹکڑا شریک ہو جائے۔ تم سے اگر ممکن ہو تو زبان کی اصلیت، کہ ابتدا کہاں سے یہ زبان پیدا ہوئی اور کن کن تغیرات کے بعد اس حد کو پہنچی، وغیرہ وغیرہ لکھو۔ تذکرۂ آب حیات میں آناؤنے اور علوۃ خضر میں صفیر نے

منظوماتی ربہ کتاب ۱۲۱۵ء میں مرقب ہوئی۔ اس میں صرت امثال ہیں، شان مثل یا سندھ کوہ نہیں۔ ۱۲۷۰ء میں مصطفائی پریس کانپور میں چھپی تھی۔ کل ۲۲۳ صفحات ہیں۔ تذکرۂ سراپا سخن کے مولف محسن، انہی حقیقت کے صاحب زادے تھے۔ اس کا ایک نسخہ دہلی یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ ہارڈنگ لائبریری دہلی میں بھی ایک نسخہ ہے۔

خزینۃ الامثال نامی ایک اور چھوٹی سی کتاب بھی ہے جس کے مرشب ہمارے زمانے کے کئی نصائی کتابوں کے مرقب حافظ جمال الدین احمد جعفری ہیں۔ اس میں ۲۳۰ امثال ہیں چھوٹے سا تذکرہ کتاب ۱۶۷۰ء صفحات پر حاوی ہے۔ مطبع انوار احمدی میں چھپی ہے۔ سب سے طبع و روح نہیں طلبہ کے مطلب کی کتاب ہے۔

امثال کی قدیم کتابوں میں ایک کتاب بھی قابل ذکر ہے: بابو کالی چرن، امینڈ کلرک سررشتہ تعلیم، نے دو حصوں پر مشتمل ایک مجموعہ امثال مرقب کیا تھا۔ پہلے حصے میں ۱۲۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ فارسی امثال ہیں۔ اور دوسرے حصے میں گریہ بھی ۱۲۵ صفحات پر حاوی ہے۔ اردو امثال ہیں۔ اس مجموعے میں صرت مثلیں لکھی گئی ہیں، نہ معانی ہیں نہ عمل استعمال کا ذکر ہے۔ حصہ اول کا نام ”فارسی امثال“ ہے اور حصہ دوم کا ”اردو امثال“۔ یہ کتاب ”مطبع سوسیتٹی بریلی“ میں ۱۸۶۸ء میں چھپی تھی۔ نہ مقدمہ ہے نہ خاتمہ۔ دونوں حصے ایک جلد میں ہیں۔ اس کا ایک حصہ رضا لائبریری رام پور میں ہے۔

اور ملکستانِ سخن میں مرزا صاحب بر بخش شاہزادہ دہلی نے کچھ کچھ اس بحث کو لکھا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ امیر اللغات میں یہ بحث ان سے الگ اور نہایت شرح و بسط کے ساتھ بھی جاتے۔ مگر اس کے مادے کا پتا نہیں لگتا کہ کہاں سے اخذ کیا جاتے۔ تم کہیں سے لڑ لگاؤ۔ میں بھی لکھ رہا ہوں۔ جو کچھ آزاد و صغیر وغیرہ نے لکھا ہے، امیر اللغات میں اس کی نقل کر دیے کو تو جی نہیں چاہتا۔ نئی باتیں بھی پیدا ہوں اور ان کے ضمن میں یہ باتیں بھی سب آجائیں۔
الف کا گڑا جاتا نہیں۔ ہندی کا الف جو آخر میں ہو، وہ گڑتا ہے۔ بعض شعرا نے جو ایسا کہا ہے، وہ قابلِ استناد نہیں، کیوں کہ اساتذہ کی طرف سے وہ ہمیشہ موردِ ایرادات رہے ہیں۔
مطلوع میں میں نے دخل دیا ہے :

ہاتھ تک اس کے جوہر دسترسِ جامِ شراب

کیوں : اس ہاتھ سے جو پھر ہوس جا کر شراب

دوسرے مصرعے میں "اس ہاتھ سے" کی جگہ سے غواروں کو بنادیا ہے ، کیوں کہ لطف اسی قدر مضمون میں ہے کہ جب جامِ شراب کو یہ فرما لیا ہے کہ اُس کے ہاتھ تک پہنچتا ہے، تو ایسے جامِ شراب کی ہوس بے غواروں کو کیوں زہر۔ جب "اس ہاتھ سے" کہیے گا تو جامِ شراب کے اس ہاتھ تک پہنچنے کا فائدہ کچھ نہ رہے گا۔

"جس کا کمر لگتا" فصحا نہیں کہتے [اس لے بد لگایا] [بو نام زاہد، ۱۳ جون ۱۹۶۲ء]

لے غور و مکاتیب میں یہ جملہ غلط چھپا ہے۔ مشاطہ سخن (اول) میں اصلاحاتِ اخیر کے ذیل میں اس خط کا اقتباس بھی ہے، اس جملے کی تصحیح دیں سے کی گئی ہے۔
لے زاہد کا شعر یہ تھا،

(۲۴) پر سلسلہ امیر اللغات :

”میں استقرائے کلام اور لغات سے عوام اور خواص کے دہی الفاظ لیتا ہوں جو اردو لغت کی شان پر سمجھتے ہیں۔ آپ کے سلسلہ الفاظ میں بھی جو لفظ ایسے ملیں گے، داخل لغت کیے جائیں گے۔ میں نے بہت دنوں ملک کی راسے پر کام کرنا چاہا، مگر باہم رایوں کا اختلاف اس قدر ہوا کہ میں عاجز آیا۔ چند نازک خیال اور مالی دماغ احباب نے بھی راسے دی کہ ان جھگڑوں میں لغت تالیف سے رہ جائے گا؛ مگر صرن اپنی راسے کو دخل دینا چاہیے۔ ناچار میں اب اپنی ہی راسے سے کام لیتا ہوں۔ اور جو عزیز یاد دوست میری مدد کرتا ہے، اور اپنی کوئی صاحب راسے ظاہر کرتا ہے، اس کا شکریہ ادا ہوتا ہوں، اور اس کی راسے ماننے دمانے میں ہٹ دھرمی نہیں کرتا۔“

قافیلے ہوش کے رخصت ہوئے سے خواروں سے

شب جوئے خانے میں کھڑکا جربہ جام شراب

اتیرنے دوسرے مصرعہ کو یوں بتایا: حق، سخن کے خانے میں شوہر جربہ جام شراب (مشاط سخن، اول، ص ۶۰)۔ قوسین کے الفاظ بھی مشاط سخن سے منقول ہیں۔

سلسلہ متنازعی آہ امیر اللغات کے دفتر میں پانچ چھ سال کام کرتے رہے تھے، انہوں نے اتیر کے سوانح پر ایک کتاب لکھی ہے، اس میں لکھتے ہیں :

”اصول تالیف میں ملک کے نامور قابل اصحاب سے راسے لی گئی اور ایک کمیٹی

تاکم ہوئی جس کے ممبر: مولوی حفیظ اللہ، مدرسہ عالیہ عربی کے پروفیسر مولوی

فیض الزماں خاں صاحب نعیم، منشی عبدالرحمان صاحب بھٹل، منشی محمد احمد

صاحب قمریہ، حکیم نیم الزماں خاں صاحب نعیم، حافظ محمود علی صاحب ندرا

آزردگی، آسودگی، آشفتگی، آوارگی، یہ سب قاعدے کی بنا پر چھوڑ دیے گئے۔ اور آزادہ رد، آفس، آفیسر، آوارہ مزاج، آجمل ڈھلتا، بے شک امیراللغات میں نہیں ہیں۔ بعض تو اختلافِ رائے کی وجہ سے عاجز ہو کر چھوڑ دیے مثلاً "آفس" کہ اس کی جگہ کچری اور دفتر کا لفظ موجود ہے۔ جو آدمی انگریزی اور آدمی اردو دہلے ہیں؛ زیادہ آسانی کی زبانوں پر یہ لفظ ہے۔ اور "آفیسر" لکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی، "آفسر" موجود ہے، اور اس دو سرے حصے میں لکھا گیا ہے۔ اور بعض نقص استقرائے رہ گئے یہ الزام ہے ہمارے۔ اس کا دعوا کبھی نہیں کیا گیا کہ امیراللغات میں کوئی لفظ چھوٹ جائے گا، کیوں کہ یہ محال ہے۔ بڑے بڑے فارسی اور عربی کے لغات موجود ہیں جن میں روزمرہ کے صدام الفاظ نہیں ملتے۔ مزاج وغیرہ پر دس ہزار لغات صاحبِ قاموس نے بڑھائے۔ صاحبِ فیث اللغات نے کیا کچھ کوشش نہیں کی، مگر پھر بھی صدام الفاظ نہیں ملتے۔ اردو میں اس وقت جسٹس لغت

تھے، اور حضرت امیر مینائی صدر۔ تجویز پر قرار پائی تھی کہ دن میں جس قدر تالیف ہو، شب کو اُسے کمیٹی سن لیا کرے۔ دو مہینے تک روزانہ شب کو یہ کمیٹی کام کرتی رہی، مگر بحث و مباحثہ نہ ہوا۔ نتیجہ نکلا کہ "آ" کا لفظ بھی ختم نہ ہوا۔ آخر کار یہ رائے قرار پائی کہ نوٹ اپنے ہی اجتہاد سے کام لے؛ تب ہمارے کام چل نکلا؟

(سوانحِ امیر، ص ۱۱۳)

امیراللغات کا حقہ اول ۱۸۹۱ء میں مطبعہ مفید عام آگرہ میں چھپا تھا، اس پر چوتھا، پھر دہلی کے شروٹا میں شامل کر دیے گئے، پھر اسی پر پچیسویں ۱۸۹۲ء میں چھپ گئی تھی، ان میں ایک تیسرا نسخہ محمد اسحاق دکنی دکنل گورنمنٹ پبلشنگ، جس میں مندرجہ کتاب الفاظ کے جوٹ جانے کا، طور خاص ذکر کیا گیا ہے۔

لکھے گئے ہیں، ان کا یہی حال ہے کہ پہلے میں دس لغت ہیں تو دوسرے میں
 ہیں۔ تیسرے میں پچاس ہیں تو چوتھے میں سو۔ ہاں میں نے یہ قصد کر لیا ہے کہ جو
 لغات نصف چھپنے کے بعد چھوٹے ہوئے معلوم ہوں گے، وہ سب ایک جگہ جمع ہونے
 جائیں گے اور ضخیم کتاب کے بعد ایک ضمیمہ ان کا لگا دیا جائے گا، جیسا کہ صاحب
 برہان قاطع نے کیا ہے؟

(یہ نام نآہد۔ ۲۷ ستمبر ۱۸۹۲ء)

مے برہان قاطع کا ضمیمہ صاحب برہان کا مرتب کیا ہوا نہیں، اس کا پہلا ایڈیشن سناس روہج
 نے ۱۸۱۸ء میں شائع کیا تھا۔ برہان کے قلمی نسخوں میں مختلف مقامات پر جو حواشی لکھے ہوئے تھے
 ان کو روہج نے بطور ملاحظات، آخر کتاب میں درج کر دیا اور بقول قاضی عبدالودود صاحب،
 خود بھی اس میں اضافہ کیا۔

برہان قاطع، مطبوعہ تہران کے مرتب ڈاکٹر محمد مصیبن نے جو یہ لکھا ہے کہ،
 "ملاحظات برہان قاطع، تالیف عبدالمجید قائم مقام قاضی القضاۃ بہاری و مولوی
 بدیع الدین و مولوی عبداللہ و مولوی مجیب الرحمن و حکیم عبداللہ و عبدالصمد
 و عبدالمجید، مشتمل بر لغات و کلمات نیکہ در متن برہان یا مدہ اند و آن بعنوان
 (ضمیمہ) ضمیمہ برہان قاطع چھاپ کلکتہ سال ۱۲۵۰ قمری (۱۸۳۳ م)، و نیز چھاپ کلکتہ
 ۱۲۳۷ قمری (۱۸۵۸ م)۔ بطبع رسیدہ است" (مقتدہ ص ۱)۔

یہ درست نہیں کیوں کہ عبدالمجید والا ایڈیشن جس کا ڈاکٹر ڈاکٹر مصیبن نے کیا ہے، سنہ
 روہج کی نقل ہے، جو اس سے ۱۷۱۳ برس پہلے ۱۸۱۸ء میں شائع ہو چکا تھا۔ قاضی عبدالودود
 صاحب نے اپنے گرامر قدر مقالے "غالب، حیثیت محقق" میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔ قاضی
 صاحب کی عبارت کا ایک اقتباس:

"تیرہویں صدی میں اس کی مقبولیت کو دیکھ کر روہج کو اس کے طبع کرانے کا

(۲۵) یہ سلسلہ امیر اللغات - سہ حرفی الفاظ میں ساکن کو متحرک کرنا - قدس :

”شانِ امثال میں میں نے یہ راے قرار دی ہے کہ جس حکایت میں غلام نے عقل و عادت کوئی بات ذہن، وہ ضرور لکھی جاتے۔ میرا لگنا ہے کہ مافعیین بھی وہی لوگ اکثر ہیں جو نیچر کے غلام امور پر معترض ہیں۔

الفاظ مثلاً میں ساکن کو متحرک کرنے کا قاعدہ مام نہیں ہے، بلکہ جس قدر اساتذہ نے قصرت کر لیا، اسی قدر جاتر ہے۔

اور خواجہ نصیر مرحوم کا کلام استناد کے لیے کافی نہیں ہے۔ قادر مثنویان کا

خیال آیا اور اس نے اس کی تصحیح میں متعدد ہندوستانی فارسی و انوں کے علاوہ دو ابراروں سے بھی مدد لی۔ نسو رو بک کا انگریزی مقدمہ خود رو بک اور فارسی سید گرم حسین بلگرامی کا لکھا ہوا ہے۔ حواشی رو بک کے تحریر کردہ ہیں، مگر جیسا کہ اس نے خود اعتراف کیا ہے، تاریخی حرج و مرج سے اسے مدد دی تھی۔ حواشی کو جو خاص خاص نسخوں کے حواشی میں تھے، رو بک نے کتاب کے آخر میں درج کیا اور خود بھی ان میں بہت سے لغات کا اضافہ کیا اور مؤخر الذکر و مقدم الذکر میں تہز کے لیے ارموز استعمال کیے۔ رو بک کا نسو ۱۸۱۸ء میں چھپا تھا اس کے چار برس بعد یہ کتاب پھر طبع ہوئی اور بمصر بار ۱۸۳۴ء میں چھپی۔ طبع ثالث کے ناشر حکیم عبدالحمید تھے اور اس کے سرورق پر مراٹھا مرقوم ہے کہ یہ نسو رو بک کی نقل ہے حواشی اور حواشی سے اضافہ اس میں اسی طرح ہیں جس طرح نسو رو بک میں ہیں، مگر حکیم صاحب نے دونوں پر اپنے حذف کر دیے ہیں۔ (تقدیر غالب، ص ۱۶۶)۔

برہان قاطع ۱۶۲ میں کل بمبئی تھی دریا بہ برہان، اٹا کل محمد معین استاد دانش گاہ چہرہ نے اس کو چار جلدوں میں مرتب کیا تھا یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس آڈیشن میں حواشی کو شامل نہیں کیا گیا۔
اسے ابتداء مجھے دھوکا ہوا تھا کہ شاہ نصیر دہلوی کو آئینے نے خواجہ نصیر ”گلدیا ہے۔ محبت بکائی آگے“

نے کہا ہوتا تو مضائقہ نہ تھا۔ معیندا، خواجہ نقیر نے ”قدس“ بمعنی پاک نہیں کہا ہے بلکہ ”قدس“ ایک شہر کا نام تھا، وہاں کے دشت کو کہا ہے، ۵: اور وحشی نے ترے دشتِ قدس کی تیلیاں۔
مستوں کی چشمِ مست کی خڑو کو، گھسی جامِ شراب سے تشبیہ دے سکتے ہیں

ڈاکٹر خورشید احمد طوی نے شاہ نقیر کا کلیات مرتب کیا ہے، موصوف نے میرے استفسار کے جواب میں لکھا کہ: آپ نے جو مصرع لکھا ہے، یہ شاہ نقیر کے یہاں ہے ہی نہیں؟ اور اس سلسلے میں مزید لکھا کہ: یہ صاحبِ جن کو خواجہ نقیر کہا گیا ہے، وہ شاہ نقیرِ عرت میاں کفو نہیں ہیں خواجہ غلام حسین نقیر ہیں، جن کا ذکر تذکروں میں مل جاتا ہے اور بعض دکنی بیاضوں میں ان کا کلام سبھا ہٹا ہے۔ ایک بیاض سے میں نے بیسویں صفحے نقل کروا کے منگائے تھے، بعد میں پتا چلا کہ نقیر نام سے دھوکا ہو گیا، یہ تو شاہ نقیر کے بھائے خواجہ نقیر ہیں؟

تھے قدس (بہ ختمِ اول و سکون دوم) یہ و شلم کو کہیں گے اور قدس (بہ ختمِ اول و مسیح دوم) کے معنی ہیں: قدحِ صغیر و البند۔ شاعر نے اگر اس کو اول الذکر معنی میں نفس و نفس کا ہم قافیہ کیا ہے، تو اس کو طاعونِ نصرت یا شاعرانہ مجبوری سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہ وہی ہی بات ہوگی جیسے موتی نے ایک جگہ شُر (بہ سکون دوم) کو شُر (بہ فتح دوم) نظم کیا ہے۔ ایسے استعمالات سے یہ لازم نہیں آتا کہ لفظ کی اصل حرکات بدل ہی جائیں جتنا موتی کے استعمال کرنے کے باوجود لفظ شُر کی حرکات میں تبدیلی نہیں ہوتی، یہی صورت ”قدس“ کی ہے۔ ہاں بعض الفاظ میں اختلافِ حرکت رونما بھی ہو جاتا ہے، جیسے اخضر۔

تھے گھسی خڑو چشمِ کر خس، جامِ شراب سے تشبیہ دی جاسکتی ہے وہی گئی ہے، جیسے: ذوق کا یہ خمرِ بادۂ صاف میں آیا ہے کہاں سے تنکا۔
گھسی خرگانِ ترے کشا ہے خس ہاں شراب

(دوبیہ ذوق، مرتبہ آزاد وہس ۱۰۲)

خڑو کو گھسی جامِ شراب قرار دینا، میری نظر سے نہیں گھڑا۔

لیکن ایسی تشبیہات میرے نزدیک کماہمت سے خالی نہیں۔ شعرا نے خیال کو
منگس سے تشبیہ دی ہے، اور پھر یہ اعتبار ہمیش کے، زہور کے ساتھ
تشبیہ دے لی ہے۔“

[ہنام زآہد، ۱۳ فروری ۱۸۹۳ء]

(۲۶) باٹ:

”آرو میں“ راہ باٹ“ تو کوئی بولتا بھی ہے، فقط ”باٹ“ پر معنی انتظار
تو ذرا بھی مستعمل نہیں ہے۔“

[ہنام زآہد، ۱۹ مئی ۱۸۹۳ء]

(۲۷) گوہر انتخاب۔ سرمۂ بصیرت:

”گوہر انتخاب میں بہت سے اشعار وہی ہیں جو مجھے وقتاً فوقتاً تلف شدہ دیوان
کے یاد آتے گئے ہیں دیوان خدر میں تلف ہو گیا۔“

گمہ ذوق کا شعر ہے:

لب تک آس کے جو پہوئی دسترس جام شراب بن گیا عالی لب آس کا، منگس جام شراب

(دیوان ص ۱۰۱)

یہ جلیل مانجک ہادی نے سوانح امیر مینائی میں لکھا ہے:

”خدر کے زمانے میں اُن کا بہت سا کلام تلف ہو گیا۔ آس ہنگامے کے بعد
رام پود جانے اور طینان ہونے پر اُن کو خیال ہوا کہ تلف شدہ کلام کے
کچھ اشعار اگر یاد آجائیں تو لکھ لینا چاہیے۔ چنانچہ خدر کرنے سے پہلے شعر یاد آتے
تھے، وہ سب قلم بند کر لیے گئے، اس طرح ایک چھوٹا سا مجموعہ مفردات ہو گیا
جس کا نام ”گوہر انتخاب“ رکھا گیا۔ مرآۃ الغیب کے بعد لکھنؤ میں یہ مختصر مجموعہ

سرۃ البصیرت، چھپی نہیں، ٹپکی ہے۔“

[برنامہ آزاد - ۲۳ جون ۱۹۸۳ء]

چھپ گیا تھا۔ بعد کو جب اس کی کاپیاں باقی نہیں رہیں تو قسم خاذ عشق کے
ساتھ مکرر چھپوا کر آغوش لگا دیا گیا ہے۔ (ص ۵۸)

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ امیر نے اس مجموعے میں تیسرے دور کے اندازِ سخن کی پیروی کی ہے
امیر کا درجہ مکتوبِ قول اور حلیٰ کی مندرجہ بالا عبارت اس خیال کی تردید کے لیے کافی ہیں۔
”گو ہر انتخاب میں حلیٰ کے قول کے مطابق“ شعر ہیں، جن میں اکثریت مطلعوں کی ہے۔ فارغ کے
اس قطعے سے جو شامل مجموعہ ہے اس کی تاریخِ ترتیب و طبع معلوم ہوتی ہے :

وقتِ ترتیب امیر نے لکھا ”گو ہر انتخاب“ ہے تاریخ (۱۳۲۸ھ)
فارغ بگرام طبع بول استخفا ”دل ہر انتخاب“ ہے تاریخ (۱۳۲۹ھ)

یہ پہلی بار مطبعِ حسینی رام پور میں چھپا تھا۔ کل صفحات ۸۸، مسطر گیارہ مطبوعہ ہے۔
امیر نے کئی خطوں میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے لیکن مجھے باوصف تلاش یا اس نام کی کوئی کتاب
نہیں ملی۔ ہاں کتاب خاذِ رام پور میں امیر کا ایک غیر مطبوعہ لغت ضرور ہے، جس کا نام معیارِ الفاظ
ہے۔ یہ مخطوط مہدی علی خاں مرحوم اسحاق خویں دار کتب خاذِ رام پور کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔
جو امیر کے خاص شاگرد تھے۔ میرا خیال ہے کہ امیر نے آخر میں ”سرۃ البصیرت“ کے بجائے اس کا نام
معیارِ الفاظ رکھ دیا تھا۔ معیارِ الفاظ میں عربی، فارسی کے ایسے الفاظ کو جمع کیا گیا ہے جن کا تلفظ
دو لغت حرکات سے مختلف طور پر کیا جاتا ہے یا جن کو غلطی سے مثنیٰ سمجھا جاتا ہے۔

اس موضوع پر قاضی محمد صادق اختر نے ایک رسالہ لکھا تھا، جس کا نام لوا مع الشہر
ہے۔ کتاب خاذِ رام پور میں مخطوط موجود ہے۔ دونوں کا مقابلہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ امیر نے
بہت سے مقامات پر حوالے کے بغیر لوا مع الشہر کی عبارتوں کو نقل کر لیا ہے۔

(۲۸) یہ سلسلہ امیر اللغات، تعداد اشعار، سنگلاخ زمینیں :

”گفت کی خوب صورتی بڑھانے اور کسی قدر اختصار کی راہ میں نے یہ نکال
ہے کہ اب سرت دی مفردات اور مرکبات وغیرہ لکھے جائیں جو زبانوں پر
رات دن کی بول چال میں ہوں جن میں لفظ و مرکب کی تخصیص ہے، وہ چھوڑ دیے
جائیں۔

تم نے تو فرس، جام مشرب، اور قفس جام شرب میں دریا بہا دیا ہے۔
اب ذرا طبع رواں کو روکو۔ ہر زمین میں اشعار کی تعداد، غزل سے ڈیڑھ جہاں
چاہیے۔ ہر زمین کا ایک سیما دہا کرنا ہے، جہاں اس سے بڑھ جاتی ہے بدنامی
آجاتی ہے، اور یہ بھی یاد رکھو کہ سنگلاخ زمینوں میں لاکھ کوشش کی جاتی
مگر مزہ داد شعرا لیے نہیں ہوتے ہیں کہ سننے والے چٹارے بھر لگیں، اس
لیے میں چاہتا ہوں کہ تمہارا سامرہ طر شاعر اپنا وقت ایسی شور و لا حاصل

اسی موضوع پر جلال نے بھی ایک کتاب لکھی تھی، تنقیح اللغات، جو اس زمانے میں شوقی نمبر
وغیرہ کے اعتراضات کا بہت بڑی تھی شوقی نمبر نے اس سلسلے میں کئی رسالے لکھے تھے جن میں سے
ایک رسالہ ازاحۃ الافلاط واقفا قابل ذکر ہے۔ امیر کے کسی شاگرد نے بھی تنقیح اللغات کا رد
لکھا تھا جس کا مخطوط کتاب خانہ رام پور میں محفوظ ہے اس رسالے میں کہیں یہ صراحت نہیں ملتی
کہ اس کا مولف کون ہے۔ نمبر ست کتاب ناد میں مولف کے غائبے میں ہے کہ اگر شاگردان امیر لکھا ہوا
ہے جو بعض قرائن کی بناء پر صحیح معلوم ہوتا ہے۔

لے امیر نے ایک مقلدے میں بھی اس خیال کو ظاہر کیا ہے :

سیر کہنا تو غزل کچھ نہیں دشوار را تیر غونہم ہے کہ کل ملتے نہ ہمانے سے

(مستم غاد عشق ص ۳۸۲)

زمینوں میں زمین کرے۔ لوح دار زمین اختیار کر و تو دیکھو کیا مزہ آتا ہے۔
اب اس زمین کو بھی چھوڑ دو، اور ہمیشہ کے لیے ایسی زمینوں کو ترک کر دو۔
[ہمام لآباد، ۲۳ جون ۱۸۹۳ء]

لیکن اس کی پابندی نہیں کی، جن زمینوں میں چو غزلے چچ غزلے کہے ہیں، ان میں اشعار کی تعداد، قصیدے کی تعداد اشعار کی حریت ہو گئی ہے۔ مثلاً *مرآۃ الغیب* میں ایک غزل ہے روایت اور قوافی ہیں "عید کا" "وید کا"، اس زمین میں اسیر نیچا غزل کہا ہے، گل تعداد اشعار اکثر ہے۔ ایسی مثالیں ان کے یہاں خاصی تعداد میں مل سکتی ہیں۔

اسے قدما کے زمانے میں سنگلاخ زمینوں میں غزل کہنا لازماً استنادی ہو کر رو گیا تھا۔ خصوصاً وہ لوگ اس مرض میں بُری طرح مبتلا تھے جو شعر کہنے کے بھائے شعر ہٹانے کا فن اچھی طرح جانتے تھے، لیکن جعب اور الفکوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے زمانے کے بہت سے جدید تر شعرا بھی اس کج غزلی کے امانت دار ہیں اور لطیف یہ ہے کہ وہ اس کو جدت کی نمائش بلکہ اس کا اعلان نام کرتے ہیں۔ رسائل میں عجیب الغلت زمینیں دیکھتے ہیں آتی ہیں، جیسے اڑیل توئے چراغ کی اوٹ، بہار کے گھونٹ و حیرہ۔ اس رجعت و بقری کو کیا کہا جاتے جہاد کم نظری کے ان اسیروں کو یہ معلوم نہیں کہ یہ کاروبار اب سے بہت پہلے بہت بڑے ہیالے پر ہو چکا ہے اور اپنے مسوم اثرات کو ظاہر کر چکا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان غزلیوں کو رد روایت کے چسپاں ہونے کا اندازہ ہوتا ہے اور وہ اس کا لفظوں کو کن پہلوؤں سے بٹھایا جاتے۔ رجعتی بحثوں سے آشنا ہوتے ہیں، ذمہ داران الفاظ کے فرق سے اور ستم بالاکے ستم یہ کہ قدرت کلام سے تہی داماں ہوتے ہیں؛ نتیجے کے طور پر ایسی غزلیں، ہیروئل کے لطائف کا مجموعہ معلوم ہوتی ہیں، ایسے حضرات کے لیے اسیر کہہ رہے قابلِ توجہ ہے یہ اس شخص کی رائے ہے جس کو شوق زمینوں کو سرسبز کرنے کا فن آساخا اور قدرت کلام جس کے سامنے اسٹھ باندے کٹری راجتی تھی۔

(۲۹) ”تو“ کی تذکیر و تائینث :

”تو“ کی تذکیر و تائینث ہی کیا، مگر جس محل استعمال کی رو سے آپ پوچھتے ہیں اُس جگہ تو یہی کہیں گے کہ: ”اس نے مجھے تو کہا“ لیکن اس سے تذکیر و تائینث ”تو“ کی نہیں پیدا ہوتی، بل کہ اس جگہ لفظ ”لفظ“ معتد رہتا ہے، جیسے: اس نے مجھے عورت کہا تو کیجیے، عورت“ تو قطعی مؤنث ہے۔ و قس علیٰ ہذا۔“

[بیانامِ نآباد، ۹۰ دسمبر ۱۸۹۳ء]

(۳۰) تضمین :

”آگ لگی“ والی غزل پر مصرعے لگانے کے واسطے تم نے مجھ دل جلے کو تجویز کیا، یہ سبھی تمہاری طبیعت کی گرما گرمی کا ایک نتیجہ ہے۔ غزل کے گرم ہونے میں کوئی شبہ نہیں، مگر، نظر اپنے تھمرات کے میں جب ایسے بیٹھیں شعر دیکھتے ہوں تو میرا دل دھڑکتا ہے: ”وطن میں آگ لگی“ اور ”انجمن میں آگ لگی“ قس علیٰ ہذا، ایسے شعروں پر میں ہرگز مصرعے لگانے کی جرات نہیں کرتا، کوئی اور مختصر سی آچھی غزل میرے واسطے تجویز کر کے بھیجو تو تضمین کا ارادہ کروں۔ میں اب شاعر نہیں رہا۔ شاعری کے واسطے طبیعت میں امنگ شرط ہے، وہ جوانی کے ساتھ سدھاری بڑھتا ہے، میں جوش کہاں! کبھی کسی دوست کی فریاد سے مجبور ہو کر کچھ کہتا ہوں تو پڑے ہی جبر سے، پھر اس میں مزہ کہاں سے آئے! اور جب اپنا کلام آپ ہی پسند نہ آئے تو اوروں کو کہو مگر رجائے!

[بیانامِ نآباد، ۱۳ جون ۱۸۹۳ء]

اے نآباد کی اس غزل کا مطلع یہ تھا:

و نور سوز شہ دل سے بدن میں آگ لگی یہ آگ گھر کی جو بجھیلی، وطن میں آگ لگی

و مشاطہ سخن، ہفتہ اول، ص ۶۱

اکثر لغت نئے طے اور اکثر شعر بھی کام آتے۔ دریاے لطافت بھی دفتر میں ہے، مگر اُس کے دیکھنے کی نوبت کم آتی ہے رمل کہ نہیں آتی۔ اس کے ماورے جو تم نے انتخاب کیے، وہ مفید ہوئے۔ نظیر کے کلام نے ایک لفظ کا فائدہ نہیں دیا۔ ان کے ماوراء جو تم نے بعض بعض الفاظ کے نوٹ لکھے ہیں، اور متلوں کی شان بھی ہے، اُن کا ماخذ معلوم ہونا چاہیے کہ کہاں سے اور کس کتاب سے لیے گئے ہیں۔ امیر اللغات میں نووی لکھا ہوا ہے جو کسی صورت سے نامعتبر نہیں ہوتا۔ غالب ہے کہ تم نے اس کا خیال کر لیا ہوگا؟

[یہ نام تراہ۔ ۱۲ جون ۱۸۹۵ء]

(۳۵) بلعم با عور:

”تمہارے ایک شعر کے معنی نہیں سمجھا کہ: بلعم با عور کی طرح دوش دوسری پڑے“ کیا چیز ہے؟ یہ مضمون غالباً کسی قافیے سے متعلق ہوگا، جو مجھے معلوم نہیں؟

[یہ نام تراہ۔ ۳ مارچ ۱۸۹۶ء]

اے نظیر کے کلام میں ایسے لفظ بہت ہیں جو لغت میں نہیں ملتے۔ نظیر کی ایک خصوصیت یہ بھی کہ انھوں نے عام محلِ حال اور مقامی لولِ حال کے الفاظ بہ کثرت نظم کیے ہیں۔ امیر کلہ لکھا کہ نظیر کے کلام نے ایک لفظ کا فائدہ نہیں دیا، لغت نویسی کے محدود تصور کا ترجمان ہے۔ ایسے کسی لغت کو مکمل نہیں کہا جاسکتا جس میں نظیر وغیرہ کے کلام میں مستعمل الفاظ شامل نہ ہوں۔

دریاے لطافت کے متعلق جو کچھ امیر نے لکھا ہے، وہ بھی اسی قبیل سے ہے۔ یہ کتاب تو نہایت کارآمد ہے۔ اصل میں معیارِ پسندی کے محدود تصورات نے یہ سارے گل گھلاتے ہیں اور اُس زمانے میں حکومتِ اسی کی تھی۔ امیر بھی لغت نویس ہونے کے باوجود، اُس حصار کو توڑ نہیں پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لفظ آج لغات میں نظر نہیں آتے، جب کہ وہ تصنیفات میں موجود ہیں۔

”کر دے گی“ کی بات اول کا کرنا، ناپسند کر کے، اس کی جگہ کر گئی، مگر بناٹیک ہے۔ اب اپنے وجدانِ سلیم سے کام لیجیے اور اس مصرعے کو یوں ہی رکھیے جیسا میں نے بنایا ہے۔

”ہاٹ دیکھنا“ راہ دیکھنے کے معنی میں، نصراے دہلی و لکھنؤ کی زبان نہیں۔ تیسرا کا کہنا، اس وقت سند نہیں ہو سکتا، اس وقت بولتے ہوں گے، اب کوئی نہیں بولتا۔

مخزن المادرات چرخِ لال کا کیا اعتبار اس میں ہزاروں محاورے گنواروں کے لکھے ہیں؛ من جملہ اُن کے ایک سہر بھی ہے یہ جو کثرت ”ہاٹ دیکھنا“ کسی طرح صحیح نہیں۔ میں بھی آپ سے شفق ہوں۔

تیسرا حقت لغت کا مدت سے تیار ہے۔ بے سرمایگی اُس کی طبع سے مانع ہے۔ دفتر، اشتراور پریشان ہوا چاہتا ہے بل کر ہو گیا۔ کام بند ہو گیا ہے۔ بڑا افسوس ہو گا اگر یہ کتاب ناتمام رہ گئی۔ اور یہ افسوس صرف مجھ کو ہی رہے گا بل کہ تمام ملک کو؟

[برنامہ ناآہدہ ۱۹ ستمبر ۱۸۹۵ء]

(۲۳) پر سلسلہ امیر اللغات :

”لغت کا تیسرا حقت تمام ہوا اور نظر ثانی بھی ہو گئی۔ اب کچھ یوں ہی سلام اُٹھیں باقی رہا ہے۔ میں نے آپ کے اجزا اب نکالے اور دیکھے؛ اُن میں

سہ مجموعہ مکاتیب میں ”کر گئی تیکے بجائے“ کرے گی ہے، لیکن یہ درست نہیں ہو سکتا تاہم کا شعر ہے، جگر کو گرمی بنت غیب نے پھونک دیا، حلال کر دے گی تاہم کو یہ حرام کی بوند، امیر نے دوسرا مصرعہ یوں بنایا، حلال کر گئی تاہم کو یہ حرام کی بوند (مطالعہ سخن)

(۳۱) یہ سلسلہ امیر اللغات :

”اشعار سند میں زد دیے جاتیں، اس کو تو میں خود بھی پسند نہیں کرتا، چاہے کوئی کتنی ہی مخالفت کرے۔ اور مجھ یا وہ بھی نہیں آتا کہ کسی نے مخالفت کی ہے۔ ہاں حصہ اول میں جس کثرت سے شعر دیے گئے تھے، تو وہ ضرورت سے زیادہ نظر آتے تھے، اسی لیے کئی ضرور ملحوظ ہے۔ اور یہ بات بھی ہے کہ فقرہ جس قدر محل استعمال کو ٹھیک ٹھیک بتاتا ہے، شعر سے آفتاد ملح نہیں ہوتا، اس لیے شعر کم کر کے، فقرہ خوب صورت بن پڑتا ہے، تو وہی درج کیا جاتا ہے۔“

[برنامہ آزاد، ۱۰، فروری ۱۸۹۳ء]

(۳۲) ابر کی بوند :

”بہن کی بوند، اس کے پانی کی بوند، ہم سب درست ہے، مگر ابر کی بوند مستعمل نہیں۔“

[برنامہ آزاد، ۱۰، ستمبر ۱۸۹۳ء]

(۳۳) ابر کی بوند - ہاٹ دیکھو - خزن الحادرات - امیر اللغات کا تیسرا حصہ :

”ابر کی بوند بے شک شعرانے [اور شاہ فقیر اور واضح] نے کہا ہے، اس سے یہ غلط نہیں کہا جاسکتا، لیکن اپنی اپنی پسند ہے۔ زیادہ تر مستعمل دھونے سے میری طبیعت اس کو پسند نہیں کرتی۔ اگر آپ اپنے کلام میں لکھنا چاہتے ہیں تو چنداں مضائقہ بھی نہیں۔“

لے تو میں کی مہارت مجوزہ مکاتیب میں موجود نہیں۔ مثلاً سخن میں ہر ذیل اصلاحات امیر اس خط کا اقتباس مندرج ہے : ”اس میں یہ لکھا موجود ہے۔ آزاد کا شعر یہ تھا :
”آہاے سرد، کچھ سوزِ دلِ غروب چلے پڑے اگر کوئی ابوسیدہ نام کی بوند“
لے مجوزہ مکاتیب میں زانوں سے ہے۔ میں نے یہ جملہ متلاسنہ سخن کے مطابق لکھا ہے۔“

(۳۶)۔ بلعم با عور :

”بلعم با عور کا جو حال تم نے دکھا ہے، میں نے دیکھا۔ اب وہ شعر بے تکلف رکھنے کے قابل ہے۔“

[بہ نام نآہد۔ ۱۹ اپریل ۱۸۹۶ء]

(۳۷) زکریا :

”زکریا، یہ فحشیں و کسیرا و تشدید آہے۔ اس میں کوئی تغیر اب تک نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔ جو لوگ ”زکریا“ ذال سے بالکسر لکھتے ہیں، اور سکون ثانی و تنقیف یا کے ساتھ لکھتے ہیں، محض غلط ہے، خواہ دہلی والے ہوں خواہ لکھنؤ والے۔“

[بہ نام نآہد۔ ۲۶ ستمبر ۱۸۹۶ء]

(۳۸) زکریا :

”میں لکھ چکا ہوں اور پھر لکھتا ہوں کہ ”زکریا“ ز سے ہے۔ ذال سے کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا، اور اس کے اعراب میں بھی تغیر ممکن نہیں ہے۔“

[بہ نام نآہد۔ ۳۰ ستمبر ۱۸۹۶ء]

اسے مشاطہ سخن میں اس جملے کے بعد یہ عبارت لکھی ہے: ”بنی اسرائیل کا ایک بڑا عالم و ماہر متاد و جڑ چلے اور اکثر تہذیب و عبادت سے ایسا خوف ہو گیا تھا کہ کاغذ اس کو ٹوٹنے میں بائند کر دوش دہرے لیے پھرا کرتے تھے۔ افسانے بھی اپنے منقطعوں کہتا ہے :

حاسد تو ہے کیا چیز کرے قصد و احتیاط تو توڑ دے جھٹ بلعم با عور کی گردن“

میرزا خیال ہے کہ یہاں بہر نآہد کے غلط و راتیر کے غلط کی عبارت غلط لکھ گئی ہے۔ نآہد نے اصلاح اتیر کے ذیل میں اپنے غلط کی اس عبارت کو لکھی ہوگا، جو اتیر کی عبارت کے ساتھ آمیز ہو گئی۔

اسے یہ نام ہے ایک معروف پیغمبر کا، اور اس نام کے طور پر اس کی حکمت ناقابل تغیر ہیں، مگر یہ غلطاب آگے لکھا ہے۔

(۲۹) سقوط الف - نشہ - قرار - اعلان لون :

”الفاظ ہندی میں سے آخر کاحرن گرتا ہے، پہلے کاحرن نہیں گرتا ۱۵ ظہنا سہاں کی تصحیح کر دی گئی۔“ نشہ میں آتی ہے پہلے ہمزہ مفروہ لیا جاسیے ۔

”قرار بمعنی اقرار عربی و فارسی میں نہیں ملتا۔ بغیر واو علت ”قول قرار“ کو جس طرح آپ نے اُردو کر لیا ہے، اُس کا مضائقہ نہیں۔

عام لوگوں کے نام کے طور پر بھی استعمال میں آتا ہے، جیسے : رفیق زکریا بن کر نکلتے ہیں تو ”زکریا اسٹریٹ“ ایک علاقے کا نام ہے۔ ایسے عام ناموں کے طور پر اس لفظ کے اعراب میں تغیر ہو چکا ہے اور اس کو ہفتہ اول و دوم، ہسکوی سوم و چارے مختلف مفتوحہ لگتے ہیں یعنی، زکریا بن اعراب کو بھی اب تسلیم کر لینا چاہیے۔

اے یہ خیال کر اُردو میں ”نشہ“ میں آتے سے پہلے ہمزہ مفروہ لازماً ہونا چاہیے مگر نہیں۔ اُردو میں یہ لفظ ہفتہ سہلین یعنی ”نشہ“ یا ”نشہ“ بھی مستعمل ہے اور یہ اُردو کا تعمرن ہے۔ چند استناد پیش کی جاتی ہیں، اشبات مقدما کے لیے کافی ہیں :

ہشباری کے برابر کوئی نشانہ نہیں ہے (تیسرا کلیات مرتبہ آتھی، ص ۲۶۰) یارو بھ معان رکھو میں لٹے میں ہوں (ایضاً ص ۲۶۶) اس غزل کی ردیف ہے ”میں لٹے میں ہوں“۔ گھٹا نشہ میں جو بھڑکی کا سبب اُس کی تیسرا ایضاً ص ۴۵، نشہ اور کچھ دل کو بھایا ہے شاید (میر حسن)، لے نشہ میں جو تجھے یوں قدیم بگ اُڑے (انشاء کلام انشا، ص ۳۲۳) غور میں نشہ میں جہاں گر پڑے، پڑے (ایضاً ص ۲۱۷) یاں دو لٹے نہیں جنھیں ترشی اُٹاروے (ذوق، دیوان مرتبہ آزاد، ص ۲۲۳) رات سے غلے میں ساقی جو لٹے میں، بہکا (ایضاً ص ۱۰۱) کیوں لٹے میں توڑتے ہو رکھ کے ساغر فخر یا (ایضاً ص ۸۸) نشہ میں بھڑکے ہے جو روئی (عالتی، سنڈس، بیان کہنی، ص ۶۲) نشہ میں سے من کے سرشار سارے (ایضاً ص ۲۳) لٹے میں سے عشق کے چور ہیں (ایضاً ص ۵۰) لٹے رہتے سب

اضافات کی حالت میں اطلاق کوٹ جائز نہیں۔

آمارے تمہارے (زندگسنوی، دیوان، نول کشور، پس، ص ۱۳۹)

یہاں ہر ایک بات قابل غور ہے، آتیر کا شعر ہے:

ڈورے نلے کے دفتر دے در پردہ ہیں رشتہ دل لگی کا

(مضم خاؤ عشق ص ۵۸)

ہ قول آتیر اس میں منٹھے لکھا جائے گا یعنی سے سے پہلے ہمزہ آئے گا، پڑھنے میں بھی اور

گھنے میں بھی یہ تو سبک ہے، مگر آتیر کے اس شعر میں:

”ہم کیا کرے کہے میں ترے جاچشم سے جو شیشہ ستا وہ نلے دہستی سے چورخا“

(مضم خاؤ عشق، ص ۱۳۹)

”نلے“ کو کسی طرح لکھا جائے گا؟ اس میں ہ قول آتیر ایک ہمزہ توجہ لفظ ہے، اور ایک ہمزہ

اضافات کی علامت کے طور پر آئے گا، یعنی اصولاً اس کو نشہ لکھنا چاہیے اور یہ مسلمات میں سے

ہے کہ اس لفظ کا یہ اسلا آج تک نہیں دیکھا گیا۔ اس کی جگہ ”نلے“ ہی لکھا جاتا ہے، اور اس کا

واضح طور پر مطلب یہ ہوا کہ اس صورت میں نل کو مشدّد پڑھنا پڑے گا، یعنی ”نلے دہستی سے چور

مختا“ اس کے سوا اور کوئی صورت نظر نہیں آتی اور اس صورت میں یہ کہنا کہ ”نلے“ میں سے پہلے

”ہمزہ مفرودہ ضروری ہے، لازماً صحیح نہیں ہو سکتا۔

ارباب لغت اس لفظ میں شقی نہیں، مختلف اقوال لیتے ہیں۔ اردو میں نول کی جال کی حد تک

یہ لفظ صرحت پہنچ ششیں متعل ہے اور نظم میں پہنچ ششیں وہ سکون ششیں، دونوں طرح آتا ہے تقری

بیش تر ”نلے“ دیکھا جاتا ہے۔ اردو کی حد تک مناسبہ ہوگا کہ اس کا اطلاق ”نلے“ مانا جائے۔

یہ ہر دو زنی کتل بھی آئے گا، اور ”نلے“ ہر دو زنی فعلن بھی آسکتا ہے، جب یہ ہر دو زنی فعلن آئے،

اس صورت میں اس کو یہ نشہ دیکھا جاتا چاہیے، یعنی نلے، جو شیشہ ستا وہ نلے دہستی سے چورخا۔

لہذا اس موضوع پر ایک مستقل مضمون میں بحث کی گئی ہے، جو ضامی کتاب ہے، اُسے دیکھا جائے۔

یہ شعر مجھ کو جی سے پسند آیا۔ بارک اللہ! خوب کہا ہے:
 وہ آنکھوں میں ہے پتیلیوں کی طرح مگر دیکھنے کو نکلے چاہیے
 [پرانام تراہ۔ ۳۰ جولائی ۱۸۹۷ء]

دیا۔ ہا ہمدگر۔ پر۔ پر سے پیار:
 "دیا صاحب بالکل متروک ہے، اس کی جگہ صرف "یا" بولتے ہیں (یا کان ہے
 کام لیجیے، جو "یا" کے معنی میں آتا ہے)۔
 "ہا ہمدگر کی صفت میں کلام ہے۔" ایک دگر ہو سکتا ہے، یا محض "ہمدگر" ہے

لے ناسخ اور ان کے شاعر و تزییر کے یہاں یہ لفظ موجود ہے:

بعد مدت سو گیا ہوں ہمیں سے یہ جنازہ ہے دیا گھسوارہ ہے

ناسخ (کلیات طبع اول، ص ۲۳۱)

جب زتب کہتے ہو، صاحب میر کر بندہ عاشق ہے، دیا خوب ہے

(۲۵۱ ص ۱۰)

جب زتب منہ دیکھ دیتا ہے وہ قائل کچھ کر یہ ٹکاری ہے دیا اس کی کمر میں آند

(۲۲۲ ص ۱۰)

ذآؤ، خوش رہو، جس جاں ہو مرے صاف ملو دیا دملو، ہم نباہ کرتے ہیں

و تزییر (دفتر فصاحت، ص ۱۲۳)

مناخرین نے اس کو متروک قرار دیا ہے۔

لے امیر کدہ ہا سے گئے نہیں: ہا ہمدگر کی صفت میں مطلق کلام نہیں کیا جاسکتا۔ فارسی میں یہ لفظ موجود
 ہے، وہیں سے یہ لفظ ہمارے یہاں آیا ہے۔ سلیمان مجیم کے لغت میں یہ لفظ موجود ہے (دلیلیات)
 ص ۱۲۱)۔ غالب نے قاطعہ برہان میں کئی جگہ اس کو استعمال کیا ہے، مثلاً "لفظ" برہان" کے

لکھے۔

”پرہیز معنی لکھن دنگر، واجب الزکر ہے، البجاسہ پر جو ہم کو معلوم ہے کہ کلام

تحت انہوں نے لکھا ہے: ”و تبدیل بشین نقط داروشین ہمد باہمدگر، اصلے است حکم در ضماہط
زبان ایران: لفظ ”ہمد“ کے قول میں لکھا ہے: ”ذباہش شش معنی سافق و نہ باہمدگر متحد و موافق؟
موافق آصف اللغات نے ”باہم نکو“ باہم و گرہ کا معنی لکھا ہے (جلد نہم)۔ اساتذہ اُردو
نے بھی اس کو استعمال کیا ہے، مثلاً:

باہمدگر رکھے ہے میاں عالم اختلاط (قائم چاند پوری۔ دیوان قائم، عکس نسو مٹیا آنس
لندن، دیوان کر باہمدگر ایام قائم) ہوئی ہے (روح قیس و کوہ کن باہمدگر اک جا دانش۔
کلام اللہ، ص ۳۷) اسٹھ جاتے چاہیے سب باہمدگر کلفت (ایضاً ص ۱۱) خود پرستی سے رہے
باہمدگر نا آشتا و غالب، دیوان غالب، نسو، عرش، ص ۱۹) باہمدگر ہوئے ہیں دل و دید ہر رقب
و (ایضاً ص ۲۲) اگر اختلاف ان میں باہمدگر سخا و ماک۔ مدرس، تاج کبھی، ص ۲۳) باہمدگر ہیں
خشتِ بنیاد (مثنوی لکھنوی، مثنوی تنظیم الحیات، حصہ چہد)۔

سہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عبارت میں بعض لفظ چھوٹ گئے ہیں۔ اخیر کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ
”پرہیز“ معنی لکھن دنگر، مستعمل ہے، مگر اس کا معنی ”پرہیز واجب الزکر ہے“ پرہیز معنی لکھن دنگر
کے معنی ”پرہیز“ سے کہ اساتذہ لکھنوی نے بالاتفاق متروک قرار دیا ہے، البتہ ”پرہیز“ (ہمعنی لکھن دنگر) کے ترک
میں اختلاف ہے۔ جلال نے اپنے تیسرے دیوان مضمون ہے دل کشی میں جہاں اپنے شروحات کی
فہرست درج کی ہے اس لفظ کو بھی بذیل شروحات لکھا ہے۔ شوقی بیوی نے رسالہ اصطلاح میں
اور موافق نور اللغات نے لکھا ہے کہ بعض فقہاء نے ترک کر دیا ہے۔ آخر لکھنوی مرحوم نے صاحب
نور اللغات کے اس قول پر تصریح کرتے ہوئے لکھا تھا،

”لیکن میں وہ بات کہاں جو بعض موقع پر لفظ ”پرہیز“ سے پیدا ہوتی ہے، مثلاً:
(باقی لکے صفحہ پر)

ذہریہ دہوا تیر کا انداز نصیب ذوقِ یاروں نے بہت دردِ غل میں لدا

(لہرینگ، آخر، ص ۸۸)

شرقِ نبوی نے وضاحت کی ہے: "فی الواقع پڑہ معنی لیکن، بہ کثرت استعمال شدہ استادِ جناب شمس الدہلوی، جن کو مترذ کا بہت خیال ہے، ان کے دیوانِ اول میں، جس کا نام خزادہ خیال ہے، یہ لفظ موجود ہے۔ اور مولف بھی پہلے اس لفظ کا تارک دستا، مگر رسالہ اصلاح کی وجہ سے جب بہت سے لوگ احتیاط کرنے لگے، حتیٰ کہ کچھ دنوں سے جناب شمس کو بھی احتیاط لگتی ہے، تو مولف نے بھی وجوہاً ترک کر دیا ہے؟ (حاشیہ رسالہ اصلاح، ص ۱۲)

مولف اصلاحِ زبانِ اردو نے لکھا ہے: "لیکن کے معنوں میں ہر دو کا استعمال اب نقصانے ترک کر دیا ہے۔ آخر میں ہلکے درجہ نے بھی ترک کر دیا تھا۔ اس پر ضرور کرتے ہوئے آئیر میٹائی کے شاگرد حکیم تمام نے لکھا: ہر دو کا استعمال لیکن کے معنی پر بہ کثرت ہے۔ اگر کچھ لوگ نہیں کہتے تو اس سے مترذ نہیں ہو سکتا۔ آئیر نے آخر تک اس کو جائز رکھا ہے، اور دیگر شعرا بھی استعمال کرتے ہیں" (مرتب ادب، جلد دوم ص ۶۱) تمام نے ٹھیک لکھا ہے کہ آئیر نے آخر تک اس کو جائز رکھا تھا۔ صنم حادہ حسن سے صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے:

بے تکلفِ نظر سے تو اُن کو کو دیا ہر وہ ضرور سیل لگا ہوں کا مڑا جانا دیا

غور شید لکھنوی نے اپنے رسالے افادات میں لکھا ہے:

"اب اُن الفاظ کا ذکر کرتا ہوں جنہیں بعض اساتذہ ترک کر چکے ہیں... مگر چونکہ مجھے یقین ہے کہ ان کے ترک میں ضرور وقت بڑے گی اور مزہ کلام میں باقی درجہ لگا، لہذا میں نے ترک نہیں کیے ہیں، اور ذرا اپنے تلامذہ و اصحاب کو اصلاح ان کے ترک کی دیتا ہوں، کیوں کہ میں تجر بہ کر چکا ہوں کہ بعض اشعار سے جو ان لفظوں کو نکال کے اوڑھل کے دیکھا، تو وہ مزہ چھوٹتا تھا، باقی ذرا ص ۱۳۲۔

اور اس فعل میں انہوں نے ہڈا بہ معنی لیکن کو بھی لکھا ہے۔ — مختصر یہ کہ پڑہ معنی لیکن

پہرے ”لکھنؤ میں بالکل متروک تھے اور وہی میں بھی اب فصاحت کے کلام میں

کو محض بعض نے ترک کر دیا، مگر پیش کرنے اس کو استعمال کیا ہے، تاہم یہ بھی یہی رائے تھی اور اُن کے کلام میں اس کی مثالیں بالعموم ملتی ہیں۔

لکھنؤ کے اساتذہ متاخرین میں سے بعض نے ”پہرے کے مختلف“ ”پہرے کو، خواہ وہ کسی معنی میں ہوں متروک قرار دیا تھا اور اس کی وجہ یہ بتائی تھی کہ: ہندی میں کوئی لفظ جس کے آخر میں ہائے منتفی ہوں نہیں پایا جاتا، اس واسطے کہ ہندی میں ہائے منتفی نہیں آتی۔ پس معلوم ہوا کہ اس لفظ کی کچھ اصل نہیں۔“ پہرے کے مقام پر، زبانوں پر غلط مشتمل ہو گیا ہے، ”دستور الفصاحت“۔ جلال نے اس کو اپنے تیسرے دیوان میں شامل فہرست متروکات میں داخل کیا ہے، اگرچہ وہ اس کو استعمال کر چکے تھے۔

دل کس کو دیا، لاکھ پوچھا کیے احباب دل ہی میں رہا، لب پہ تھام دایا
صغیر گلگراہی نے ”پہرے“ کے ذیل میں لکھا ہے: ”اردو میں یہ حرف مختلف معنی آتا ہے یعنی دینا،
راے مہذا کر، بے فرد رست وزن۔ لکھنؤ میں تاج محل نے توجا نرکھا، مگر رنگ نے اس شخصیت
کو تاجا نر قرار دیا اور اپنے کلام سے اس شخصیت کو شخصیت کر دیا، لیکن خواجہ وزیر، اور دیگر،
تحریر وغیرہ شاگردانِ تاج محل نے تاج محل کی تقلید کی“ در شحات صغیر، ص ۶۱

اس بے معنی التزام کو ان شاگردانِ تاج محل کی طرح، دوسرے بہت سے اساتذہ نے بھی تسلیم
نہیں کیا تھا۔ مولف اصطلاح زبانِ اردو نے لکھا تھا: ”پہرے کا استعمال اب اکثر فصاحت کے ترک
کر دیا ہے۔ آخر میں وراثہ و جلال نے ترک کر دیا تھا، حکیم برہم نے اس پر تصریح کرتے ہوئے
لکھا تھا: کسی نے ترک نہیں کیا اور ذکوۃ شاعری اس سے خالی ہو سکتی ہے۔ فاتحہ کے آخری
دیوان میں صد ہا جگہ بندھا ہوا ہے“ ”در شحات ادب“، دوم، ص ۶۰۔ اصل میں اس
طرح کے التزامات، محض مصنوعی حیثیت رکھتے تھے اور ان کو قبولِ عام حاصل بھی نہیں
سکتا تھا۔

میرے بچے دوست، عبادت مجھ سے پوچھتے ہیں، اپنی رائے ناقص کے موافق ہیں
کو بتا دیتا ہوں۔ اسی مشرب کی بنا پر میں تاریخی بحث مزید سے بحث نہیں
کرتا اور آپ کو بھی نصیحت کرتا ہوں کہ بے فائدہ دردِ سر نہ مول لیا کیجیے۔

جب خصوصیتِ مباحثہ متعلقہ تاریخ سے قطع نظر کی گئی، تو اس بات کی بات
یہ رہی کہ مشتری ستارہ، مذکور ہے یا سوٹھ؟ واضح ہو کر یہ ستارہ، سوٹھ ہے۔
اور جہاں کہیں حنی دانوں اور حنی وروں نے استعمال پر تذکرہ کیا ہے، وہاں
ستارہ مقصود نہیں ہے، جس کو مشتری سے تشبیہ دی ہے۔ جیسے تاریخ کے
اس مطلع پر :

بل ہوں بوستانِ جنابِ امیر کا روح القدس ہے نام مرے ہم صغیر کا
اُن کے شاگرد رشید مرزا محمد رضا برقی نے جو مصرعے لگائے ہیں، اس میں تری
کو جس کا تائید میں کسی کو اختلاف نہیں، بذکر استعمال کیا ہے، تو بات یہی ہے
کہ وہاں تری طائر مقصود نہیں ہے۔ وہ تفسیر میں ہے ۱

۱۔ عبارت میں بعض لفظ چھوٹے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ آخر کی مراد یہ ہے کہ جہاں مذکور لفظ استعمال
ہوا ہے، وہاں اس سے دراصل وہ دھوم مقصود ہے جس کو مشتری سے تشبیہ دی گئی ہے مذکور
ستارہ مشتری۔

۲۔ کلیاتِ تاریخ مطبوع مولائی ص ۲۔

۳۔ فتح الدولہ، بخشش الملک، مرزا محمد رضا خاں برقی، تہذیبِ تاریخ (مذکورہ بالا)، واجد علی شاہ کے
مصاحب اور استاد تھے۔ متوفی ۱۲۷۳ھ کلیاتِ تفسیر۔ ابن کادریہ ابن کی زندگی میں، حکم
واجد علی شاہ اور تصحیح امیر علی خاں بلال (تہذیبِ برقی)، مطبوع سلطانی کشتویں ۱۲۶۹ھ میں
چھپا تھا۔

۴۔ بلال اس سے بہت پہلے اس طرٹ تو تہ ہندول کراچے تھے۔ انھوں نے منہا نظر میں

(۳۲) ذیل :

”ذیل کی صحت میں اس لیے کلام ہے کہ کہیں فارسی میں پایا نہیں ہوا“

[پہ نام نماد - ۶، دسمبر ۱۸۹۹ء]

(۳۳) ذیل :

”ذیل کا فارسی میں ہونا آپ کی اس تحریر سے معلوم ہوا۔ آپ نے جہی لغات کا،

یعنی ہفت کلزم و تکتہ ربانی قاطع کا حوالہ دیا ہے، میں بھی اُن میں انشاء اللہ

دیکھوں گا ؟

[پہ نام نماد - ۷، دسمبر ۱۸۹۹ء]

(۳۴) بحث اور استغناء مشتری کی تذکیر و تائید :

”استغنیٰ سے متعلق میں بچ کے طور پر آپ کو اپنا مشرب لکھتا ہوں کہ میں بہت

سہام طاعت ہونے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اور تمام عمر تحریر ہوا کہ اول تو

مناظرہ جو احتیاجی حق سے عبارت ہے، ہوتا ہی نہیں۔ اور بالفرض ابتداء میں

کہیں ہوتا بھی ہے، تو انجام کار مکابرے اور مجاہدے کی طرف کھینچ جاتا ہے

لہذا میں بھی ان جھگڑوں میں نہیں پڑتا اور کسی استغنیٰ پر فتوا نہیں دیتا۔ اللہ

سے ”بضم اول و سکون فون و فتح موحدة تختانی و لام زور، معروف است۔ و آنرا در تازی و دل“

گویند، بضم دال ابجد و تشدید بیسم۔ و فتح دال ابجد و سکون فون، مزارعے است کہ آنرا

در ہندی سر مندل گویند“ (ہفت کلزم، نول کشوری ڈیٹشن ص ۱۳۵)۔

”ذیل بہ فتح اول و دال ابجد و اولیٰ اندر است کہ بہ ہندوستان مندل گویند۔ و در فرنگی بہ معنی

ظہار و ششتر اند و بضم اول، و رے کہ در اعضا بہم رسد، و بزبان عربی دل گویند، و تحت

برہان قاطع، نول کشوری ڈیٹشن ص ۸۳ء]

سلمان مجرم کے لغت میں یہ لفظ موجود ہے، اور نور و آصفیہ میں بھی ہے۔

پایا نہیں جاتا ہے۔ آپ چاہیے، لکھیے۔

”پیارے ہر روزنِ فارغ ہے؟“ (جہانم ترابہ، اراگت، ۱۸۹۷ء)

سے ریاض خیر آبادی نے بھی ایک خط میں بھی خیال ظاہر کیا ہے: ”میں پرے کے لفظ کو ترک کر
 رکھتا ہوں۔ داغ و آئینہ و جلال نے بھی استعمال نہیں کیا، اذان کے متبعین نے، عام بول
 چال میں بھی نہیں، بعض دلی والے شاید بولتے ہیں؟“ (مکتوب ریاض، نقوشِ مکاتیب نمبر ۳۹ ص ۷۷)
 دلی میں یہ لفظ ہر زمانے میں مستعمل رہا ہے۔ مولف فرہنگِ آصفیہ نے اس لفظ کے
 مترادف غیر فصیح ہونے کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ ”پرے بٹھا“ کے ذیل میں انھوں نے یہ
 فقرہ طورِ مثال لکھا ہے: ”ایسا پکایا کوہِ پورے بٹھا دیا؟“ اس مثال فقرے سے بخوبی
 اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مولف کے زمانے میں بھی یہ لفظ رائج تھا، اس کے بعد کی کتابوں میں
 کلمہ لفظ موجود ہے، مثلاً: ”مالِ لُغ لڑے بھی اگلے زمانے کے بڑے کلاموں کو پرے بٹھاتے
 ہیں“ (ترجمہ دریائے لطافت، ص ۳۷۸)۔ عام بول چال میں کلمہ لفظ آتا رہتا ہے۔ نوب
 عزیز جنگ و کلاؤں کے متعلق لکھا ہے: ”مولف عرض کرتا ہے کہ اس
 سخن کے کلام میں اس کا استعمال ہے اور چار اذوق اس کے استعمال کو پسند اور فصیح
 خیال کرتا ہے“ (معیار فصاحت، ص ۳۳)۔ حقیقت یہ ہے کہ ”سدا“ اور
 ”سمیت“ جیسے بہت سے الفاظ کی طرح یہ لفظ بھی غیر ضروری طور پر فہرستِ مترادفات میں
 شامل ہو گیا، اور اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اصلاحِ زبان کا یہ سودا کس قدر بے معنی
 تھا۔ اہل لفظ و شک کے یہاں موجود ہے: تو عرض سے پرے ہے، مگر پیش چشم ہے
 (مجموعہ دواؤں و رنگ، ص ۲۶۸)

۷۔ قدامت و متوطنین نے ”پیارا“ کو ہر روزنِ فعلوں میں بھی نظم کیا ہے، مثلاً:

کہ ایسے لوگ دیارے عزیزِ مہاں ہیں (تیرہ نکات مرتبہ آتشی، ص ۳۰۴) تیرہ کی ایک

ہر داند ہوں ازل سے سراخ شیر کا قری ہوں سرو باغِ مٹی کبیر کا
میں ندر کج ہوں چمن بے نظیر کا بیل ہوں بوستانِ جنابِ امیر کا
جہاں تار کج میں زہرہ کے ساتھ مشتری کا لفظ آئے گا وہاں مشتری سے
دور لھا ہی مقصود ہوگا، جیسے قری سے، برقی کے شعریں، عاشق یا خود معقولہ
مصنف مراد ہے۔ اگر تتبع کلام اساتذہ سے آپ کوئی سند مشتری کو کب
کی تذکیر کی پائے تو مجھے بھی لکھیے۔

[برہم ناتھ، ۳۳ مارچ ۱۸۹۹ء]

لفظ "بیل" کے زل میں لکھا ہے :

"بعضے صنوبر اساتذہ تذکیر بیل کی، اس شعر سے واضح مرحوم کے کرتے ہیں کا بیل
ہوں بوستان الخ۔ حالانکہ اتنا نہیں سمجھ کر یہاں سے تذکیر بیل کی مستفاد ہوتی
ہے یا قافیہ شعر کی؟ اور بالفرض والتسلیم، اگر شعیرہ کو رد سے تذکیر بیل ہی کی مستفاد
ہوتی ہے تو اس مصرعہ برقی مرحوم سے کا قری ہوں سرو باغِ مٹی کبیر کا،
استفادہ تذکیر قری کا بھی ہو سکتا ہے، حالانکہ قری کو کسی نے آج تک تذکر نہیں
کہا ہے۔ مثلاً تثنیٰ"

یہ عرض کر دوں کہ جلال کلید رسالہ پہلی بار ۱۲۹۳ھ میں چھپا تھا، مقدمہ طبع چہارم یعنی اخیر
کے اس خط سے پہنچے برسرِ پہلو۔

خواجہ وزیر کا بھی ایک شعری نوحیت کا ہے :

اُس مردِ محوش غرام کا قری ہوں لے وزیر چلتے تھے جس کے ساتھ شجرِ بے لنگ سے
(ذکر فصاحت ص ۱۹۵)

۴۰۱۔ دیوان برقی، ص ۳۶۳۔
۴۰۲۔ فرہنگِ آصفیہ میں مشتری (۱) معنی ستارہ، کو مذکر لکھا گیا ہے۔ اور نور اللفات و

معین الشعراء میں، تذکرہ کی سند میں، منیر کا یہ شعر درج کیا گیا ہے :

ہوا ہے مشتہر غیوس گویا برجِ عقرب میں

نظر آتے ہیں اہل علم و فضل اس سالِ زندانی

کلماتِ منیر میں یہ شعر اس طرح ہے (ص ۹)، اگرچہ ایسے اشعار سے تذکرہ یا تائید حتماً ثابت نہیں کی جاسکتی، کیوں کہ غلط نویسی کا تب کا احتمال باقی رہتا ہے؛ مگر یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ مختلف فیہ رہا ہے۔ اس سلسلے میں تصغیر بگراہی کی عبارت سے مزید وضاحت ہوگی۔ نقل عبارت سے پہلے یہ لکھنا ضروری ہے کہ جلال نے ”مشتہر“ کی تائید کی سند میں مفید اشعار میں نا آج کے یہ دو شعر لکھے تھے :

نقدِ جاں لاتی ہے آئے مول نورائیں او سے منیری دکھا ہے نام اپنے لیے برجِ عیس کا

تیسرا غلام کچھ مہ کنساں فقط نہیں کہتی ہے منیری بھی بین تیری خرید و ہوں
صغیر نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا :

”موقوف کہتا ہے کہ کارِ آمو شعرا کی این مثالوں سے، موقوف ہونا کچھ ضرور نہیں کہ ثابت ہو، کیوں کہ کتابت کی غلطی بھی ہو سکتی ہے یعنی ”نقدِ جاں لایا ہے“ اور ”کہتا ہے“ ”مشتہر“ بھی کہہ سکتے ہیں، چنانچہ اکثر الفاظ میں صاحبِ کار نامہ ”مشتہر“ کو بھی شک ہو گیا ہے اور کتابت کی غلطی پر محمول کیا ہے۔ بے شک ایسی مثالوں سے تسکین نہیں ہو سکتی، مگر میں نے ”مشتہر“ کے لفظ کو مذکور کتابت میں لکھا ہے اور اس کی مثال کسی استاد کے کلام میں پائی تھی۔ انفسِ اصل مسودہ ایسا گم ہو گیا کہ اب نہیں ملتا اور ذاب اتنی مہلت اور فرصت ہے جو پھر دیوان وغیرہ دیکھ کر مثال نکالوں مجھے اس لفظ پر تذکرہ کرنے کا بھی یقین ہے، اس لیے اصلی یا سہ معروض کے قاعدے میں، میں نے

(۳۵) ساکھا، بھاشا،

”ماتۃ تارکخ میں لفظ ”ایجاب“ معض، اور بجائے ”قرآن“ لفظ ”وصل“ لا
اور اس سے معنی ایجاب و قبول، اور قرآن واجتماع مراد لینا بہت ہی محنت
ہے اس باب میں مجھے بھی آپ کی رائے سے اتفاق کی ہے۔
لفظ ”ساکھا“ کی اصل ”ساکھا“ بمعنی جنگ و جدل ہے۔ تیسری مرحوم کے شعر میں
بھی یہی معنی ہیں۔ قدما کے سوا متروستطین و متاقرین کے کلام میں یہ لفظ دیکھا
نہیں گیا۔

”بھاکا“ اصل میں ”بھاشا“ ہے۔ ہندی میں ”شاکا“ اور ”کھا“ کا یہ لفظ ہوتا ہے۔
اردو میں فصحا کی زبان پر پیش ”شاکا“ اور کم تر ”بھاشا“ مستعمل ہے؟
[یہ نام قراب، ۳۱ اپریل ۱۹۹۹ء]

(۳۶) یاں، واں،

”یاں اور واں، یا بھان اور وہاں، بروڑن، فارا، فصماے لکھو“

”بھتری“ کو داخل کر دیا ہے۔ مقلد کو اختیار ہے، مذکر باندھے یا موٹ؟ (در شحاتہ صغیر،
طبع احمدی پبلیشرز، ۱۳۷۷ء)

”ساکھا“ بمعنی اتفاق و یک دلی بھی ہے: ”ساکھا“ مشتق ہوتا چند آدمیوں کا کسی کام پر مشغول
حریف سے لڑنے پر اتفاق کرنا یا اور اسی طرح کے کسی امور پر اتفاق ہو جانا۔ ایک دلی،
اتفاق، دسرا، زبان اور وہاں، قرینک آصفی میں بھی یہ معنی ملتے ہیں۔ یہ بھی درست نہیں کہ
متروستطین یا متاقرین کے کلام میں یہ لفظ نہیں ملتا۔ صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے: اگرچہ
راجہ بھت تلواروں نے شمساکھا کیا مگر انہما کو شکست کھائی؟ محمد حسین آزاد (قصص ہند،
مجلس ترقی ادب لاہور، ص ۲۷)

اُپ نہیں تھکتے۔ لیکن آپ چون کہ دہلی کی زبان پسند کرتے ہیں اور اسی کا اُتھلا کرتے ہیں، اس لیے آپ لکھیے ؟

[ہنام نامہ، اخذ المشاطہ سخن]

۱۔ ایک زمانے میں اکثر اساتذہ لکھنؤ کو متروکات کا مراقبہ کر رہے گئے تھے۔ مختلف حضرات کی فہرٹیں الگ الگ تھیں، اور ایسی ایسی قیدیں مانگ کر لی تھیں کہ آج ہنسی آتی ہے۔ چوں کہ یہ قطعاً غیر ضروری پابندیاں تھیں، اس لیے ایسے بہت سے قاعدوں کی پابندی پوری طرح یہ لوگ خود بھی نہیں کر پاتے تھے۔ اسی "یاں" اور "واں" کو لکھیے، آپ نے امیر کے قول کو ملاحظہ فرمایا! لیکن سراج الغیب اور صنم خاؤ عشق میں سیسوں کے لفظ آئے ہیں۔ پہلے دیوان اول مرثیہ الغیب سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں :

ٹوٹوڑے گر عاشق، تو یاں معشوق کلائے دہاں (ص ۱۱۸) ہر روش سبز سے پرواں گھس گل دلار ستار (ص ۳۳) بہمن دل میں جو عارت کے چلی واں کی نسیم (ص ۳۳) یاں اور دوستوں نے کھانا سید کا (ص ۵۲) سرور روشنی چشم ہے یاں خاک قدم (ص ۵) خواب میں بہنو خوابیدہ جو واں کا دیکھے (ص ۳۲) خواب میں دیکھے اگر ترک فلک یاں کی بہار (ص ۳۳) قدم یاں چوں کہ کر دھکتی ہے، بجلی بھی جو آتی ہے (ص ۵۰) واں نزاکت پر تو یاں ہے ناتوانی پر گھٹاں (ص ۱۱۸) یاں ٹکڑ گئی ہے اسی اضطراب میں (ص ۱۸۰)۔

دوسرے دیوان صنم خاؤ عشق سے بھی کچھ مثالیں گھس جاتی ہیں (سطور محبوب پر یس

حیدر آباد) :

واں نگاہیں تیز تیز اور یاں تھیں آویں درد خیز (ص ۵) کیا قدر ہے فساد الفت کی واں امیر (ص ۱۶۸) یاں کثرت مجرور، واں جوش نقش پا (ص ۲۱) جوانی میں بھی یاں نہ آتی ہنسی (ص ۳۶) یاں استخفا اٹھایا ہے دما کے لیے میں نے نہ تاثیر سے واں استخفا اٹھا ہے دمانے

(۳۷) رکھیں :

”رکھیں میں اب تخفیف کاٹ کر نصراً غلاب نصاحت چلتے ہیں؟“

[مشاطہ سخن ص ۲۲]

(ص ۳۷) یاں خامشی پسند ہے وہی غنگو پسند (ص ۷۷) وہاں جام سے دریغ یہاں ہے سپر پسند (ص ۷۷) اٹھی منوکر جوتے ہیں وہاں داد خواہ بند (ص ۷۷) اکس سے شرانے ہو تم دھل میں یہاں غیر نہیں (ص ۳۷) جلال نے اپنے تیسرے دیوان مضمون اے دل کش میں اپنے مرقعات کی جو فہرست پیش کی ہے، اس میں ہر دو لوں لفظ موجود ہیں نیز ان کے صاحب ذائقے کمال نے اپنے رسالے دستور الفصحا میں ان لفظوں کو مرقوک کہتے ہیں یہ قاعدت نہیں کی یہ بھی لکھا ہے ”یہ جو یہاں وہاں کو... لوگ یاں“ (ص ۱۱) جوتے ہیں اور کہتے ہیں یہ نہیں معلوم کیا لفظ ہیں؟ حقوق فیوی نے رسالہ اصطلاح میں یہ لکھ کر کہ وہاں اور یاں وہاں اور یہاں کی جگہ محض غیر فصیح ہیں، اکثر شعرا نے ان کو ترک کر دیا ہے؛ اس پر معاشرہ بھی لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں: ”خصوصاً رشک کے متقلبین نے یک قلم ترک کر دیا ہے۔ مولف نے نہج حکماء الفاظ استعمال نہیں کئے، ابتداء سے ان کا تارک ہے“ (ص ۱۲) اس کے برعکس تھوڑا کھنسی نے اپنے رسالے افادات میں یاں اور دان کو ایسے الفاظ میں شامل کر لیا ہے جن کے ترک کرنا ضروری نہیں لی کر یہ دونوں ایسے الفاظ ہیں شامل ہیں جن کے ترک میں ضرور وقت بڑے گی اور ضرور کلام میں باقی درجے کا ہندوئی۔ ترک نہیں کیے ہیں اور اپنے احباب و ملائکہ کو صلاح ان کے ترک کی دیتا ہوں؟ (ص ۳۲)۔

صاحب نور اللغات نے صحیح طور پر لکھا ہے کہ: ”فصحاے دہلی استعمال کرتے ہیں لکھنؤ کے بعض شعرا حرار کرتے ہیں“ (جلد اول ص ۱۱) بعض کی حد تک یہ بات درست ہے جبہورے داس نے اس میں اس بات کو امتداد دیا ہے کہ ”بعض میں اگر ان لوگوں کو بھی شامل کر لیا جاتے جنہوں نے ہلکا قاعدہ ان کو مرقوک کہا ہے، مگر خود نظم کیا ہے (جیسے امیر غنائی) تب اس بعض کا ترک ضرور تر ہو جائے گا۔“

لے اس کا شمار بھی ایسے مرقوعات میں ہے جو رواج عام کی سند نہ رکھتے تھے مثلاً یہ بھی غیر ضروری

پابندی تھی۔ اس کے زمانے کو چھوڑے اس کے بعد بھی رکھا کو بہ شغف و کثافت استعمال کیا جاتا رہا۔
آرزو لکھنوی مرحوم اس دور کے اساتذہ میں تھے، ان کے شعر ہیں :

نہیم برق ہے گاہ بڑاں کے شعلہ حسن رکھو اسید رعایت دا اشتعال کے بعد

(جہان آرزو، طبع اول ص ۶۳)

اب آرزو، اس پھلکاری میں جیتے کا سہارا کوئی نہیں

دوسو کے تھکے لاکے رکھو، تو وہ بھی جلتے جاتے ہیں

(سرلی پال سری، طبع اول ص ۶۹)

دستا کے کلام سے اس کی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں مثلاً،

خوش نوازی نے رکھا ہم کو اسیر اے صفا د

ہم سے اچھے رہے حدتے میں اترے والے

روزہ رکھیں، نماز پڑھیں، حج ادا کریں

اللہ یہ ثواب بھی ہے کس عذاب کا

نشانِ شہرِ درکھا نام کو زمانے میں

خدا کے بندوں کا وہ غمیر خواہ ہے محبوب

ناج اور مان کے کثر ٹانڈہ کے یہاں بگڑے صورت ملتی ہے مثلاً،

قدم رکھا کہیں اور جا پڑا کہیں کا کہیں ناج (نکلیات، طبع مولائی ص ۱۹۱)

ناقوانی نے رکھا عہدِ استقبال سے (ص ۱۲۵)

علی نے رکھا سیرِ روئے زمیں (ص ۱۳۰)

رکھو مومنو اس طرف گوشیں جاں (ص ۱۳۱)

(۳۸) بھاتا :

”بھاتا پسند آنا کے معنی میں، فصحاے کستودہ بولتے ہیں کہ کہتے ہیں مگر اہل دہلی بولتے ہیں تو آپ شوق سے کہیے۔ توسیع زبان کا بھی آپ کو بہت خیال ہے؟“

[مشاط سخن، ہر دلی، اصلاح بر مغزل، تراہد]

(۳۹) تیراک، تیراک :

”تیراک تیر نامیں آپ کی رائے میں ہے۔ میرے ایک شعر کا مصرع تھا، تیراک

دامن آنکھوں پر رکھو، چاک غریبان کرو تاج (ص ۲۰۸)

ہوں وہ کا غریب رکھا ان کے کتبہ لگیں پر اسے وزیر (دختر فصاحت، ص ۲۷)

ہاں خالی پر رکھا کیوں دست گل گریں ساقیا // ۱ // (ص ۱۳۳)

آتش اور ان کے تازہ دے یہاں بھی یہی صورت ملتی ہے صرف قہار کے یہاں سے مثالیں

پیش کی جاتی ہیں :

جب رکھا آنکھوں پر دامن لال ہا دل ہو گیا (غزل آرزو ص ۳۱) سدا غراب رکھا اپنے ساتھ

اس کو بھی (ص ۵۰) طاق نیاں پر رکھا ہے ہم نے قرآن آج کل (ص ۸۰) کچھ بھی قیمت لیب ہاں

نے رکھی معلول کی (ص ۸۸)۔

اور لوگوں کے علاوہ تادرنے بھی تھیں مغل میں ”رکھا“ بہ خفیت کاں کو مترادف لکھا ہے مگر

ہر زمانے میں اس کی مثالیں مل جاتی ہیں، خواہ بعض نے مکمل احتیاط کی ہو حقیقت یہ ہے کہ یہ پائندہ

بھی محض غیر ضروری تھی اور اسی لیے یہ صورت پیدا ہوئی۔

لے اس لفظ کے لیے کتب ۳ کا ماشیہ دیکھا ہاں ہے تراہد کا شعر یہ تھا :

ادائیں ساقی کی زابہ کو بھائیں کجٹ توڑیہ شادو سے خوار توہ

[مشاط سخن]

پانی پیر کے اس سے محل گیا۔ میرے استاد مرحوم نے "پیراک" بتا دیا تھا۔
[ہر نامِ شیر بجلِ غمیری]

لے جلال نے سرائے زبان اردو میں "پیراک" کے ذیل میں لکھا ہے: "بعض کے نزدیک اس لغت میں بہانے فوقانی، ہائے فارسی ہے؟ گویا جلال "پیراک" کو صحیح راکم از کم مرخ، سمجھتے تھے، لیکن صاحبِ نور اللغات نے وضاحت کر دی ہے کہ "پیراک" صحیح ہے اور "پیراک غلط"۔ پھر "پیراک" کے ذیل میں لکھا ہے: "فصحاے گھنٹو بے جان چیز کے پانی پر چلنے کے لیے "پیراک" بولتے ہیں اور جان دار کے لیے "پیراک"۔ جنابِ آخر گھنٹی نے اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے: "یہ درست نہیں۔ مرغابی جان دار ہے، لیکن اس کے لیے کہتے ہیں کہ پانی میں تیر رہی ہے، نہ کہ پیر رہی ہے۔ اصل یہ ہے کہ "پیراک" غنیمتِ شناوری ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی شے سطحِ آب پر رہے یا بہے، اس کو تیرنا کہتے ہیں" (مرکزِ نگاہ، فروری ۱۹۵۵ء)۔

مرکزِ نگاہِ آصفیہ میں "پیراک" اور "پیراک" دونوں درج ہیں اور کسی امتیازِ معنوی کا ذکر نہیں۔ ان دونوں لفظوں کا معنوی فرق مسلم اکثر مواقع پر اس کا لحاظ بھی ضروری ہوگا، مگر "پیراک" اور "پیراک" میں اس کی پابندی ضروری نہیں، کیوں کہ یہ دونوں لفظ عموماً انسانوں کے لیے بولے جاتے ہیں۔ تاہا اسی نکتے کے پیشِ نظر جلال نے "پیراک" کے ذیل میں "بعضوں کا لفظ استعمال کیا ہے۔"

میساکو آخر صاحب نے لکھا ہے: "اگر کوئی شے سطحِ آب پر رہے یا بہے، اس کو تیرنا کہتے ہیں؟ اس میں اس کا اضافہ کرنا چاہیے کہ اس معنی کے ساتھ ساتھ، شناوری کے معنی میں بھی "پیراک" مستقل ہے، البتہ "پیراک" مطلقاً شناوری کے لیے سمجھے میں آیا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ شناوری کے لیے "پیراک" اور "پیراک" دونوں لفظ مستقل ہیں۔ ان کے معنی گھنٹی نے بحر البیان میں تیرنا اور پیرنا کو مراد بتایا ہے: "پیرنا اور پیرنا بفتح، شناوری کرنا؟"

(۵) رسالہ رشک، میم کی تذکرہ حسن۔ مردم دیدہ ۱
 ”رشک مرحوم نے کس کتاب میں تائید و تذکرہ حروت نجی کا ذکر کیا ہے؟
 اس کتاب کا نام دشت الف ضرور لکھیے۔ اور اگر آپ کے پاس ہو، تو چند روز
 کو مستعار مجھے دیجیے۔
 میرے نزدیک حتم ضرور مذکور ہے اور میں نے مذکور ہی کہا ہے۔
 ”حسن“ بمعنی سال کہیں نہیں نکلتا، فارسی میں تلاش کیا، کوئی سند قابل
 اعتبار نہیں ملی۔ ”ان معنی میرا“ نہ ہے۔ اردو میں بغیر ترکیب اگر ”حسن“
 بمعنی سال کوئی کہے تو نااہلی ہو سکتی ہے۔ محققین اس کی جگہ سال کہتے ہیں۔
 ”مردم دیدہ“ مذکور ہے۔“

[ہام نیم الحق آزاد، ۱۳ نومبر ۱۸۹۱ء]

اور اس اندراج سے قطعی طور پر اس کی تائید ہوتی ہے کہ تیرتا کے ایک معنی ”شادری کردن“
 بھی ہیں اور یہی مستفاد ہوتا ہے صاحب فرنگ آصفیہ کے اندراج سے۔
 لے رشک کی دہلی کسی کتاب کا کسی اور نے ذکر نہیں کیا، اس کے وجود کا کچھ پتا چلتا ہے۔
 لے امیر کا شعر ہے ۱

جو نگہیں ہوں تو ہم پاک سے بدلتے کتائی کو آغوش احد میں جلوہ گرے ہم احمد کا

[عابد خاتم اقبیتین، ص ۷]

صغیر بلگرامی نے رشتات صغیر میں تم کو مذکور ہی لکھا ہے اور عندنا آج کا ایک شعر لکھ کر
 مزید وضاحت کی ہے کہ: ”مگر حیرت ہے کہ کلب حسین خاں آباد نے تغیص معنی میں میم کو موشٹ
 لیوں کر لکھا ہے اور کہاں سند پائی“ (ص ۱۳۷)

جن لوگوں نے تم کو موشٹ کہا ہے، انہوں نے رشک کے یہاں سے سندی ہے،

(۱۱) یہ سلسلہ تمارک گوئی،

”میں نے ابھی مشرب اختیار کر لیا ہے کہ ”آئی“ اور ”آئے“ اور ”گئی“ اور
 ”گئے“ سب میں دُہری سی خیال کی جاتے اور ۲ عدد لے جاتیں پہلے میرزا بیال
 تھا کہ ”آئے“ میں ۱۰ عدد اور ”آئی“ میں ۲۰ عدد شمار کیے جاتیں، مگر اب بعض
 دھڑے ہائے معروف (و مجہول) دونوں کے ۲۰ قرار دیتے ہیں، مگر آپ کہہ

ج ”کہہ سکا میں اگر دو ایک بھی میں، اعلیٰ ہے“ مجموعہ دواوین نور شک، ص ۵، ۳، ۲ شک کے
 دونوں مطلوبہ دواوین میں حرف تَم پر صورت واحد کیوں اس طرح نہیں لگا کہ اس کو مذکر
 یا مؤنث کہا جاسکے، مندرجہ بالا مصرعے میں ”میں“ بہ حالت جمع ہے، اس سے حرف تَم کی
 تانیث پر حتماً استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ جیسے لفظ ”کی“ جمع ”لفظیں“ اسائدہ لکھنؤ کے یہاں لکھی
 ہے، مگر اس سے ”لفظ“ کا مؤنث ہونا لازم نہیں آتا، تاریخ کے یہاں ”لفظ“ ذکر فرماتا ہے (ج ۱،
 آدھے لفظ لب پر باب استفعال کا) یہی صورت ”میں“ کی بھی ہو سکتی ہے، بہر صورت
 اکثریت تَم کی تذکیر پر متفق ہے۔

۱۲ جلال نے گلشنِ فیض میں ”سن“ کو ”سنہ“ کا مرادون لکھا تھا، اس پر اعتراض کیا
 گیا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب الیم نے اسی سلسلے میں استفسار کیا تھا، تفصیل کے لیے دیکھیے
 مکتوب دلا کا حاشیہ۔

۱۳ ”آئے“ جاتے بروزِ فصل کا املا دو طرح مروج ہے: ایک کہ جس طرح آؤ، جاتوں میں آؤ
 بہرہزدہ کہتے ہیں، اسی طرح آئے وغیرہ میں ایک سے لکھ کر اس کے اوپر مزہ لکھ دیتے ہیں، ایسی
 حالت میں صرف ایک سے کے عدد دینا چاہیے، موزعین ہند لے جا رہا ایسے الفاظ میں ایک ہی سی
 کے عدد لے ہیں، اور دوسری صورت یہ ہے کہ دو باتیں لکھ کر پہلی سی بہرہزدہ کو دوسری سی امار
 اکثر اس کا املا دو باتوں سے دیکھا جاتا ہے، ایسی حالت میں دو باتوں کے بیس عدد دینا چاہیے
 (باتی لگے سطر)۔

کیوں کہ تاریخ کی بنا کتابت پر ہے؟ (رسالہ اصلاح ص ۳۰)

جلال نے افادۂ تاریخ میں لکھا ہے کہ ”آئی“ یعنی ”میں“ بیس عدد لیے جاتیں گے لیکن یاے مجہول جن الفاظ کے آخر میں ہو، خواہ اس پر جزو لکھا جائے خواہ نہ لکھا جائے، جیسے خدا، صفائے وغیرہ، اس میں دس عدد لیے جاتیں گے۔ پھر جلال کے قول کے خلاف ہو گئے۔“ میں دوتی شمار کی ہیں اور اس لفظ کے ۳۴ عدد لیے ہیں۔ رشک کے دیوان کی تاریخ میں اُن کا یہ مصرع ہے: ۱۵ چھپ گئے دیوان رشک شاعراں۔ ۱۲۶۳ (تکلیات منیر)۔

مستقی لکھنوی مرحوم نے جلال کے اس قول سے اختلاف کیا ہے کہ ”گئے“ میں ایک ہی فرض کی جاتے:

”گئے“ میں دو ہی ہیں، پہلی جزو ہو گئی ہے، مگر عدد اس کے بھی دس ہی شمار کیے جاتیں گے۔ ”آئی“ کے اگر جلال نے گیارہ عدد لیے ہیں تو یہ ہرگز صحیح نہیں، اس لیے کہ ”آئی“ میں بھی دوتی شمار میں آنا چاہیے، پہلی ہی ہر صورت جزو ہے اس کے بھی دو عدد دینا چاہیے۔ اس طرح ”آئی“ کے ۲۱ عدد ہوتے ہیں۔ ”کہلائے“ بروزین فعلوں، اس کے بھی ۶۶ عدد دینا چاہیے، کیوں کہ اس میں دوتی ہیں۔ اگر امیر میثانی صاحب نے اس لفظ کے ۶۶ عدد لیے ہیں تو مجھے ان کی رائے سے اتفاق نہیں۔ البتہ ”کہلائے“ بروزین فعلوں کہیں پر نظم میں آتے تو اس حالت میں آپ ۶۶ لے سکتے ہیں۔ کیوں کہ کتابت میں صرف ایک ہی ہوگی اور اس کے دس شمار کیے جاتیں گے؟

(مکتوبہ مستقی، نقوش، مکاتیب نمبر ۱۵، ص ۱۵)

اس بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے، موجودہ اہلکے لحاظ سے عرض کروں کہ اصولاً آئے جاتے وغیرہ میں ایک ہمزہ اور ایک ہی لکھنا چاہیے۔ عموماً لکھا بھی اسی طرح جاتا ہے یعنی آئے، جاتے، لاتے، پاتے، اور آئی، جانی، لاتی، پائی وغیرہ۔ اس بنا پر کہ تلفظ میں آخری ہی سے (والی لگے مسئلہ پر)

پہلے ہمزہ کتاب ہے۔ درز پھر آقا اور جاؤ کو، آکر اور جالو لکھنا پڑے گا۔ اور اس لحاظ سے اب "فی" اور "تے" کے گیارہ عدد لیے جائیں گے۔ (ہمزہ کا ایک عدد ان لغظوں میں ضرور لیا جائے گا یہ کنتوبی اور لمغظی، دونوں حیثیتیں رکھتا ہے، تاریک کی ہنا کتابت پر ہے اور اس کے کسی کو اختلاف نہیں۔ آئے اور آئی میں صرف ایک حتی لکھی جاتی ہے، اس لیے عدد بھی صرف ایک حتی کے لیے جائیں گے۔ اس سے بحث نہیں کہ قدمائے کیا کہا ہے۔ ان کی بحث کا مدار اس پر تھا کہ لفظ آئی و آئی ہی ہے، مگر اس طرح نہ کہتے ہیں اور نہ لکھتے ہیں۔ یہی ہمزہ کا عدد شمار نہ کیے جانے کی بات، تو شوقِ نبوی نے یادگار وطن میں اس پر بحث کی ہے اس کو دیکھا جائے۔ ہمزہ کا ایک عدد وہت سی تاریکوں میں لیا گیا ہے۔ اردو میں ہمزہ کی حیثیت مستقل حرف کی سی ہے، اس لیے ایسے مقامات پر اب اس کا شمار حروف میں کیا جانا چاہیے بناسب معلوم ہوتا ہے کہ افادۂ عام کی خاطر، یادگار وطن کی مکمل عبارت کو یہاں پر نقل کر دیا جائے:

"بعض رسائل میں لکھا ہے کہ ہمزہ کا کوئی عدد نہیں چنانچہ ریاض العروض میں

ہے کہ زاء الف محدودہ، اس کا مورخین نے ایک لیا ہے، اس لیے کہ ہمزہ بے عدد ہے۔ اور حضرت جمال نے رسالۂ افادۂ تاریخ میں لکھا ہے کہ ہمزہ جو خطِ مخفی سے عبارت ہے، اس کا کوئی عدد تاریخ میں نہیں لیا جاتا، اس لیے کہ کوئی حرف، حروفِ تہجی میں سے نہیں ہے۔ پس مؤلف پنج ماہ کے نزدیک ہمزہ کا ایک عدد لینا کسی طرح صحیح نہ ہوگا۔ غلط بلکہ غلط ہے کہ مورخینِ ثقافت نے کہیں ہمزہ کا کوئی عدد تاریخ میں نہیں لیا۔ انتہی۔

اور مولف کی نظر سے بعض ایسی تاریکیں بھی گوری ہیں جن میں ہمزہ محسوب نہیں ہوتا جیسے رشک لکھنوی کی یہ تاریکی: اب کیا کشتی بنی ہے ماشار اللہ (۱۳۳۹ھ) انصروں لوگوں کی اس قسم کی تجسس و درو تاریکوں سے پہلے میرا بھی یہی خیال تھا کہ ہمزہ کا عدد لینا صحیح نہیں۔ مگر بعد متنبیخ و لغض ثابت ہوتا ہے کہ اس کا ایک عدد لینا بلا شک و دوت ہے یہ خیال کہ ہمزہ حروفِ تہجی سے نہیں، قابلِ ثقافت نہیں کیوں کہ جس طرح ہے، جیم (بائی اگے سطر ہے)

کے موضوع ہے، اُسی طرح ہمزہ، الف کا قائم مقام ہے۔ دیکھو صاحبِ مراح وغیرہ ”خباثت“ وغیرہ کو، باب الالف میں لائے ہیں، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمزہ، الف کا قائم مقام ہے۔ اس کے علاوہ مؤرخینِ کرام نے بھی ہمزہ کا ایک عدد دیا ہے۔ چنانچہ مولف خزانہ عامہ نے یہاں کافی ترجمہ میں لکھا ہے کہ:

”مغنی غانکہ کہ ہمزہ کہ بعد الف می آید، مورخانِ فارس اکثر اور ابہای الف داشتہ، و در تاریخ حساب می کنند۔ چنانچہ در ترجمہ نعمت خان عالی گذشت کہ ہمزہ لغار را در تاریخ مصرعہ: ”خوہا تو کردایں با التقادس کنین“ محسوب ساختہ۔ و گاہے حساب نمی کنند، زیرا کہ شکلہ از اشکالِ حروفِ تہجیء وارد۔ چنانچہ در تاریخ میگویند، کہ مورخ ہمزہ ”احیاء“ را محسوب ساختہ۔ و مورخانِ عرب بر عکسِ ایں عمل کنند۔ یعنی اکثر حساب نمی کنند، و گاہے کنند و قسہ ضرورت۔ مثلاً تاریخ القرآن یا حدیث یافتہ شود میر عبد الباقی بگرامی تاریخِ بلوس محمد قریح سیر بادشاہ، مطابق ۱۱۲۳ھ اربع عشرین دماوند الف ”میر شہائن قیشار یافتہ، و ہمزہ ”یشادہ“ را حساب کردہ“

اور شمس السلامی محمد سعید حسرت عظیم آبادی نور اللہ مرقدہ کہ بہت بڑے محقق تھے، ان کے دیوانِ قسطاس البلاغ میں یہ تاریخیں موجود ہیں، خط: گویر شد بہاء زلالِ دسالِ دوست (۱۲۸۳ھ) خط: بنائے نظری کیفیتِ حقیقی (۱۲۹۶ھ) اور ان کے دیوانِ مقصد البلاغ میں یہ تاریخ ہے خط: چار ہندی خزانۃ الاسرار۔

الفرض ہمزہ کا قیام اور زلیلا دونوں طرح ثابت ہوتا ہے۔ دیکھو یہ بات کہ ہم لوگوں کو کیا کرنا چاہیے؟ اگر یہ قاعدہ رکھا جائے کہ جہاں چاہے۔ لکھیے، اور جہاں چاہے چھوڑ دیجیے تو کچھ مشک نہیں۔ ایسی حالت میں ایک سال کی کنی۔ بستی کا کٹکار ہے گا، اور قیامِ زمانہ جو تاریخ سے مقصود ہے، ثابت نہ ہوگی۔ اس باب میں کوئی قاعدہ منضبط ہونا چاہیے کہ عربی (باقی اگلے صفحہ پر)

مشرّب ہند آئے تو آپ بھی اختیار کیجیے۔ اور جلال نے "آئی" میں ۱۰ عدد نہیں
 لیے ہیں بلکہ ۲۰ عدد لیے ہیں۔ البتہ "بولی" میں ہی نہیں لکھی ہے، اور اگر اضافت
 دی ہے، چنانچہ دروان میں بھی بغیر کے چھوڑا ہے، اور افادہ تارکچ میں
 بھی اس سے بحث کی ہے، مگر میں اس کو پسند نہیں کرتا۔
 بہ نام نعیم الحق آزاد۔ امراہیل ۱۸۹۳ء

(۵۲) آنچل اور دامن — ایطاء

"آنچل اور دامن کے جھگڑے میں میری مدد ہے کہ دوپٹے اور اوڑھنی وغیرہ
 اوڑھنے کی چیزوں میں "آنچل" کہنا چاہیے۔ اور قبا، عبا وغیرہ پہننے کی چیزوں

دور ہو جاتے ہیں اب اس ضابطے کا پابند ہوں کہ عربی ہوا فارسی، جہاں ہمزہ مستقل طور
 پر ہو یعنی "ہمزہ چشم" وغیرہ کی طرح کس حرف پر نہ ہو، جیسے: جائز، مانگا، اس کا ایک عدد
 لینا چاہیے۔ کیوں کہ جب کتابت میں بھی موجود ہے اور ہمزہ، الف کا قائم مقام ہے، تو
 اس کا وزن کیوں ہو۔ ہاں اگر کسی واقعے کی چند تاریخیں ہوں، جن سے تعیینِ زمانہ ہو جاتی
 ہے، اگر اس کی ایک اودہ تارکچ میں ہمزہ کا عدد نہ لیا جائے تو چنداں مضائقہ نہیں کیوں کہ
 آخر لوگوں نے ہمزہ کو غیر محسوب بھی قرار دیا ہے، اور دوسری تاریخوں سے ثابت ہو
 جاتا ہے کہ یہاں غیر محسوب ہے۔ کئی بیشی کا کٹکا نہیں ہو سکتا مگر ہر صورت اولیٰ یہی
 ہے کہ ہمزہ مستقل ہے۔ سو اب ہو، کہیں نظر انداز نہ کیا جاتے۔ سارا گارہین، ص ۳۵-۳۶
 یہی صورت اردو میں ملحوظ رہنا چاہیے۔ مگر ۲۰ وڑ آتے ہیں لفظوں میں ہمزہ مستقل نہ کہ

کے اشارہ ہے جلال کی اس عبارت کی طرف: "یا مولیٰ نے نواب مرزا خان داتا دہلوی کے طبیب دیوان
 اول کی تاریخ میں لفظ "آئی" کے عیس صد لیے ہیں۔ جو گزارداد "آئی آج" (افادہ تارکچ، ص ۱۲)
 سے جلال کا یہ رسالہ گزارداد تاریخ کوئی نہ مشغل ہے۔ طبیب جعفری لکھنؤ میں ۱۳۰۳ھ میں لکھی بار چھاپا

میں دامن کہاں پانچے بگر شعر بھوٹ منہ کی نصیبوں ہو سکتی ہے کہ شعر اے
گورث دامن کو بھی آنچل کہا ہے چناں چہ اس کو میں نے امیر اللغات ^{لغات} کی کسی
قدر تفصیل سے لکھا ہے، اور یہ دو شعر سند کے بھی "آنچل" کے لغت میں درج
کیے ہیں:

آنچل اس دامن کا ہاتھ کٹا نہیں قیڑ دریا کا سا اس کا پھیر ہے (تیرا)

دھیان دانوں کا جو یا تو تم سچی تفسیر گنگا نے منہ پر یاد دامن شب کا آنچل ہے (ایم)
ساعت اور گھڑی ساعت کے قافیے میں احتیاطاً تو مقتضی اس کی ہے کہ خاطر
ضرورت شدید، دوم التباس سے بھی بچے مگر جو از ثبات کرنے کے لیے
بہت سے اشعار شعراے فارسی و اردو کے ملیں گے جن میں انھوں نے
جائزہ کر لیا ہے ایسا کہ تجرلہ مطلع کیا ہے:

"آثار تاریخ" تاریخی نام ہے جس سے سالہ انتظام تالیف (حسب مراسلت موقت) ۳۰۲ھ نکلتا ہے
آثار تالیف کا سال "آثار تاریخ" سے نکلتا ہے (۱۳۹۲ھ)۔

۱۔ امیر اللغات کی مکمل عبارت یہ ہے:

"آنچل ۱۷۔ آنچل اس۔ آثار" انجیو ہے، اردن گن دوپتے وغیرہ اوڑھنے کی چیز کے دس
روال کے، اردنوں سرے جو ایک طرف سے دوسری طرف شانے پر ڈالے جاتے ہیں۔
نوتن: آنچلوں سے کہو متبیش کہاں چھڑا سنا کب دوہ فلم مری طرح گر پڑا سنا
گورثیم: آنچل ہوا داں مجاہد عارض سہرا ہوا یاں نقاب عارض
اور شعراے دامن کے کنارے کو بھی "آنچل" کہا ہے، مگر زبانوں پر نہیں ہے۔

تیرا: آنچل اس دامن کا ہاتھ کٹا نہیں قیڑ دریا کا سا اس کا پھیر ہے
(باللہ کے مطلع پر)

بحر، درویشی طریقہ ہے رسول اللہ کا ہاندھے تسبیح کر میں تو بسم اللہ کا
[بہ نام قاضی محمد طلیل حیراں بریلوی]

(۵۳) برس :

”غزل دیگی، زمیں کے سُست ہونے سے، اکثر شعر سُست ہیں: برس سُست“
نکرتہ ہے :

[بہ نام بشیر علی آبادی، ۲۶ جون ۱۸۹۲ء]

لہجہ، دھیان دانوں کا جو کیا تو یہ سوچی تشبیہ

سج لے منہ پہ لیا دامنِ شب کا آغیل۔

۱۔ کلیاتِ تہذیب و ثقافت، آئی اس ۱۹۲۲ء میں دیا گیا تہذیبی موسم بہ دفترِ فکرت ص ۱۷۔

۲۔ بحرِ کھنوی کا یہ شعر غالباً یہ سلسلہ اظہارِ روح کیا گیا ہے۔ شوقی غموی نے رسالہ اصلاح میں
بحر کا یہ شعر اور خواجہ وثریر کا ایک شعر نقل کر کے لکھا ہے کہ :

”ان اشعار میں بھی ایسا نہیں ہے، کیسے کہ وجہِ اختلافِ ملیت، معنی میں تکرار

درجی“ (ص ۲۵)، خواجہ وثریر کا وہ شعر یہ ہے :

میں سلا مظهرِ اہمِ خدا، واللہ ہوں ہمِ صغیر و اس چہ میں مرغِ بسم اللہ ہوں

۱۔ ”برس“ کے مندرجہ ہونے پر اتفاق ہے۔ اصولاً اس کی جمع ”برسیں“ نہیں آتا چاہے صغیر ہو گرامی

نہ یہ بات لکھی گئی ہے، ”بعض ناواقف“ برس کے لفظ کو جو ہر معنی سال ہے، مونث سمجھ کر اس کی

جمع ”میں“ سے ”برسیں“ کرتے ہیں، حالانکہ ”برس“ مندرجہ ہے اور اس کی جمع ”برسوں“ ہوگی :

در شہادِ صغیر، ص ۱۸۸، صغیر کا یہ لکھنا کہ جو لوگ اس کی جمع ”برسیں“ کرتے ہیں، وہ ”برس“ کو

بھی مونث سمجھتے ہیں، درست نہیں یہ عرض کر دیا جائے کہ بول چال میں اس کی جمع ”برسیں“

سننے میں ضرور آتی ہے صاحبِ فورِ اللغات نے اس کو عورتوں سے مخصوص کیا ہے: ”برس۔

برسوں جمع۔ عورتیں مونث بولتی ہیں۔ فقرہ دہانچ چھے برسیں ہوئی ہوں گی جب باقی اگلے صفحہ پر

(۵۴) کسرا

”کسرا بہ تفتیق دارد ہے۔ اور اسی طرح مستعمل ہے جس طرح دانش نے کہا ہے۔ ”ایک آنچ کی کسر رہ گئی“۔ ”تھوڑی سی کسرا آتی ہے“۔ ”بہ تکلف ہے۔ اور ”کسر“ بہ فتح اول و سکون ثانی، عربی ہے، جو بہ معنی شکستن ہے، جیسے کسرِ شان کسرِ نفس؛ وہ اُس جگہ مستعمل نہیں ہے جس جگہ سے بحث کی گئی ہے اور داس کے معنی یہاں چسپاں ہوتے ہیں۔ بہ حرکت ”کسر“ اپنے مقام ہر صیح اور بول چال میں داخل ہے :

[بہ نام بشیر شیح آبادی، ۸، مارچ ۱۹۷۰ء]

(۵۵) تیروں کا گنجان ہو کر ٹھٹھا :

”تیروں کا گنجان ہو کر ٹھٹھا بہ زبان نہیں ہے۔ درخت، آبادی و خط کی نسبت گنجان کہا جاتا ہے۔“ [بہ نام دل شاد جہاں پوری]

(۵۶) چلن۔ دامن ٹھٹھا۔ آستین ٹھٹھا۔ گریبان ٹھٹھا :

”چلن ہندی ہے۔ دامن ٹھٹھا، آستین ٹھٹھا؛ ہر ایک صحیح ہے۔ کسی کا شعر ہے :

لاٹ صاحب لکھنؤ آئے تھے : مگر اس میں عورتوں کی تخصیص مناسب نہیں۔ عام گفتگو میں بھی ہم اس طرح استعمال میں آتا رہتا ہے۔ اور جو لوگ ”برسکیں“ بولتے ہیں اور ”برس“ بولتے ہیں، وہ ”برس“ کو مذکر ہی استعمال کرتے ہیں۔ ”لفظیں“ کی مثال سامنے ہے کہ لفظ ”نذر“ اور اس کی جمع ”لفظوں“ اور ”لفظیں“ دونوں طرح آتی ہے۔ یہی صورت اس لفظ ”برس“ کی ہے۔ بہ ہر حال یہیں کو بھی مان لینا چاہیے، کیونکہ بہ صحت فرد ہوگی کہ اس سے برس کا ^{موقت} ہونا لازم نہیں آئے گا۔

اے دانش کا شعر ہے : اتنی ہی تو بس کسر ہے تم میں : یہ کیا نہیں مانتے کسی کا
(مہتاب دانش، مطبع مفید عام لاہور، ص ۲۳)

گرہاں کو میں روکوں، یا سنبھالوں اپنے دامن کو
 بڑی شکل تو یہ ہے ساتھ ہی دونوں نکلتے ہیں

[برنامہ دل شاہ جہاں پوری۔ ۱۹ ستمبر ۱۹۸۹ء]

(۵۷) پس چلمن :

”چلمن“ فارسی ہے، عربی اس کی طرف اضافت فارسی کی ہرگز جاتر نہ ہوگی۔
 ”جانب متھرا“ کی نظیر اس کے لیے سند نہیں ہے۔ ”متھرا“ علم ہے، شہر کا نام ہے؛
 اس کا توجہ فارسی عربی میں کیا ہوگا؟ ہندو ہی لفظ ترکیبوں کے ساتھ بے تردد
 باندھا جائے گا۔ آپ کے مطلب میں جس میں ”پس چلمن“ ہے، یوں اصلاح ہو
 سکتی ہے:

دل صد چاک میں دیکھا رخ روشن کن کا ہم نے نظارہ کیا ڈال کے چلمن آن کا
 [برنامہ دل شاہ جہاں پوری۔ ۱۳ مئی ۱۹۸۹ء]

۱۔ دل صاحب کا مطلع یہ مٹنا:

دل صد چاک میں دیکھا رخ روشن کن کا ہم نے نظارہ کیا ہے پس چلمن آن کا
 (مشاطہ سخن)

اس لفظ کو بے اضافت نظم کیا گیا ہے:

کیوں زود پردہ نشیں پھر مجھے مرن مانے میں نے تھے بھول گئی جانب چلمن مانے

انشاء (کلام انشاء، ص ۲۳۶)

نیم جلوے کو بھی روکتے ہیں اب بے پردگی جسم کا ہید و بر کس کا صرّت چلمن ہوگی

نوکسن (دیوان مرثیہ فیض احمد، ص ۳۰)

یہ کاہ رہا ہے بھی ہیں کم اسے کششیں دل مذکور کچھ ایسا پس چلمن ہے ہوا

(ص ۳۲) (باقی اگلے صفحے پر)

اضطرابِ شوق، شاید طیرائیں کھاس ہو جانبِ چٹونِ نظار دوم بہ دم کیوں مگر کریں

توسن (دیوانِ مرثیہ ج ۱، ص ۱۳۷)

بے پردہ بہرِ چمن یک بار تم آ بیٹھے ۔ ہے تابِ نظر کس کو، کیوں جلوہ گری اتنی

(د، ص ۲۰۳)

”چمن“ درحقیقت ایسا لفظ ہے جس کے ساتھ اضافتِ فارسی مطلق عقلی فصاحت نہیں

معلوم ہوتی جو مثالیں اوپر پیش کی گئی ہیں، اُن سے اس کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے،

اور ایسے الفاظ کے ساتھ عطف و اضافت کو غلط نہیں کہنا چاہیے۔ آتش کا شعر ہے:

سرخ و سفید رنگ سے ہوتا ہے آشکار وہ جسم نازیں ہے ابھرو گلاب کا

دکھات، نول کشوری، ص ۵۵

یہاں ”ابھرو گلاب“ نہایت بر محل ترکیب ہے، جب کہ قاعدے کے لحاظ سے یہ بھی درست

نہیں۔ یہ بات ذہن میں رہنا چاہیے کہ ایسی ترکیبوں سے بھر نہیں۔ اوروں کا کیا ذکر خود تیر

کے یہاں ایسی مثالیں موجود ہیں۔ اُن کے مختلف خطوط ہے۔ مثلاً شائیں پیش کی جاتی ہیں:

برادری ٹراک (ص ۳۳۹)، صیفِ بیرنگ (ص ۲۳۲)، کیشی انتخاب (ص ۲۳۶)، لکھن

اسٹات (ص ۲۳۸)، شعلِ سرک (ص ۳۰۹)، کارٹرِ اطلاعی (ص ۱۰۹)

یا مثلاً اُن کے اس مطلع کو دیکھیے:

گھر ہے اٹھ کا، گھر ہے سرو سامانوں کا پاسانوں کا یہاں کام نہ دربانوں کا

(صنم خاۃِ عشق، ص ۱)

پہلے مصرعے میں ”سرو سامانوں“ کی بھی یہی حیثیت ہے غرض یہ ہے کہ چمن جیسے لفظوں

کے ساتھ عطف و اضافت کو غلط نہیں کہنا چاہیے اس طرح کی ترکیبیں اچھی خاصی تعداد میں اردو

کی شرو و نظم میں ملتی ہیں۔

یہ خط نقوش کے مکاتیب نمبر میں بھی شائع ہوا ہے اور مرتبہ ادب میں اباقی آگے ملے ہیں

(۵۸) جاے سے باہر ہونا۔ گنجینہٴ زبان :

”واقعہ یہ ہے کہ جاے سے باہر ہونا اور اس کے امثال میں، بے خودی، غمروئی ہے، مگر بے خودی کی غلطی بہ اختلافِ مواقع مختلف ہوتی ہیں۔ کہیں کمالِ غضب، کہیں کمالِ سرور، کہیں کمالِ رشک۔ دقت علیٰ ہذا: تاسخ کے اس شعر میں :

بچہ کو جس گل چیر بن نے اک نظر دیکھا وہی نکبتِ گل کی طرح لے جاے سے باہر ہو گیا
نشاے بے خودی، رشک ہے۔ اور اس شعرِ تاسخ میں :

اپنے جاے سے وہیں ہو گئے باہر لکھلا گھر سے پوشاک بدل کر جو وہ باہر لکھ
نشاے بے خودی، وفورِ سرور ہے۔ اور اس فقرے میں کہ تم سے کوئی
کیا در بدر دل کہے، تم ذرا ذرا سی بات میں جاے سے باہر ہو جاتے ہو، نشاے
بے خودی، غمروئی، غضب ہے۔ یہ ہر حال، آپ کے اس شعر میں :

جاے سے باہر ہے جب سے چھو لیتے لباس عطر کی بو ہر طرف پھرتی ہے اترائی ہوئی
نشاے بے خودی، وفورِ سرور ہے۔ اور اترانے کا ذکر، صاف اُس کی
طرف شعر میں ہے، لکھا، یعنی بوئے عطر اس بات پر کہ میں نے اس کا لباس
چُھوا ہے، یاد کر رہی ہے۔ پس یہ مقام سرور اور نشاط کے جوش کا ہے۔
یہاں غضب اور رشک کی گنجائش نہیں۔

بھی موجود ہے۔ دونوں کے مین میں فرق ہے، تقدیم کے لحاظ سے مرقعِ ادب کے متن کو ترجیح دی گئی ہے۔
لے کلیات میں ”طرحِ نئی جگہ“ ”روش“ ہے۔ نکبتِ گل کی روش جاے سے باہر ہو گیا۔
(کلیاتِ تاسخ، مطبع مولائی، ص ۶)

پس یہ جو آپ نے لکھا ہے کہ ”ہمارے سے باہر ہونا بے خودی کے معنی میں مان لیا جائے تو میرے شعر میں بڑے عطر کا احترام، لطف نہیں دیتا“ مستمم نہیں، بل کہ خوب لطف دیتا ہے۔ اور شعرانے ایسے موقع میں دکڑا بہت کہا ہے جن کو کہ سب سے پہلے کلام کی فرصت نہیں، لہذا اشاریں نہیں لکھ سکتا۔ اور آپ کی سلامت راتے اور ذہن و تاج پر اعتماد کر کے، اسی قدر توجہ کو کافی سمجھتا ہوں۔

نُفّت اردو کا جو آپ کے پیش نظر ہے، اس سے متعلق ایک وجہ ہے کہ اس کو میں لکھنا مناسب نہیں سمجھتا۔ کبھی لوں گا تو کہوں گا۔ ایک نُفّت میں نے راندِ عذرا سے شروع کیا تھا، مگر وہ میری کم فرصتی سے مہذب و مکمل نہ ہو سکا۔ مسودہ غیر مہذب اُس کا اب بھی موجود ہے کہ اس نُفّت سے، جو آپ نے دیکھا ہے، چار چند ہے۔ اگر خدا الطیفان دے تو دہریس کی محنت میں وہ تکمیل پا سکتا ہے۔ مگر جو سلمان اس کی تکمیل و اشاعت کے لیے دیکھا ہے، وہ خدا مہیا کرے تو ہو۔ گنجینہٴ زبان کو اس کا ایک ٹکڑا چاہیے، اور

مے گنجینہٴ زبانِ اردو، جلال کے نُفّت کا نام ہے، جس کا تاریخی نام غشّی فیض ہے۔ اس کی تفصیل مکتوبِ مے کے حاشیے میں درج کی جا چکی ہے۔ آمیر نے گویا جلال پر سرتے کا الزام لگایا ہے، جس صورت میں کہ آمیر کا نہ کوہِ نُفّت چھپا ہی نہیں تھا اور اُس کا مسودہ بھی غیر مہذب تھا اور آمیر کی کم فرصتی کی وجہ سے وہ ”مہذب و مکمل نہ ہو سکا“ کسی خاص ثبوت کے بغیر اس بات کو کیسے مانا جا سکتا ہے۔ اصل میں ابنِ اساتذہ کرام میں باہم اس طرح کا مزاج المومنین ہوتا ہی رہتا تھا۔ اس کو یوں دیکھیے کہ آمیر نے جس طرح جلال پر سرتے کا الزام لگایا ہے، مگر ذرا احتیاط کے ساتھ، اس کے مقابلے میں مولوی سید احمد دہلوی مولفہٴ فرنگِ آبِ صفی نے

مکروہ بھی کسی قدر نصرت کیا ہوا، اور سب تعزقات بھی بجا نہیں ہیں۔
 خیر اس قصے کو جانے دیجیے۔ اس خط کو بھی کسی کو نہ دکھائیے، کیا مائل
 کہ ہم طال پڑھے۔ جو ہوا ستارہ ہو چکا۔ اگر زمانہ فرصت دے گا اور وہ
 نفٹ کبھی نکلے گا تو حقیقت منکشف ہو جائے گی۔ اور فرصت مذہبی اور
 وہ محنت و محنت سالہرہ ہوا ہو گئی تو وہ اے بسا آرزو کو
 خاک شدہ ؟

[ہنام مہدی حسن خاں شاداب رسول پوری، ۱۳ اپریل ۱۸۸۵ء]

نہایت وضاحت کے ساتھ آئیر بر بھی لگایا ہے۔ جلد اول کے دریا ہے میں
 جہاں آئیر کی وفات کا ذکر کیا ہے، وہاں لکھا ہے :

”اللہ اللہ کیا مقام مہرت ہے کہ حضرت آئیر احمد صاحب آئیر بنائی، جنہوں
 نے اس اخیر میں امیر اللغات کے دو باب حرب العین ممدودہ و مقصورہ کے،
 ہو بہ اور مقامی دلی کا چربا اُتار کر شائع فرمائے... ہر فرنگ آصفی، جلد اول،
 حاشیہ ص ۱۳“

مولوی صاحب نے کئی جگہ اس الزام کی گمراہی ہے۔ اس طرح کے الزامات کو زیادہ اہمیت نہیں
 دینا چاہیے۔ ہمارا نہ جنگ ”ایسے خیال پیدا کریں دیا کرتی ہے اور متعلقین کی سخن ساز طبعیتیں اس پر
 حاشیہ چڑھاتی رہتی ہیں۔ ہر نفٹ میں الفاظ و محاورات کی تو گمراہی ہو گئی تھی محاورے اور لفظ کہاں سے نہیں
 تھے اور بہت سی آشرکات و امثال بھی ایک جیسے ہو سکتی ہیں اس سے کسی کو مفر نہیں۔ آئیر نے اپنے جس نام
 نفٹ کا اس خط میں ذکر کیا ہے، اُس کے حلقہ نام کا کراؤ محمد تحریک نام سے ظاہر ہے کہ بہار چند ہوگا، مطالعہ
 ص ۱۳۱ اور مجھے اس نام سے اتفاق ہے۔ بہار چند کا ذکر آئیر کے ایک اور خط میں بھی آیا ہے، ملاحظہ
 ہو مکتوب خط ۱۱ اور اس کا حاشیہ۔

(۵۹) اختتامے نون :

”خون، جان وغیرہ سہ حرفی الفاظ میں نون کا اختتام غیر فصیح ہے، انا، جانسے
اضافت وغیرہ“

[برنامہ: معلوم، ۲۵ نومبر ۱۹۸۸ء]

(۶۰) دولت سرا کی کشش و جذبہ :

”دولت سرا، سو قش ہے۔ دولت سرا کی جگہ، دولت کردہ مناسب ہے۔
کشش اور جذبہ، ایک ہی چیز ہے۔ ”کشش“ کی جگہ ”دل“ مناسب ہوگا:
یہضام وصل: ارنے بعد قفا دریا آخر کو دل نے جذبہ الفت دکھا دیا:
[برنامہ منشی عنایت اللہ رشک سن بدایونی، ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۹ء]

(۶۱) سدا :

”سدا کا لفظ بہت فصیح ہے۔ متوسطین نے اس کو ناحق ترک کر دیا۔

لے دوسرے شعر کا کیا ذکر اس کی مثالیں خود آئیں گے یہاں بہت ہیں، مثلاً :

پردیکھنے کی طرح مری جاں نہیں دیکھا، انتم غادۂ عشق، (ص ۲۹) حسرتیں خون ہو گئیں
دل میں تو لایا رنگ عشق مرآۃ النیب، (ص ۸۸) زلفِ لیل سے بچے تیس کا دل خوں ہو کر
(ایضاً ص ۱۳۸) ایسا ہوا ہے اب تو زلفِ لیل کا خوں سفید (ص ۷۳) چمن سے لیل کے خوں کا
محضر گواہ ہیں برگ و بر سر (ص ۹۸) خوں مرا کر کے بہت استو ملے قاتل نے (۱۰۳) خوں رلختے
اس قدر کہ ہوا فرش خواب سرخ (ص ۱۱۳) پھولے گا خوں سے دشت میں پھر لا زار آج (ص ۱۱۰)۔

یہ پابندی بھی قطعاً غیر ضروری غیر مناسب اور ناقابلِ عمل تھی، اور اسی لیے اس کو نباہنا چاہا
سکا۔ ایک دوسرے مضمون میں اس پر مفصل گفتگو کی گئی ہے اس سلسلے میں اس کو بھی دیکھا جاتے۔

لے یہ خط صہبائے یتانی میں ہے، مگر مکمل مکتوب ایہ کام بھی نہ کر نہیں سکا اصل خط کمری جناب حضرت
ضیق بنی ہر لڑی کہ اس مخطوبہ میں ہے اس خط سے بہت نقل کی ہے اور مکتوب ایہ کام بھی اسی سے اخذ ہے۔

میراجی تو چاہتا ہے کہ اس کا استعمال کر دے؟

[سوانح امیر چٹائی مولانا حلیل مانگ پوری ص ۷۱]

اے آئیر کے شاگرد اور جانشین حلیل مانگ پوری نے آئیر کا یہ قول اپنی کتاب سوانح امیر چٹائی میں لکھا ہے۔ مکمل عبارت یہ ہے :

”فرمانے سے کہ ”سدا“ کا لفظ بہت فصیح ہے جو شیطین نے اس کو ناحق ترک کر دیا۔ میراجی چاہتے ہیں کہ اس کا استعمال کروں، مگر کبھی استعمال نہیں کیا۔ اور لفظ ”سدا“ کو دافع صاحب سے جب حیدر آباد میں یک جاتی ہوئی تو ان کو یہی کہتے ”سدا“ کا لفظ استعمال کرنے کو ہی چاہتا ہے؛ مگر انہوں نے کبھی استعمال نہیں کیا۔ یہ ان حضرات کی احتیاط کا مقتضا تھا، ورنہ استعمال کیا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں؟“

سوانح امیر چٹائی ص ۷۱۔

صاحب ”تور اللغات“ نے ”سدا“ کو بہ ذیل متروکات لکھا ہے۔ جنہاں نے گشتی قبض میں اس لفظ کو لکھا تھا اور سند میں آج کل یہ شعر لکھا تھا :

”ہو مبارک تا صد کی سال چتر سلطنت سایہ افکن ہو سدا رایت علم ہزار کا“

اور آفریں لکھا تھا کہ ”والحال میں لفظ متروک است“۔ سرائے زبان اردو میں آج کا شعور و راج کیے بغیر لکھا ہے؟ اس زمانے کے فصحاء اس لفظ کو نہیں بولتے۔ اب متروک الاستعمال ہو گیا ہے؟ مگر اس زمانے کے فصحاء کے یہاں یہ لفظ تھا ہے، مثلاً :

ایک کوڑی کہیں نہ میں لایا تم کو اس پر بھی خوش بسدا پایا

متیر شکوہ آبادی (کلیات ص ۵۶۹)

خواجہ اسد قلن کھنوی (متوفی ۱۲۹۶ھ) کے شہر آشوب (مطبوعہ معاصرین) میں یہ

لفظ ”دو جگہ آیا ہے“

(۶۲) آسیر۔ مصحفی کے استاد کا نام۔ تلامذہ کی تعداد :

”نشی منظر علی آسیر مرحوم نے ۷۶ برس، تین بیٹے، تیرہ لون کی عمر پائی۔ ۱۷۰۱ رجب الاول ۱۲۹۹ھ کو رحلت فرمائی۔ مذہب اُن کا امامیہ تھا تصنیفات کی تعداد تو کلمہ دینا آسان ہے، مگر سب کے نام لکھنے کی فرصت کہاں۔“

۴: نام فرزند پہ جس کی جو سدا جان نثار

۵: ملک شہر اودھ کی جو سدا کہلاتے

و زیر تلینذ ناسخ نے بھی اس کو استعمال کیا ہے، اور صبا کہہاں بھی موجود ہے :

۶: دیکھتا ہوں اس کو پھرتے دستِ خباں میں سدا و زیر (دفعہ فصاحت) ص ۱۸۲

۷: سدا خراب رکھا اپنے ساتھ اُس کو بھی صبا (غیر آرزو) ص ۵۰

۸: گرداب سے کیوں کر ذکرے آبِ سدا صبا ص ۷۰

۹: ہر حال میں خوش رہتے ہیں کرتے ہیں سدا صبا ص ۷۰

صاحب نور اللغات نے لکھا تھا کہ ”خواص نے اس کا استعمال ترک کر دیا ہے“ آخر لکھنوی

مرحوم نے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

”خواص کی ذکیہ، وہ دن دور نہیں جب یہ سدا بہار کو ”ہمیشہ بہار“، سدا بہار کو

”ہمیشہ بہار“، سدا رچنے کو ہمیشہ رچنے اور معلوم کیا گیا ایک ایسا نیک نام اور زبان کو باوٹھنا

بنادیں گے، ایک قابلِ غور بات یہ ہے کہ نئے نئے کے ہندی الفاظ نکال باہر کر کے جاتے ہیں اور

اُن کی جگہ فارسی عربی کے الفاظ ٹھونسے جاتے ہیں، اپنی طبیعت جتانے اور زبان کو گشتل

سجھا بنانے کے سوا، اور تو کام ہی کوئی نہیں۔ میرے مخاطب فصحاء ہیں (آخر غلبہ افش)

بحث متروکات نور اللغات :-

اس کے بعد اس لفظ کے متروک ہونے کے ناقابلِ قبول قول پر مزید گفتگو کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

مستحقِ مرحوم کے اُستاد کا نام خوب تحقیق کو تو نہیں پہنچا، مگر غالباً آئی ہی کے شاگرد تھے۔

آپ میرے تلامذہ کی تعداد کیا دریافت فرماتے ہیں۔ میں نے کبھی ان کے اسما ضبط نہیں کیے۔ ایک زمانے میں میرے فرزند اکبر محمد احمد قرنی کچھ نام لکھے تھے، یاد پڑتا ہے کہ سو سے زیادہ تھے۔ اس کے بعد سیکڑوں اور ہوئے اور ہوتے جاتے ہیں، اور زندگی باقی ہے تو ہوتے جائیں گے۔ ان سب کی فہرست تیار کرنا محال ہے۔ پہلے سے التزام کیا جاتا تو البتہ ممکن تھا۔ میرے نزدیک مناسب یہ ہے کہ چند نامور شاگرد مثل ریاض و آء و قد و طیل و جلیل و مآبد و سرشار موعظ فساد آزاد وغیرہ کے نام اور پتے لکھ دیجیے اور بہ اعتبار تعداد اسکو ہر لکھیے کہ بے شمار ہیں۔ اُمر میں اول درجے (کذا) نقاب طلائیاشیاں اور موجود ہیں نقاب صفدر علی خاں اور احمد حسین خاں تعلقہ دار پر یا توں ہیں، آخر میں تانکھن خور ہے کہ آپ اپنے تذکرے سے دو جو در قریب مشہور، نقل کر کے بھیجیے تاکہ معلوم ہو کہ آپ نے کن کن طبقات کو لیا ہے اور کس رنگ پر لکھا ہے ؟

[برنامہ نعیم الحق آزاد، ۲۳ جنوری ۱۸۹۲ء، راجہ خزانہ نقوش و خطوط، نبرہ مطالعہ]

(۶۳) گھائل :

”گھائل کو قند میں اکثر شعرا نے بہ فتح یا توزوں کیا ہے۔ شاہ ظفر دہلوی نے آسنی کی تقلید کی، مگر متوسط طبقہ شعرا نے بہ کسریٰ توزوں کیا۔ البتہ اس طبقے میں تجر مروح نے بہ فتح یا کہا ہے اور مجھ سے بالمشافہ یہ ذکر کیا کہ وزن سے لوگوں کو دھوکا ہو گیا ہے، اور حقیقت جندی لفظ ہے بہ فتح یا۔ اُس صحت میں تاجر مروح بھی موجود تھے، اُن کے نزدیک بہ کسریٰ ہی رہا، اور اسنوں نے فرمایا کہ

طبعہ متوسلین میں جمہور شعرائے ہکسر کیا گیا ہے، تقلید انہی کی مناسب ہے اور خود وہ، اور اُن کے اقباء سے میں بھی، ہکسری استعمال کرنا بہتر اور رائج سمجھتا ہوں۔ مگر چون کہ ”بسل“ ان معنوں میں شعرا کو لیا گیا ہے، تو اس کا استعمال کم تر ہے۔ ہاں، جہاں کہیں مطلعے میں ”بسل“ کا قافیہ آگیا ہے، اور ضرورت پڑی ہے کہ دوسرا قافیہ بھی انہی معنوں میں ہو، تو گناہ لیا گیا ہے۔ اشعار سند کے اس وقت یاد نہیں، اور میں عازم سفر ہوں، لہذا مختصراً تجسّس نہیں کر سکتا۔“ (برہام حافظ سید عبداللہ، ارہروی یکم رجب ۱۳۲۵ء)

۱۔ جمال نے بھی یہی لکھا ہے: ”جناب شیخ امداد ملی تبر مغفور کہ ارشد تلامذہ میں سے جناب شیخ ناسخ مرحوم کے تھے، وہ اس لغت کو اپنے تختائی کے فتح سے صحیح فرماتے تھے، اور صندل، غل وغیرہ کے قافیے میں لاتے تھے، لیکن اتفاقاً جمہور نصحاء لکھنو کا لغت مذکور میں اپنے تختائی کے کسرے لکھ رہے یعنی کسور پڑھتے ہیں اور دل، بسل کے قافیے میں لاتے ہیں، اس لیے کہ ان کا قصہ کے لحاظ سے قریب لفظ، فتح یا سمجھے، دہل، اڑیل، سڑیل وغیرہ کی طرح شعرائے اصل کی روایت سے ہلکا یا انعم بھی کیا ہے، لیکن اکثریت کسور یا کوسرچ لکھتی رہی ہے۔ شعرا سے متقدّمین و متوسلین و متأخرین کے دروازین کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اکثر دل اور بسل کے قافیے میں آیا ہے اور کم تر پھل اور گل کے قافیے میں باندھا گیا ہے۔ البتہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ جب ”پھل“ وغیرہ کا ہم قافیہ ہوگا تو سی سے لکھا جائے گا، گھائی، اور جب ”دل“ وغیرہ کے ساتھ آئے گا تو سی کی جگہ ہزہ لکھا جائے گا (گھائی)، اس کے خلاف لکھنا، غلطی اصطلاحاً مرتکب ہونا ہے۔ اس قبیل کے عام ہندی الفاظ کی صورت یہی ہے کہ جب حرف آخر سے پہلے والا حرف مفتوح ہوگا تو سی لکھی جائے گی، جیسے: خرائین، پائی، اور جب وہ کسور ہوگا تو سی کی جگہ ہزہ آئے گا، یعنی خرائین، پائی، اور جو ان گھائی وغیرہ —————
 آئیر کلام خط تاریک نظیر اردو، مؤلف مولانا احسن ارہروی سے اخذ ہے (ص ۵۵۳)

بحر البیان

بحر کائنوی (تلمیذِ تاسخ) کا یہ رسالہ ، جس کا نام بحر البیان ہے ، قواعد اور لغت کے موضوعات سے تعلق رکھتا ہے ۔ قواعد کا حصہ مختصر اور ناتمام ہے ۔ دراصل اس کی حیثیت ضمنی ہے ۔ رسالے کا موضوع ، اُردو مصادر کا بیان ہے ، اور اس لحاظ سے اس کو ”لغات المصادر“ کے ذیل میں رکھنا چاہیے۔ تقدیم زمانی کے لحاظ سے غالباً اُردو میں یہ اپنے انداز کا پہلا رسالہ ہے ۔ اُردو میں متعدد لغت اس رسالے سے پہلے لکھے جا چکے تھے ، مگر یہ انداز کہ اُردو کے مصدروں کو یک جا کیا جائے ؛ اُس وقت تک شاید سامنے نہیں آیا تھا۔ اس رسالے میں مرتب نے حروفِ تہجی کی ترتیب کے بجائے ، سات عروضی ارکان (فعلن ، فاعلن وغیرہ) کو باب بنایا ہے اور مختلف مصدروں کو ان اوزان کے تحت یک جا کیا ہے ؛ یہ نیا انداز ہے ۔ اربابِ تذکرہ نے بحر کی عروض سے واقفیت اور اس فن میں مہارت کا خاص طور سے ذکر کیا ہے ؛ اس رسالے کی یہ عروضی ترتیب بھی اس پر دلالت کرتی ہے ۔ مصدروں کی تعداد کے لحاظ سے یہ رسالہ ”جامع“ کہلانے کا مستحق نہیں ، مگر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس رسالے سے متعدد مصادر کے متعلق ، اور خود مولف کے خدمات کے متعلق کچھ قیمتی معلومات ماحصل ہوتی

ہے۔ نیز بعض مصادر اس رسالے کے علاوہ شاید ہی اور کہیں مل سکیں۔ نکت کے نقطہ نظر سے، اور اس جہد کی زبان پر کام کرنے والوں کے لیے، یہ اہم باتیں ہیں۔ مرتب نے لکھا ہے کہ یہ رسالہ ”اردو کی لکھنؤ“ سے تعلق رکھتا ہے، اور مرتب کا شمار تاریخ کے اہم تلامذہ میں کیا جاتا ہے؛ اس طرح دبستانی نقطہ نظر سے بھی اس کے مندرجات قابل ذکر حیثیت رکھتے ہیں۔ اس رسالے کے مندرجات سے متعلق مزید کچھ کہنے سے پہلے، موات کے کچھ حالات مختصراً لکھے جاتے ہیں۔

شیخ امداد علی، بحر کسوی، شیخ امام بخش کے بیٹے اور تاریخ کے نامور شاگرد تھے [انتخاب یادگار۔ محمود حسن]۔ سال ولادت کسی نے نہیں لکھا۔ اسیر میثانی نے تذکرۂ انتخاب یادگار میں (سال ترتیب: ۱۲۹۵ھ) ان کی عمر ”پینسٹھ برس“ لکھی ہے؛ اس حساب سے ۱۲۲۵ھ کے گنگ بہگ زمانہ ولادت ہوگا۔ ایک عمر کی پریشانی کے بعد، دربارِ رام پور سے متعلق ہو گئے تھے۔ انتخاب یادگار میں نمونہ کلام کے ذیل میں ان کے دو قصیدوں کے چند اشعار بھی لکھے گئے ہیں، ان دونوں قصیدوں کا تعلق دربارِ رام پور سے ہے اور ان میں سے ایک قصیدہ نواب یوسف علی خاں ناظم کی مدح میں ہے؛ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ نواب ناظم کے زمانے میں رام پور کے متوسلین میں شامل ہوئے ہوں گے۔ سارنچ لطیف (قلمی، مخزنۂ کتاب خانہ رام پور) میں اسیر کا کہا ہوا قطعہ تاریخ وفات و بحر موجود ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۷ء) میں ان کا انتقال ہوا تھا۔ قطعہ یہ ہے:

شیخ امداد علی بمسند ز داہر غانی رفت در بارِ جناب، خدمتِ حیدر پرست
 ساختم فکرِ تاریخ و فائش چو اسیر گفت دل: ”تحریر یک لوح بکوثر برسد“
 متذکر کتابوں میں بحر کا سال وفات ۱۳۰۵ھ لکھا ہوا ہے، مگر یہ درست

نہیں۔ یہ لکھنا بے محل نہ ہوگا کہ خود اسیر کا انتقال ۱۲۹۹ء میں ہوا تھا اور اس میں کچھ اختلاف نہیں۔ انتقال لکھنؤ میں ہوا تھا اور کربلا سے سال کٹورا میں دفن ہوئے تھے (آبِ بَقَا)۔ رام بابو کسینا نے لکھا ہے کہ رام پور میں انتقال ہوا تھا، مگر صاحبِ آبِ بَقَا کا قول مرثیہ ہے۔ محمد علی خاں اثر رام پوری (مرحوم) نے مسدس بے نظیر کے حاشیہ ص ۳۷ پر بحر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: "رام پور میں تحقیق کرنے سے بھی بحر کا انتقال رام پور میں ثابت نہیں ہوا۔"

بحر کا دیوان سید محمد خاں رند (تلمیذِ آتش) نے ۱۲۵۲ء میں مرتب کیا تھا، جس کا اعتراض بحر نے کیا ہے :

جامع اس دفتر کے ہیں سید محمد خاں رند
اس سراپا لطف کا یہ بحر پر احسان ہے

(ریاض البحر، ص ۲۸۳)

اس کا نام ریاض البحر ہے۔ یہ تاریخی نام ہے، لیکن یہ چھاپا تھا رند کے انتقال کے بعد ۱۲۸۵ء میں۔ امیرِ بنگالی نے انتخابِ یادگار میں بحر کے نمونہ کلام کے ذیل میں لکھا ہے: "یہ اُن کے کلیاتِ مطبوعہ کا انتخاب ہے"، اور اس ضمن میں اشعارِ غزلیات کے علاوہ، ایک قصیدے کے پانچ شعر، ایک قصیدے کے تین شعر، ایک واسوخت کا ایک بند اور ایک دوسرے واسوخت کے پانچ بند بھی درج کیے ہیں؛ مگر قصائد اور واسوخت، دیوانِ مطبوعہ میں شامل نہیں۔ بحر کے دو واسوخت، واسوختوں کے مجموعے شملہ جوالہ (مرثیہ پیش لکھنوی) میں شامل ہیں۔ بحر کا ایک دیوان غیر مطبوعہ بھی ہے، "اس کا ایک نسخہ کتب خانہ قدابخش پٹنہ میں موجود

ہے“ [قاضی عبدالودود صاحب - تحریک ، غالب نمبر ، اپریل ۱۹۷۷ء] ۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی مرحوم نے ، تذکرۂ آبہ بقا میں ، بحر کے مفصل حالات لکھے ہیں ، اُن میں سے کچھ باتیں دوسری کتابوں میں بھی ملتی ہیں ؛ ذیل میں خواجہ صاحب مرحوم کی عبارت کے کچھ اجزا کو اقتباس کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے :

”توپ دروازے کے رہنے والے ، شیخ ناتج مرحوم کے شاگرد رشید ، سیاہ فام ، ڈبلے پتے ، میاں قد تھے ۔ تحقیقِ نفت اور صحتِ الفاظ ہندی میں مشہور استاد لوگ اُن کی زبان کو سنا مانتے تھے ۔ ہمیشہ محاورات کی تلاش رہتی تھی ۔ نواب سید محمد خاں رند ، آتش کے شاگرد ، اُن کے بہت قدر دان تھے اور کچھ خدمت بھی کیا کرتے تھے ۔ چوٹی شہزادی اشرف النساء بیگم افسر بہو صاحبہ ، دخترِ حضرت امجد علی شاہ بادشاہ کی سرکار سے کچھ قلیل و غلیظ پاتے تھے ۔ فیون کا استعمال کیا کرتے تھے ۔ عیش باغ کے میلوں میں اکثر جاتے تھے ۔ زندگی بہت عسرت سے بسر ہوتی تھی ۔ میاں بحر داڑھی کا ہمیشہ صفایا رکھتے تھے ۔ نواب ہندی علی خاں مرحوم عمر ، تلمیذِ بحر کہتے تھے کہ جس وقت ہم شاگرد ہوئے ہیں ، استاد ، چوٹی شہزادی کی ڈیوڑھی پر رہتے تھے ۔ پھانک کی بٹل میں ایک کرا ہے ، اُس میں فیون گھلا کرتی تھی اور ایک کونہ چٹائی بکھی رہتی تھی ۔ تحقیقِ الفاظ کو لوگ دور دور سے آتے تھے ۔ دن بھر ڈیوڑھی پر رہتے تھے ، شام کو اپنے مکان پر جاتے تھے ۔ توپ دروازے پر ایک کپا مکان تھا ، اُس میں رہتے تھے ۔ لڑکا کوئی نہ تھا ،

بیوی تھیں اور آپ تھے — حکیم میرزا من علی ہلال مرحوم بعد رشک
اسٹی سے مشورۂ سخن فرماتے تھے۔ نواب ملیان خاں صاحب اسد
فرماتے ہیں کہ بحر کو ہم نے بارہا دیکھا، آواز میں سنت رشتہ تھا، غزل
خود نہیں پڑھتے تھے، میاں فہیم اُن کے شاگرد پڑھتے تھے۔ عروض
اچھی طرح جانتے تھے اور اس فن پر بہت ناز تھا۔

ایک معاصر کا مختصر بیان بھی اس کی تائید کرتا ہے: "علم عروض وقافیہ خوب جانتے
ہیں۔ بہت لوگ ان کے شاگرد ہیں۔ آواز میں رشتہ ہمیشہ سے تھا۔ اب یہ وجہ
ضعف رشتہ زیادہ ہو گیا، اس سبب سے شعر پڑھنا کم کر دیا" [مجموعہ سخن، حصہ
دوم، ص ۱۱۹]۔ نسیخ نے بھی سخن شعرا میں عروض وقافیہ سے اُن کی اچھی
واقفیت کا ذکر کیا ہے: "عروض وقافیہ میں اچھا دخل رکھتے ہیں۔"

بحر کے ایک لغت کا ذکر کئی حضرات نے کیا ہے، لیکن یہ لکھا ہے کہ غالباً وہ
مکمل نہیں ہو سکا۔ صاحب گلِ رعنا نے لکھا ہے: "لوگ کہتے ہیں کہ اردو کا
ایک لغت لکھنا شروع کیا تھا، اُن کے مزاج کو دیکھتے ہوئے، اس کی کیا توقع کر

لے یہ ایک انتخاب ہے جس کو طلبہ مدارس کے لیے مرتب کیا گیا تھا۔ "مجموعہ" ص ۱۱۸
کالم ۱۷۔ آخر ہونٹک ڈاکٹر آف ہیگ انٹرکشن ملک اودھ، پنڈت کیوں نرینا
ژینٹ انیکٹر عاربی طبع لکھنؤ نے، بہ اعانتہ فضیلت حکیم الامں صاحب بیڈ ماسٹر
چوک اسکول، و ضعیف فلام مسینا قدر بیڈ ماسٹر ہونا اسکول ضلع لکھنؤ، واسطے
طلبہ عاربی ملک اودھ کے ترتیب دیا۔ "فضیلول مشورہ کے ملبوس عیشہ میں چھا
تھا۔ مختلف خدمات کے تحت مشہور شعرا کی غزلیں نکلیں، جمع کی گئی ہیں۔ آخر میں کچھ
شعرا کا حال بھی لکھا گیا ہے۔

اُسے پورا کیا ہو۔ صاحب تذکرہ آب بقائے لکھا ہے : ”جب دیوان چھپ چکا تو ایک نکت کی تصنیف میں مصروف ہوئے۔ خدا جانے اُس کو تمام کیا یا ناتمام رہ گیا۔“ کتاب غاز رام پور کی فہرست مخطوطات میں بحرالبیان نام کی ایک کتاب پر نظر پڑی۔ خیال آیا کہ ممکن ہے یہ وہی نکت ہو جس کا ذکر کیا گیا ہے، دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہی ہے۔ یہ اصلاً ایک رسالہ ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے : حصہ اول، قواعد زبان سے متعلق ہے، اور دوسرا حصہ، اردو مصادر اور کچھ محاورات و کنایات پر مشتمل ہے۔ مولف نے آغاز ہی میں لکھا ہے کہ : ”اس رسالہ رست مستی بہ بحرالبیان، مصنف ابدالعلی متخلص بہ بحر، پند قوانین ہندی یعنی اردو لکھنؤ، بطریق صرف و نحو بہ تحریر آورده۔“

یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض رسائل میں ایسی باتیں بھی مل جاتی ہیں جو بہت کام کی ہوتی ہیں۔ بحر کا زمانہ قواعد زبان و قواعد شاعری کے بہت سے اہم مباحث کا زمانہ ہے۔ دستان لکھنؤ کی اکثر پابندیاں اسی زمانے میں معرض وجود میں آئیں۔ اس دور پر ابھی بہت کم کام کیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُس زمانے کے لسانی مباحث پر کام کرنے والوں کے لیے یہ رسالہ مفید ثابت ہوگا۔ جو لوگ اُس عہد کی زبان اور مصاویز کے معانی اور اُن کے اجزا کی ترتیب پر کام کرنا چاہیں گے، اُن کے لیے اس رسالے کا مطالعہ از بس ناگزیر ہوگا۔ ناسخ کے تلامذہ میں قواعد وضوابط کے واضح کی حیثیت سے رشت کا نام سر فہرست آتا ہے۔ اکثر پابندیاں، جن کو ناسخ سے منسوب کیا جاتا ہے، وہ دراصل رشت ہی کے نتائج افکار ہیں۔ رشت کے بعد، فہرست میں بحر کا نام آتا ہے۔ اتفاق یہ ہے کہ ناسخ کے ان دونوں اہم شاگردوں نے نکت کے موضوع پر اپنی تحریروں کو اپنی یادگار کے طور پر چھوڑا ہے۔ رشت کا نکت نفس اللغة، مکمل شائع نہیں ہو سکا، مگر جس قدر بھی پچھا

ہے ، وہ اس عہد کی زبان کے لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے ۔ بحر کے گویا قاعدہ لغت نہیں لکھا ، مگر اُن کا یہ رسالہ جو لغات المصادر کے ذیل میں آتا ہے ، لغت ہی کے قبیلے کی چیز ہے اور اس لحاظ سے منفرد اور ممتاز ہے کہ اس موضوع پر اس انداز سے اس وقت تک اردو میں شاید کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی ۔ اس رسالے میں متعدد مصادر ، املا اور معانی کے لحاظ سے ، لسانی اہمیت رکھتے ہیں اور لغت نویسی کے ذیل میں ایسے مطالعوں کی خواہمیت ہے ؛ اس سے متعلق افراد بہ خوبی واقف ہوں گے ۔

دو چار مثالوں سے مندرجہ بالا قول کی وضاحت کی جاتی ہے ، مصدر ”سوچنا“ کو مع ”نویں“ غٹ لکھا گیا ہے ، اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مصدر میں غٹ آواز کا شمول مض عوام سے متعلق نہیں ، معتبرین بھی اس صورت کو مانتے تھے ۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لہجہ کی ایسی کارفرمائی نہیں جو تحریری سطح پر کبھی قابل قبول ہی نہ رہی ہو ۔ اس سے اتفاق کیا جائے گا کہ اس عہد کے لیے بھی ، اور کلام بحر کی تدوین کے لیے بھی ، یہ معلومات قابل ذکر حیثیت رکھتی ہے ۔ مصدر ”ٹھیرنا“ کو مع ”تی“ لکھا گیا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ”ٹھیرنا“ اور ”ٹھیرنا“ دونوں صورتیں لکھنؤ میں بھی پائی جاتی ہیں ۔ بحر کے دیوان ریاض البحر میں ، تی کی ردیف میں ایک غزل ہے جس کی ردیف ہے : ”ٹھیرے“ (ص ۲۷۳) ۔ بحر کے کلام میں تو اس مصدر اور اس کے مشتقات کو مع ”تی“ (ٹھیرنا ، ٹھیرا وغیرہ) لکھا ہی جائے گا اور تدوین کے نقطہ نظر سے یہ اہم معلومات ہے ؛ مگر اس کے علاوہ ، لغت کے لحاظ سے بھی اس معلومات کی اہمیت ہے ۔

”پیلنا“ کے ذیل میں صراحت کی گئی ہے کہ : ”بعض بایں معنی ۔ بھای لام ، حرف راسی قرشت استعمال کنند ۔“ یعنی اس مصدر کی دو صورتیں

ہیں : پیلٹا اور پیرنا۔ فرہنگِ آصفیہ و نوراللفات میں صرف "پیلٹا" ہے —
 "بٹنا" جس کا فارسی مرادف "بافتن" ہے ، زیادہ تر چشمِ اول بولا جاتا ہے ۔
 فرہنگِ آصفیہ و نوراللفات میں بھی اس کو چشمِ اول ہی لکھا گیا ہے ؛ مگر بحر نے
 اس کو "بافتن" کے معنی میں صرف "پکسر" لکھا ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ
 کچھ لوگوں کی زبان پر جو اس مصدر کے بعض مشتقات پکسر اول ہیں ، وہ محض
 بے اصل نہیں ، بل کہ یہ اختلاف بجائے خود پایا جاتا ہے ۔ نفث نویسی کے لحاظ
 سے اس کی جواہریت ہے ، اُس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ۔

"جنموٹنا" کو پکسر اول لکھا گیا ہے ۔ نوراللفات میں یہ صراحت نہیں
 ملتی ، بل کہ اُس میں حرفِ اول کی حرکت کی صراحت ہی نہیں کی گئی ہے ۔ آصفیہ
 میں حرفِ اول پر زبر لگا ہوا ہے ۔ تلفظ کے ایسے اہم اختلافات ، مختلف ساقی
 مباحث کے لیے بہت کار آمد ہوتے ہیں ، اور نفث میں ایسی تفصیلات کا
 جس طرح ذکر کیا جاتا ہے ، اُس کے لحاظ سے یہ اختلاف اہمیت رکھتا ہے —
 یہی صورت "سستانا" کی ہے ۔ نوراللفات میں اس کو "بفتح اول"
 لکھا گیا ہے ، عام طور پر مستعمل بھی اسی طرح ہے ؛ مگر بحر نے اس کو بفتحِ اول
 و چشمِ اول ، دونوں طرح لکھا ہے (سستانا - سستانا) ۔ یہ اختلاف
 حرکت بھی نفث کے لیے اہمیت رکھتا ہے ۔

چکلانا ، "بفتح" ، بمعنی چوڑانا ؛ ڈھبٹانا ، "پکسر ہر دو دالِ ثقیل ،
 نواختنِ دہ کوپک" ؛ مٹھانا ، "برہم زدہ چشمِ پھونوگی" ؛ چپینا ، "بتای
 ثقیل و بای فارسی ، بمعنی ارتسام و طبع ، چوں تھر بر کاغذ" ؛ یہ مصادر
 نوراللفات میں موجود نہیں اور میرا خیال ہے کہ اس رسلے کے سوا یہ اور کہیں بھی
 شاید ہی مل سکیں ۔ آصفیہ میں "چکلانا" موجود ہے ، مگر مختلف معنی میں ؛

”چکل اٹھاتا، کسی پودے کو مٹی سمیت اٹھاتا۔“ یہ مختلف مصدر ہوا۔

نور اللغات میں ”پتھر کا رتا“ کے معنی لکھے گئے ہیں : ”کتا پیچے دوڑاتا۔“

سینٹی بھانا۔ بحر البیان میں اس کے معنی ”دوانید بن اسپ باوا بن راندن“ لکھے ہوئے ہیں۔ یہ بھی قابل ذکر اختلاف معنی ہے۔ بحر نے ”اردوسی کائنات“ کی جو تفسیر کی ہے، اس نے اس رسالے کی اہمیت بہت بڑھادی ہے۔ متعدد مصادر کے ذیل میں اس کو دیکھا جاسکتا ہے، مثلاً ”تروتا“ اور ”دانا“ زبان کائنات سے متعلق مصادر ہیں۔ تور میں بھی اس کی صراحت کردی گئی ہے۔ آصفیہ میں یہ مصدر موجود نہیں۔ بحر البیان میں یہ دونوں مصدر موجود ہیں اور بحر البیان، نور اللغات سے بہت پہلے لکھی گئی تھی۔ ”تروتا“ کے ذیل میں نور اللغات میں یہ طوطا سند بحر ہی کا شعر لکھا گیا ہے۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، قواعد کا حصہ مختصر اور ناتمام ہے۔ بحر نے زیادہ توجہ مصادر پر صرف کی ہے۔ قواعد کے موضوع پر جلال کا رسالہ نسبتاً مفصل ہے؛ مگر بحر کے اس رسالے میں، قواعد کے ذیل میں بھی بعض اہم باتیں مل جائیں گی اور اس اعتبار سے یہ ناتمام حصہ قواعد بھی قابل توجہ قرار پاتا ہے۔ مثلاً بحر نے حرف جیم کے ذیل میں لکھا ہے :

”در شش کلمہ برای رفع ثقات ی آید، چوں : یسعی و ریجی و

پیسے بہت آنگہ اجماع یہ یای تسمانی شدہ است و خواندن

آں دشوار، لہذا حرف جیم واقع شدہ، کلمہ فصیح گردید“

جلال کے رسالے میں یہ بات مذکور نہیں، اور یہ اہم بات ہے۔ ضمنی طور پر اس صراحت سے صحت و اطمینان کے اس قاعدے کی بھی توثیق ہوتی ہے کہ ایسے تعظیفات افعال میں آخری دو حرف، جی ہیں۔ اسلافین جی تھیں، پہلی جی کی جگہ

ج آگیا، دو تہا باقی رہیں۔ یعنی صحیح اطلاق یہی ہے (دیج یا یہ) ہے، اس کو ”دیجے“ (دیج، ے) نہیں لکھا جائے گا۔

بعض حضرات نے معائبہ شاعری کے ذیل میں یہ بات بھی لکھی ہے کہ عربی و فارسی کے جن الفاظ کے آخر میں ہائے مفتی ہوتی ہے؛ اُن کو اس طرح نظم کرنا کہ ہائے مفتی، الف کی طرح آواز دے؛ داخل معائبہ ہے۔ تخر نے ایک جگہ بڑے چتے کی بات لکھی ہے کہ: ”حرف ہا، بمنزلۃ الف است در محاورۃ ہندیاں۔“ اور اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بعض حضرات کا وہ قول ”محاورۃ ہندیاں“ پر توجہ نہ دیئے گائیں۔

تخر نے مرکبات کے ذیل میں جھاردار، انگلیٹس بردار، چوڑ باز، جیسے متعدد مرکبات بطور مثال لکھے ہیں؛ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اور اہل نظر کی طرح وہ ایسے مرکبات کو ”ہند مرکبات“ کے نام پر غلط نہیں سمجھتے تھے، بل کہ وہ ایسے مرکبات کو زبان کا جز سمجھتے تھے۔ اسی طرح سمیت، ٹمک، جیسے الفاظ، جن کو بعد والوں نے متروک قرار دیا؛ اُن کو تخر نے مستعمل اور فصیح الفاظ کی طرح درج کیا ہے۔ تخر نے ”ٹمک“ اور ”ٹمک“ دونوں کو مستعمل لکھا ہے۔

مختصر یہ کہ یہ رسالہ کئی اعتبارات سے قابل توجہ ہے، اور اس قابل ہے کہ گفت نویسی کے سلسلے میں اس کے مندرجات کو سامنے رکھا جائے۔ یہ ایک ایسے شخص کی تحریر ہے جو اپنے زمانے میں مستند حیثیت رکھتا تھا اور اس زمانے کی تحریر ہے جب زبان لکھنؤ کا نقش درست ہو رہا تھا۔ انہی اعتبارات کے پیش نظر، اس متن کو شائع کیا جا رہا ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ زبان و بیان کے بعض مسائل کی افہام و تفہیم میں اس کے مندرجات سے قابل قدر مدد ملے گی۔ اس کا مخطوط رضا لاہوری، رام پور میں محفوظ ہے، جو مضبوطی و امان کا

پر لکھا ہوا ہے۔ خط پختہ اور روشن ہے۔ سرخیاں شگرفی ہیں اور عبارت میں بھی خاص خاص لفظوں کی یہی صورت ہے۔ جس طرح اس کی کتابت کی گئی ہے اس سے بظاہر یہ خیال ہوتا ہے کہ کسی خاص مقصد کے تحت اہتمام سے کام لیا گیا ہے، اگرچہ خطوط میں ایسی کوئی صراحت موجود نہیں۔ کتابت کی افلاط بھی کچھ نہ کچھ موجود ہیں، جیسے: "کشیف" کی جگہ "کشیف" وغیرہ۔ الف مدودہ پر کہیں مد ہے اور کہیں نہیں۔ باب فعلن کے ذیل میں "آنا" کو "انا" لکھا گیا ہے، مگر اور مقامات پر الف مدودہ کی متعارف صورت (آ) ملتی ہے۔ پیش کے انبار کے لیے اکثر مقامات پر، قدیم طرز نگارش کے مطابق، واو لکھا گیا ہے، جیسے: ادس، اوژنا وغیرہ۔ کتابت کا عام انداز جو اس زمانے میں تھا، وہ اس میں بھی موجود ہے۔ "پانو" کا اٹا ہر جگہ "پاؤں" ہے۔ لکھنؤ والے اس لفظ کا یہی اٹا مانتے تھے۔ خاص بات یہ ہے کہ واو کو ہمزہ کے بغیر لکھا گیا ہے۔ ہمزہ اور بہت سے ضروری مقامات پر بھی نظر نہیں آتا اور کہیں ملتا بھی ہے۔ اس طرح کی کم اقساطیاں یا انتشار، اس زمانے میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ الف مدودہ پر کہیں مد ہے اور کہیں نہیں۔ نقطوں کا بھی یہی حال ہے۔

عام طور پر اٹا میں صحت اور روشنی حال کو ملحوظ رکھا گیا ہے، البتہ خاص خاص مقامات پر اصل صورت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ "پاؤں" کو ہر جگہ "پاؤں" لکھا گیا ہے۔ الف مدودہ پر ہر جگہ مد لکھا گیا ہے۔ نکات کے مرکوزوں کی بھی یہی صورت ہے۔ البتہ "انا" کو اسی طرح رکھا گیا ہے۔ پیش کے انبار کے لیے جن لفظوں میں واو کو لکھا گیا تھا، ان کو ٹونا واو کے بغیر لکھا گیا ہے۔ البتہ جن الفاظ و مصادر میں، تشریح کے ذیل میں، اس واو کا ذکر آ گیا ہے۔

وہاں قاد کو ضرورتاً لکھا گیا ہے، مثلاً "اوژنا" کو مخطوط میں اس طرح لکھا گیا ہے: "اوژنا" بضم و واو مشموم، پریدن۔ "ظاہر ہے کہ تشریح میں "واو مشموم" کا ذکر آگیا ہے، اس لیے یہاں "اوژنا" لکھنا لازم ہوا۔ املا کی روش حال کے مطابق رموز اوقات کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔

مخطوط میں متعدد جگہ کچھ قلم زد عبارتیں بھی ہیں۔ اُن عبارتوں کو قلم زد ہی سمجھا گیا ہے۔ جن مقامات پر یہ خیال ہوا کہ لغزش قلم نے غلط نگاری کا ارتکاب کیا ہے، ایسے مقامات پر صحت کو ملحوظ رکھا گیا ہے، مگر سستی کے ساتھ اس کی پابندی کی گئی ہے کہ صرف نہایت صریح غلطی تک اس کو محدود رکھا جائے اور خواہ خواہ قیاسی تصحیح سے کام نہ لیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ کئی مقامات پر "کذا" لکھنا پڑا ہے۔ بعض مقامات پر نہایت ضروری اجزا پھوٹے ہوئے

معلوم ہوئے، ایسے مقامات پر ربط عبارت کے لحاظ سے، قوسین () میں ضروری اضافے کیے گئے ہیں۔ مخطوطے میں اگر کہیں کوئی لفظ قوسین میں تھا، تو اُس کو ایسے قوسین [] کے درمیان لکھا گیا ہے۔ اس کا اظہار ضروری ہے کہ فارسی عبارت نہایت معمولی درجے کی ہے، بل کہ متعدد مقامات فارسی کے لحاظ سے محل نظر بھی معلوم ہوتے ہیں؛ مگر موقوف نے فارسی دانی کا کہیں دعوا بھی نہیں کیا۔ اس کے علاوہ، اس رسالے کا مطالعہ موضوع کے لحاظ سے کرنا چاہیے، زبان کے لحاظ سے نہیں۔ چوں کہ اُس زمانے میں یہ روایت عام تھی کہ ایسی تحریروں کو فارسی میں لکھا جائے، اس لیے موقوف نے بھی اُسی کی پیروی کی۔ موقوف کی حیثیت اُردو کے لحاظ سے "اہل زبان" کی تھی، اور اس حیثیت پر شک نہیں کیا جاسکتا، اور یہی اصل بات ہے۔ رسالے کے آغاز میں حمد و ثناء و منقبت پر مشتمل ۲۹ اشعار میں اُن کو چھوڑ دیا گیا ہے۔

ایں رسالہ است مسمیٰ بہ بحر البیان - مصنف اسرار علی ، متخلص بہ - تکر ، چند
قوائیم ہندی یعنی اردو لکھنو ، بہ طریق صرف و نحو بہ تحریر آورده ، بہ چند موج -

موج اول :

ہاں کہ جملہ کلام زبان زد خاص و عام ، بہ قسم اند : اسم و فعل و حرف —
اسم ، کلمہ است مستقل معنی باشد فی نفسہ ، چوں : گداو و خر و سنگ و شجر -
فعل ، کلمہ است کہ در معیش یکے زمانہ یافتہ شود : ماضی یا حال یا استقبال -
چوں : آمد وی آید و خواہد آمد - و در ہندی : آیا و آتا ہے د آئے گا -
حرف ، آنست کہ معیش بلا ضمیمہ ضمیمہ مفہوم نشود - چوں : در و بر - اوپر و
تلی - میں و بیچ و سے و سمیت و جو و تک و ہاں و ہوں و سوای آن -
مصدر ، آنست کہ ماضی باشد و افعال متصرفہ از آن اخراج یا بندہ ، یعنی صیغہ
ماضی و حال و استقبال و غیرہ - و مصدر در ہند نہ اند : یکے اصلی و یکے
جملی و یکے مزیدی و حاصل بالمصدر - و آن ہر بہ معاد بہ اعتبار حروف
چہار اند : یکے ربائی و دوم خماسی و سوم سداسی و چہارم سبائی -

و باعتبار وزن عروضی هفت اند ، بریں اوزان : فعلن و فاعلن و فاعولن و
مفاعلن و مفعولن و مستفعلن و فاعلاتن ۔

پس مصدر اصلی کہ بر وزن فعلن است ، یک حرف درو زائد نیست ، چوں :
آنا و بانا و کھانا و پینا و سونا و جاگنا ۔

مصدر جعلی آنست کہ مرکب باشد از فارسی و ہندی ، چوں : خریدنا و قبولنا
و تراشنا و لرزنا و شرمانا و ہنشنا و گزرنا و فرمانا ۔

مصدر مزید کی آنست کہ صیغہ امر برود افزایند ، چوں : کر بیٹھنا و بول اٹھنا
و تڑپ بانا و درودینا ۔ و وزن برای آں میثمن نیست ۔

حاصل بالمصدر بہ ہر حرف (کنا) مشترک است : یکے بہ تاجی قرشت ، چوں :
گھڑت و جرٹ و چاہت و بادشاہت ۔ و یکے بہ تاسی ثقیل ، چوں :
بناوٹ و سہاوٹ و دُکاوٹ و گھبراہٹ ۔ و یکے بہ سین سفص ، چوں :
مٹھاس و کشاس و ہنگاس و مٹاس و پیاس ۔ و یکے بہ فون ، چوں :
تڑپمن و چلن و الجھن و رن ۔

و مصادر فعلن بہ ہر سہ حرکت ، چوں : کھنا و رہنا و دینا و لینا و مینا و
پینا و ہونا و رونا ۔

و مصادر فاعلن نیز بہ ہر سہ حرکت ، چوں : مارنا و گھاڑنا و پھیرنا و
گھیرنا و موڑنا و توڑنا ۔

و مصادر فاعولن نیز بہ ہر سہ حرکت ، چوں : بلانا و منگانا و چھپانا و
چلانا و اُچھلانا و اُبلانا ۔

و مصادر فاعلن نیز بہ ہر سہ حرکت ، چوں : پھکارنا و سنوارنا و
کھانا و بگاڑنا و پکارنا و آبھارنا ۔

و مصادر مفعولن نیز به هر سه حرکت ، چوں : سهلانا ، بهلانا ، اترانا ، دکھلانا ،
مرجھانا ، کھلانا .

و مصادر مستغفلن هم به هر سه حرکت ، چوں : پهچانا ، چکھانا ، تل بیٹھنا ،
سر کیلانا ، پکارنا ، سسکانا .

و مصادر فاعلاتن نیز به هر سه حرکت ، چوں : کرکراتا ، جھلجلاتا ، بلبلاتا ،
بچکپاتا ، کلکلتا ، سرسراتا .

و چهار حرف که مخلوط التلفظ کنند ، نقل وزن نیست ، و آں این است :
ن ، و ، د ، ی . مانند نون غنة و واو مشهور ، که در فارسی نمی آیند ، چوں :
خواب و خور و ناں و جاں . و هشت حروف در فارسی نمی آیند ، و
آں این است : ث ، ح ، ص ، ض ، ط ، ظ ، ع ، ق . و چهار حرف
در عربی نمی آیند ، و آں این است : پ ، چ ، ژ ، گ . و نه حرف در
هندی نمی آیند ، و آں این است : ث ، ح ، ذ ، ص ، ض ، ط ، ظ ،
ع ، ق . و چهار حرف که از لهجه زبان پیدا می شوند ، و آنرا حروف مشهور
گویند که بالا مذکور شد . و مثال ن ، چوں : ڈانک و ٹانک ، هر دو
بر وزن پاک . و مثال و ، چوں : کواری و جواری ، هر دو بر وزن
یاری . و مثال ق ، چوں : گھرو دھر ، هر دو بر وزن زر . و مثال
جی ، چوں : پیارا و پیاسا ، هر دو بر وزن دارا .

و بنای زبان عربی منصرف است بر بست^{۲۸} و هشت حروف . و بنای زبان
فارسی منصرف است بر بست^{۳۳} و چهار حروف . و بنای زبان هندی بر
نش^{۳۴} حروف ، مخ حروف مشهور و حروف ثقیل ، یعنی ث و ذ و ژ .

موج دوم در تقسیم حرف :

ہاں کہ اَلتَّ در آخر افعال ، علامتِ ماضی مذکر است ، چوں : اُٹھا و بیٹھا و دیکھا و سنا ۔ و در آخر اسم ، علامتِ مذکر است ، بشرطِ کہ بمشخص مضارع یا ہی بھول باشد ، یا و نون نباشد ، چوں : گھوڑا و گدھا و کالا و گھورا ۔ و گھا ہے برای تمقیر می آید ، چوں : کھوا و بدھوا و سٹھا و مٹھا ۔ و گھا ہے برای تعداد ، چوں : پہلا و دوسرا و تیسرا و چوتھا و پچھا ۔ سوای این پنج مقام نمی آید ۔

و گھا ہے میان دو کلمہ برای اتصال می آید ، چوں : بھاگا بھاگ و مارا مار ۔ و گھا ہے در مصدر برای تعدیہ می آید ، چوں از سبھنا ، بکھانا ۔ و از اُٹھنا ، اُٹھانا ۔ گھا ہے در اول کلمہ برای نفی می آید ، چوں : الگ و اہمت و اشک و امٹ ۔ و گھا ہے در آخر اسم برای مفعولیت می آید ، چوں : گنڈیا و لتیا و ڈکيا و سٹکيا ۔

حرفِ تَ : برای حاصل بالمصدر ، کہ بالا مسطور شدہ ، چوں : پنت و بنت ۔ و علامتِ تانیث است در الفاظِ عربی و فارسی و ہندی ، چوں : دولت و ثمت و ثروت و عنلت ۔ و خلعت و شربت ، کہ در استعمال مذکر اند ، شاذ اند ۔

حرفِ جِیم : در شش کلمہ برای رفع ثعلات می آید ، چوں : کیجی و یجی و پجی و دیجی و ہجی و بیجی ۔ بہت آں کہ اجماع سہ یای تھائی

۱۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان افعال میں اصل تین ہی کا اجتماع تھا ، تاکہ آئے (باقی اگلے پر)

شدہ است و نخواندنِ آں دشوار؛ لہذا حرفِ جیم واقع شدہ، کلمہ فصیح گردید،
چون نوین وقایہ در عربی۔ و اگر لفظ ”کیجیے“ را ”کرے“ خوانند، نہایت
مجاورۂ فصاحت۔

حرفِ سین : برای حاصل بالمصدر آید، کہ مذکور شد، چون : نبواس و
مشاس۔ و در اول کلمہ برای تحسن و خوبی می آید، چون : تمیل و سُدول،
ہر دو بہ ضم۔

حرفِ کاف : برای مفعولیت در آخر کلمہ می آید، چون : لے پالک و
شندک و پشک و کالک۔ و گاہے برای تصریح، چون : ڈھولک۔
و گاہے برای مشارکت میان دو کلمہ، چون : مارک مارا و نوپک ناچا۔
و گاہے برای نفی، چون : کلیل و کڈھب و کڑاہ، ہر سہ بہ ضم۔

سے آخر میں دو تہی باقی رہ گئیں؛ اس لیے ”کجئے“ یا ”درجئے“ یا ”بجئے“ لکھنا غلط ہو گا۔
صحیح اظہار گنا : ”کجیے (ک جا ی ہے) ، درجیے (دی جا ی ہے) ، و بجیے۔“
لفظ نگاری اکثر دیکھنے میں آتی ہے کہ ایسے ”تعطیل افعال“ میں آخری ”یے“ سے
پہلے ایک حدِ جزوہ کو داخل کر دیا جاتا ہے اور یہ بالکل غلط طرزِ نگارش ہے۔ ایسے افعال
کے آخر میں ہمیشہ دو تہی آئیں گی۔ جیسے : درجیے ، کجیے ، پڑجیے ، دیکھیے وغیرہ۔
”کالک ، قلیل سی سیاہی کو کہتے ہیں“ جلال (قواعد المتکب ، ص ۵) مگر استعلا
تصغیر کی قید باقی نہیں رہی، عام لفظ کے طور پر کسی اس کو استعمال کیا جاتا ہے۔ نورالغات
میں رند کا ایک شعر اس لفظ کے ذیل میں، طبعِ مثال لکھا گیا ہے اور اس سے اس کا بھی ثبوت
ہوتا ہے۔ شعر یہ ہے : شبِ فراق کی کالک سے دم نکلتا ہے ؛ اپنی حالت ہوئی یا کوئی بلا آئی۔

حرف نون : در آخر اسم علامت تانیث است ، چوں : رحمن و کریم ۔
 و گھا ہے علامت زوج ، چوں : تیلن و تنبولن و دلمن و سمدھن ۔ و
 گھا ہے در آخر صیغہ امر برای حاصل بالمصدر آید ، چوں : جلن و مرن
 و دمرکن و پھینن ۔ و گھا ہے در آخر صیغہ ماضی پہاں معنی آید ، چوں :
 اٹان و آشان و چلان و لگان ۔ و گھا ہے برای مفعولیت آید ، چوں :
 کمرچن و پھنکن و چھیلن ۔ و بر افعال و اسما حرف فعلی است ،
 چوں : خدیا ، ذلیا ، ذجائے گھا ، ذآئے گھا ۔ نذر ، نبل ۔
حرف لام : در مصدر برای تعدیہ می آید ، چوں : از دینا ، دلانا و

۱۔ اسموں کے قبل توہی فعلی محسوس ہوتا ہے ، جیسے : رومروک ، بکتا ، بگھوڑا وغیرہ ۔ اور افعال
 کے اول "ذ" آتا ہے ۔ یہ صراحت ضروری تھی ۔ تحریر نے آگے چل کر خود بھی "نہیں" اور
 "ذ" کو درج کیا ہے اور لکھا ہے : "بفتح" ہر دو تانیث اند" ، اور پہاں پر "ذ" کا اندراج
 بالکل ٹھیک ہے ۔ یہ ہر صورت ، اسموں کے قبل آنے والا توہی محسوس ، جو فعلی کے واسطے
 آتا ہے اور "ذ" سے یوں مختلف ہے ، جو افعال کے شروع میں آتا ہے کہ وہ مفتوح ہوتا ہے ۔
 ۲۔ جتنا کہ لے بجا طور پر اس صورت کو "تعدیہ صرف" سے موسوم کیا ہے ، یعنی "دلانا" وغیرہ
 میں تعدیہ محض ہے اور یہ لام ، "کہیں قبل الف" تعدیہ کے اگر ، فائدہ تعدیہ کی تاکید کا
 دیتا ہے ، جیسے : دکھانا سے دکھلانا ، بکتانا سے بکتلانا ، بٹھانا سے بٹھلانا ۔
 (قواعد النسخ ، ص ۱۹) ۔ یہ حوالہ اس لیے دیا گیا کہ کھنڈ کے بعض اساتذہ حاترین
 نے "دکھلانا" ، "بکتلانا" جیسے افعال کو متروک قرار دیا ہے ، ملاں کہ یہ قول جلال
 ابن سے تعدیہ کی تاکید کا فائدہ حاصل ہوتا ہے ۔ جلال نے اس سلسلے میں مزید لکھا ہے :
 (باقی اگلے صفحہ پر)

از کھانا، کھلانا و از پینا، پلانا۔

حرف بیسم : در دو کلمہ برای مشاکت می آید، چوں : وحکم دحکا، گنوم گھانا، کشتہ کشتنا۔

حرف واو : واو معروف در آخر کلمہ علامت مذکر است، چوں : پدحو و کتو و پیرو۔ و گاہے گاہے برای فاعلیت آید، چوں : کساو و لساو و کساو و ذاکو۔ و واو مجهول در آخر امر حاضر برای جمع تعظیفنا آید، چوں : آو و باو و بیشو و آشو۔ و گاہے برای ماضی حاصل بالمصدر، چوں : دکھاو و بچاو و چڑھاو و گھاو۔

”یہ جو بیسے فصحاء متاخرین ان مصادر کو اپنے نزدیک زائد و بے کار سمجھ کر، ان کے استعمال ہی کے نظم و نثر میں مانع ہیں، ان کی غلط فہمی ہے۔ ہرگز یہاں لام زائد و بے کار نہیں۔ ہاں خود ان کو اپنے مقام پر ان مصادر کے استعمال کے ترک کر دینے کا اختیار ہے، کہ ہر ایک اپنے طور پر اخذ و ترک العناء کا حق ہے۔“ (الہذا) آرزو لکھنوی مرحوم کا شعر یاد آیا :

نیرنگ نہ دکھلانے اگر جلو یک رنگ وہ کون ہے، کجے کو جو بت غا زبنا دے

(جہان آرزو، ص ۱۶۰)

جہاں نے آخر میں آنے والے اس واو کی عین قسمیں کی ہیں : معروف، مجهول، موقوف۔ یہ نہایت مناسب تقسیم ہے، کیوں کہ دکھاو، بچاو و غیرہ حاصل مصدر دی کے آخر میں آو موقوف ہی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو ”دکھاو“ یا

حرفِ یاء : یای مرفوعہ در آخر اسم علامتِ تانیث است ، چوں : ثوبی ،
 یغزی ، کزکی [دروازه کو چک] - و در افعال ماضی موقوت است ، چوں :
 مشائی کھائی و کھائی دکھائی - گاہے برای فاعلیت ، چوں : تیلی و تنبولی
 و جیبی - و گاہے برای نسبت ، چوں : پڑوسی و دیسی - گاہے برای اجرت ،
 چوں : پسائی و دھلائی و پکوائی و رنگائی - و گاہے مصدری ، چوں :
 بھلائی و بُرائی و چوراچوری و قساقسمی و پھینا بھینتی و ہلا پھلی -
 و یای مجهولہ در آخر اسم مذکر برای جمع آید ، اگر آتش الف باشد یا ہای ہوز - زیرا
 کہ حرفِ ہاء ، بمنزلة الف است در محاورہ ہندیاں ، چوں : گھوڑے و گدھے و نیچے و
 بے چوہے - و گاہے در آخر اسم غائبی آید ، چوں : آئے - و گاہے در آخر امر حاضر
 می آید کمرے -

”ہاء“ کھٹا غلط ہوگا ، کیوں کہ اس صورت میں واؤ موقوف نہیں رہتا ، محض ساکن ہوتا
 ہے ۔ افعال میں واؤ ساکن ہوتا ہے ، اور حاصل مصدر و فعل میں موقوف ہوتا ہے ۔ مثلاً
 جانا کے فعل ”جاؤ“ میں واؤ ساکن ہے (جائو) اور لگانا کے فعل ”لگاؤ“
 میں بھی واؤ ساکن ہے ، مگر اس کا حاصل مصدر ”لگاؤ“ ہوگا اور اس میں واؤ
 موقوف ہے ، اس کو ”لگاؤ“ نہیں لکھا جاسکتا ۔ اسی طرح گھاؤ ، ماؤ ، پاؤ ،
 گاد وغیرہ اسموں میں بھی واؤ موقوف ہے ، ان میں بھی واؤ سے پہلے ، مزہ
 نہیں آئے گا ، ورد واؤ موقوف ، واؤ ساکن میں بدل جائے گا ۔ جلال نے واؤ
 موقوف کے متعلق لکھا ہے : ” اور واؤ موقوف کی شناخت یہ ہے کہ آخر میں ان
 اس کے واقع ہوتا ہے جن میں اس واؤ کے قبل الف واقع ہو ۔“ یہ نہایت واضح
 تعریف ہے ۔ اس کے مطابق ”جاؤ“ میں واؤ ساکن ہے اور ”بناؤ“ میں واؤ موقوف
 ہے ۔ اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے سے اکثر صورتوں میں املا کے لحاظ سے غلط نگاری کا
 ارتکاب کیا جاتا ہے اور قواعد کے لحاظ سے غلط بیٹھ جاتا ہے ۔

موج سوم :

ہر گاہ می خواہی کہ صیغہ امر بسازی از مصدر ہنگامہ ، پس لفظ " تا " کہ علامت مصدر است ، ساقط کن ، چوں امر حاضر از آنا : آ و از جانا : جا - و جمعش : آؤ و جاؤ - و جمع تعینا : آئے و جائے - و امر غائب : آئے و جائے - و جمعش بہ یا و تون است ، چوں : آئیں و جائیں - و در امر حاضر و غائب ، ذکر و موشٹ مساوی اند -

ماضی پنجگانہ : بدان کہ صیغہ ماضی پنجگانہ و صیغہ حال و صیغہ استقبال از صیغہ امر می سازند - ہر امرے کہ در آخر آں الف است ، بہ الحاقِ یا ، ماضی شود ، چوں : آیا و کھایا - و اگر آخر امر حرف دیگر ، بہ الحاقِ الف ، ماضی می شود ، چوں : سیا و دیکھا - و " جانا " کہ مصدر است بمعنی رفتن ، ماضی آں بہ لفظ " گیا " خلاف قیاس آمدہ -

و بہ الحاقِ " ہے " بہ فتح ، ماضی قریب المال می شود ، چوں : کھاجے و پڑھاجے - و در جمع مذکر و موشٹ تون زیادہ می شود ، چوں : ہیں ، بجائے " ہے " - و بہ الحاقِ " تھا " ماضی بعید المال می شود ، چوں : بیٹھا تھا و اٹھا تھا - و بہ الحاقِ " تا تھا " ماضی استمرار می شود ، چنانکہ : چلتا تھا ، ملتا تھا - و بہ الحاقِ " ہوگا " ماضی محتمل می شود ، چوں : لگایا ہوگا و بجایا ہوگا - و بہ الحاقِ " گا " صیغہ امر غائب ، صیغہ استقبال می شود ، چوں : آئے گا و جائے گا -

ماضی پنجگانہ : گذر واد میں گذر واد مروت میں مروت محکم واد و جمع
 ماضی مطلق : آیا آئے آئی آئیں آیا میں آئے ہم
 ماضی قریب الحال : لایا لائے لائیں لائیں آیا ہوں آئے ہیں ہم
 ماضی بعید الحال : آیا تھا آئے تھے آئی تھی آئیں تھیں آیا تھا میں آئے تھے ہم
 ماضی استمرار : آتا تھا آتے تھے آتی تھی آتیں تھیں آتے تھے میں آتے تھے ہم
 ماضی محتمل : آیا ہوگا لائے ہوں گے آئیں ہوں گے آئیں ہوں گے آئیں ہوں گے
 استقبال : لائے گا آئیں گے آئے گی آئیں گی آؤں گا میں آئیں گے ہم
 حال : آتا ہے آتے ہیں آتی ہے آتیں ہیں آتے ہیں میں آتے ہیں ہم
 حو برای محکم سہ لفظانہ : ہیں ، بہ فتح - ہم ، بہ فتح - مجھ ، بہ ضم - و
 وَاَنْ بِلَا شَرِکَ حَرْفِ دِیْگَرِے خاص است (کذا)۔

و ایں الفاظ محکم ، گاہے با فعل اولیٰ آئند و گاہے در آخر فعل - "میں"
 و "ہم" بہ افعال لازم می آئند ، چوں : میں اٹھا ، میں بیٹھا - ہم اٹھے ،
 ہم بیٹھے - اٹھائیں ، بیٹھائیں - اٹھے ہم ، بیٹھے ہم - "میں نے" و
 "ہم نے" بہ افعال متعدی می آئند ، چوں : میں نے کھایا ، میں نے پیا -
 ہم نے کھایا ، ہم نے پیا - "مجھ" برای اشارت بذات خود ، چوں :
 مجھ کو بخت کو ، مجھ دیوانے کو کیوں ستاتے ہو - "مجھے" نیز برای
 ذات خود ، چوں : مجھے کیا غرض ، مجھے کیوں بلایا -

گاہے بہ ازدیاد کاف و واو ، برای مفعولیت خویش ، چوں : مجھ کو
 پڑھایا لکھایا - گاہے بہ ازدیاد سین و یا ، چوں : مجھ سے فلاں
 شخص کو کیا مطلب - و گاہے بہ الحاقی لفظ "میں" ، چوں : مجھ میں
 طاقت ہے - و گاہے بہ اتصال لفظ "سمیت" ، چوں : مجھ سمیت

استاد قطع ہوئے۔ وگاہے بہ اتصالِ لفظ ”پر“، چوں : مجھ پر احسان ہے آپ کا۔
وگاہے بہ الحاقِ لفظ ”سا“، چوں : مجھ سا دوسرا نہیں۔

میرا : برای ملکیت ، چوں : یہ مال میرا ہے۔ یہ غلام میرا ہے۔ و
بریں قیاس ”ہم“ ، چوں : ہمیں کیوں بلایا۔ ہم کو کس لیے تکلیف
دی۔ ہم سے کیا غرض۔ ہم میں طاقت نہیں۔ وہ ہم سمیت نوکر ہوئے۔
ہم پر احسان آن کا۔ ہم سا بے ہنر۔ یہ مقسوم ہمارا۔ و ایں
الفاظ روابط اند۔

اپنا : منفقہ ”آپنا“، بمعنی خویش، برای مذکر۔ یعنی : یہ گھوڑا اپنا
ہے۔ و برای مؤنث ”اپنی“ : یہ گھوڑی اپنی ہے۔
الفاظ روابط این است کہ با کلمہ و کلام می آیند :

سمیت : بفتحتین ، برای معیت است۔

سے : کبسر ، بیای مجہول ، بمعنی ”از“ است۔

میں : کبسر ، بیای مجہول و ثوب غنہ ، بمعنی ”در“۔

سا : بمعنی مانند۔

پر : بفتح ، بمعنی بالا و علیٰ۔

تکو : کاف تازی مضموم بہ واو مجہول ، چوں ”سا“ در فارسی۔

کے : کاف تازی مکسور بیای مجہول ، بمعنی اضافت ، برای اشیای

مذکر جمع ، چوں : زید کے گھوڑے ، عمرو کے ہاتھی۔ و بیای

معروف برای اشیای مؤنث ، چوں : زید کی گھوڑی ، عمرو کی ہتھنی۔

کا : برای اضافت شے مذکر ، چوں : امیر کا لشکر۔

اور : بفتح ، بمعنی واو عطف۔

نہیں : بفتح و ہای کسور بیای معروف و نون فتحہ ، نہ ، بفتح ؛ ہر دو نافہ اند ،
چوں : قلاں مفلس نہیں نہ بے بضاعت ۔
ہے : بفتح ، بمعنی " است " در فارسی ۔

الفاظ اشارہ بر اسی سمت و طرف :

ادھر : بکسر و دال مفتوح باہی مغلوط ؛ بمعنی اسی طرف ۔
اودھر : بضم و واو مشموم و دال مفتوح و ہای مغلوط ، بمعنی اس
طرف ۔

کدھر : بر وزن ادھر ، بمعنی کدام سمت ۔

جدھر : بر وزن کدھر ، اشارہ است از ہر سو ، چوں : جدھر چاہو ،
جاؤ ۔ جدھر سے آئے ہو ، اُدھر جاؤ ۔

اس : بکسر ، اشارہ است بہر چیز ، بمعنی ایں ، چوں : اس مرد کو
یا اس گھوڑے کو پہچانتے ہو ؟ یا اس طرف جاؤ ۔

اُس : بضم ، بمعنی آں ، بہاں معنی ۔

کس : بر وزن بس ، بمعنی کدام جا و کدام وقت ۔ گاہے بہ از دیاد حرف
" کو " ، یعنی : کس کو ۔ گاہے بہ از دیاد یا ، یعنی : کسے ۔

گاہے بز یادِ " میں " ، یعنی : کس میں ۔ و بریں قیاس
ہر سہ : اس و اُس و کس ۔

یہ پُرانا انداز نگارش ہے ، جو اب قلعاً متروک ہے ۔ اب " اُدھر " لکھا جائے گا ۔
چوں کہ یہاں " واو مشموم " کی صراحت تھی ، اس بنا پر یہ واو لکھا گیا ہے ۔

- ہیں : بفتح ، برای جمع ، چوں در فارسی "آدمہ اند"۔
 پاس : بمعنی نزدیک ۔
 یہ لے : بکسر ، بمعنی "ہذا"۔ و اشارہ پہ شے قریب ۔
 وہ : بضم ، اشارہ پہ شے بعید ۔
 یہاں : بر وزن جہاں ، بمعنی اس جا ۔
 وہاں : بر وزن شہاں ، بمعنی اس جا ۔
 کہاں : ہماں وزن ، بمعنی کدام جای ۔
 جہاں : بر وزن مکاں ، جای غیر معین ۔
 ہاں : بمعنی مکان و جای ، چناں چہ مرزا رفیع سودا مغفور گوید :
 تلوار جو گھر میں ، تو سپر (پنیے کے) ہاں ہے ۔ حرف
 یا از کثرت استعمال ساقط شدہ ، "کہاں" ملفوظ است ۔

"وہ" اور "یہ" دونوں میں آتے ملفوظ ہے ، اس لیے "یہ" میں "آ" کے نیچے اس کا شوش لازماً لگایا جائے گا۔ کبھی نظم میں اور کبھی کبھی گفتگو میں بھی "آ" کی آواز پوری طرح تلفظ کا ساتھ نہیں دیتی ، یہی صورت "وہ" کی ہوتی ہے ؛ مگر اس سے ان ملفوظوں کے اظہار اثر نہیں پڑے گا۔ عام طور پر "یہ" کو شوشے کے بغیر "یہ" لکھا جاتا ہے ، پرانی تحریروں میں بھی یہی صورت ملتی ہے ؛ مگر اب اصل کے مطابق اس کو "یہ" لکھنا چاہیے ۔ ملفوظ میں ، روش عام کے مطابق ، "آ" کا شوش موجود نہیں ؛ اس کا اضافہ کیا گیا ہے ۔

الفاظِ مخاطب ، حاضر و غائب : تو و تم و تیرا و تمہارا و آپ و اس و ان - و ایس ہمد علی قدر مراتب -

تو : برای ادنا، یعنی : تو کیا کہتا ہے ، و تو کون ہے -

تیرا : یہ تیرا مال ہے -

تم : برای درجہ اوسط ، چوں : تم بیٹھو -

تمہارا : ہجو : یہ مال تمہارا ہے -

آپ : برای مرد معزز ، چوں : آپ تشریف لائیں — و

برای مخاطبِ غائب و ادنا : اُس - چوں : اُس شخص کو بلاؤ -

اُن : بغض ، چوں : اُن صاحب کو ہمارا سلام کہنا -

انھیں ، انھوں : چوں : انھیں کیا غرض - انھوں نے نوکری کر لی -

ہاں : چوں در عربی "ہائی" -

کیا : بایا ہی مخلوط ، چوں در فارسی "چہ" -

کیوں : بیا ہی مخلوط ، برای چہ -

کیونکہ : یعنی بہ طور -

کچھ : بغض ، بمعنی اندک -

تا : در آخر امر برای قائلِ حال آید ، چوں : روتا و ہنستا ،

در فارسی : گریاں و خنداں -

ان : برای جمعِ اشیا و انسانِ حاضر ، چوں : ان چیزوں کو ہاتھ نہ لگاؤ -

ان صاحبوں سے کہ دو -

سارا : برای شے مفرد ، چوں : سارا پونڈا کھا گئے -

سب : برای افراد ، چوں : سب گنڈیریاں کھا گئے -

- کون : ہر وزن خون ، بمعنی کس و کلام ، چوں : کون آیا۔ کون گیا۔
 کون کون چیزیں پسند کیں۔
- کب : بفتح ، بمعنی کلام وقت ، چوں : کب آؤ گے۔
- جب : بفتح ، بمعنی ہر گاہ ، چوں : جس وقت آؤ گے ، خوش ہو کر جاؤ گے۔
- تب : بفتح ، یعنی ہاں وقت ، لیکن در جواب ”جب“ موضوع است؛
 چوں : جب میں نے سمجھایا ، تب سمجھے۔
- تو : بضم ، واو مجہول : تم تو یہ کہتے کہ وہ بلائیں گے تو میں جاؤں گا۔
- جو : بضم ، واو مجہول ، شرطیہ بمعنی ”اگر“۔
- اب : بفتح ، بمعنی حالا۔
- نیک و نیک : بفتحتین ، ہر دو ہمای انتہا۔
- لیے : بکسرتین ، بمعنی واسطہ ۔ و ایں مفرد نمی آید ، بہ دو سہ لفظ
 مرکب شدہ استعمال یابد ، چوں : اس لیے ، و کس لیے ،
 و جس لیے ، میرے لیے ، تمہارے لیے ۔
- بہت : بفتح و ہاء مضمومہ : بمعنی بسیار ۔
- تھوڑا : بضم و ہاء مخلوط و راسی ثقیل مفتوحہ ، بمعنی اندک و قلیل ۔

موج چہارم :

اہم کررہند معنی مستعمل است : لگا ہے بمعنی مقدار ، چوں : کم خواب کے
 تھان سو سو روپے بکتے ہیں اور چار چار گز کے تھان ہوتے ہیں۔
 لگا ہے شرطیہ ، چوں : ہم سرسربازی بدلتے ہیں۔ لگا ہے بمقام مشک ،

چوں : فلاں شے کچھ کالی کالی ہے یا لال لال ہے ۔ گاہے بمعنی کثرت ،
چوں : گھر گھر نوشتیں بہتی ہیں ۔ گاہے بمعنی تاکید ، چوں : خوب خوب ،
اجتماع تھا ۔

و دو صیغہ امر مختلف ، ماضی بالصدر می شود ، چوں : ناپ تول ، مار پیٹ ،
تاک جھانک ، جھاڑ پھونک ، لاگ ڈانٹ ۔

والا : بمعنی صاحب و فاعل آید در آخر اسم ، چوں : دال موصوفہ والا ۔
علو اسوہن والا ۔ برای موثث بھائی الف ، خوف یا آرمند
کہ علامت تانیث است ، چوں : دہی والی ۔ دودھ والی ۔

الف امالہ : برای اسم مذکر است کہ در آخر آں الف باشد یا ہائی متغی ،
چوں : گھوڑے سے اترے ۔ خیمے میں داخل ہوئے ۔ خصوص
باحرف ربط ، چوں : گھوڑے میں جان نہیں ۔ گھوڑے پر
چڑھے ۔ گھوڑے سمیت ڈوبے ۔ و ہم چنیں الف مصادر ،
چوں : آنے میں کیا دیر ہے ۔ سیکھے کا قصد ہے ۔ پڑھنے سے
پڑھنا آتا ہے ۔ و اسے کہ در آخر آں الف است یا ہائی متغی ،
و در استعمال لے موثث ؛ امالہ در آں ہر دو حرف نمی شود ،
چوں : دوا و دعا و قضا و عبا و ردا و ضیا و گمنا
و ہوا و صبا و توپ و بیوہ ۔

لے دیگر تفصیلات سے قطع کرتے ہوئے ہوں ، میں صرف ایک قاعدے کی طرف توجہ
دکانا ضروری سمجھتا ہوں کہ عربی کے بابہ افعال سے آنے والے جو مصادر ، اُردو میں
(پاتی اگلے صفحہ پر)

قاعدہ جمع :

برای اسم مذکر، حرفِ یایِ مجهول، چوں : گھوڑے و گدھے و نیچے و بچے چوے ؛ بشرطِ کہ در آخر اسم مذکر الف باشد یا ہایِ عطفی۔ و اگر در آخر آں اسم مذکر حرفِ عین است ، پس حرفِ ماقبل را کسرہ دہند، چوں : مصرع و مطلع و جمع ، قس علیٰ ہذا۔

مستعمل ہیں اور جن کے آخر میں الف ہے ، ان میں بھی ابدال نہیں ہوتا ، جیسے : املا ، انشا ، اخفا وغیرہ۔ عربی میں ان سب کے آخر میں ہمزہ بھی ہے یعنی (املا ، انشاء وغیرہ) مگر فارسی و اردو میں یہ ہمزہ کے بغیر ہی بولے اور لکھے جاتے ہیں۔ ان میں سے پہلا لفظ " املا " خاص طور پر یاد رکھئے گا ہے۔ لوگ " انشا " کو تو " انشے " کہیں نہیں لکھیں گے ، مگر " املا " کو " املے " کہہ دیا کرتے ہیں۔ اس لفظ میں بھی املے کا گزرد نہیں ہوگا اور ہر صورت میں " املا " لکھا جائے گا ، جیسے : املا کی منت ، املا کی کاپی وغیرہ۔

جہاں نے بھی مفید اشعار میں یہی لکھا ہے ، مگر ڈاکٹر عبدالستار مدنی مرحوم کا رائے یہ تھا کہ عربی صورت میں ایسے الفاظ کو بھی " تے " لکھنا چاہیے۔ مرحوم نے میرے خط سے جواب میں لکھا تھا :

" عربی " بُرُئِی " اردو میں " بُرُئِی " ہو گیا (تے کے زبر سے)۔ تَا
اردو میں قائم مقام الف کا ہے ، اسکا بے " بُئِی " سے اردو میں بُئِی
ہوا اور " مَوئِی " سے " مَوئِی "۔ جن لفظوں میں تَا کا ماقبل عربی

(باقی اگلے صفحے پر)

و برای اسم موث الف و نون است ، چوں : بکریاں و ہرنیاں ؛ بشرط کہ در آخر اسم موث یا کسی معروض باشد ۔ و اگر حرف دیگر است ، جملش بہ یا و نون است ، چوں : دعائیں و کتابیں و کتابیں و ڈانیں ۔ و

میں مغزج تھا ، وہ اپنے حال پر ہے : مطلق ، مطلق ۔ اور جو خود عربی میں دو طرح سے رائج ہیں ، جیسے : موثج و آن میں آمد دو نے زبر کو اختیار کر لیا۔ زبر سے کہ واسطہ نہیں ۔ یہ سب مثالیں واحد قائم کی تھیں۔ مگر کا واحد حرف اپنے آخر میں بجائے الف کے ، یہ رکھتا ہے ، اس لیے تہ کہ بعد یہ کا لانا ضروری ہوا ، چنانچہ : برتھے کے ، برتھے میں وغیرہ۔ اسی طرح مجمع مگر حرفت ، برتھوں ، خصلوں ، مطلقوں ، مقطوعوں وغیرہ۔

یہ مسلم ہے کہ مطلقوں ، مقطوعوں ، موثجوں وغیرہ میں تہ تلفظ کا ساتھ نہیں دیتے ، مگر اس کو نکھا جاتا ہے اور جمع کا دن اس کے ساتھ شامل ہوتا ہے و یہاں صوت مطلق ، مقطوع وغیرہ کی ہے ، کہ تہ یہاں بھی شامل تلفظ نہیں ، اور اس کے بعد اصولاً جس طرح دن کا اضافہ کیا جاتا ہے ، اسی طرح تہ کا اضافہ ہونا چاہیے۔ یہ آسان ، سادہ اور باقاعدہ صورت ہے ، یعنی : مطلق ، مطلق ، مقطوع ، مقطوع ، مقطوعوں وغیرہ ۔ اور اسی کو مزج سمجھنا چاہیے۔

”کتابیں“ اور ”ڈانیں“ کی مثال تو درست ہے ، مگر ”دعائیں“ اور ”کتابیں“ کی صورت ذرا مختلف ہے کہ ان میں ”ین“ کا نہیں ، بل کہ ”ئیں“ (+ ی . ن) کا اضافہ ہوا ہے (دعا + ئیں) ۔ یہی صورت ان الفاظ کی ہوتی ہے جن کے آخر میں آتے تعلق ہو ، جیسے ”دایہ“ سے ”دایائیں“ اور ”یہ“ سے ”یہائیں“ ، اس فرق کے ساتھ کہ آتے تعلق ، الف میں بدل جاتی ہے اور پھر ”ئیں“ کا اضافہ ہوتا ہے۔

انگلیاں و ڈبیاں و ٹکلیاں و چڑیاں ؛ و دریں چہار اسمِ یائی علامتِ
تانیث موجود است ، پس بسبب اجتماعِ ساکنین ، یک الف ساقط شد ۔
و جمع ہ وادون مشترک است میانِ مذکر و مؤنث ، چوں : توتوں میں ،
میناؤں میں ، مردوں میں ، رنڈیوں میں فرق ہے ۔ و گاہے ایس
وادون برای اتصال واقع می شود میان اسمِ مکرر ، چوں : کانوں کان و
ہاتھوں ہاتھ و راتوں رات و شاموں شام ۔ و گاہے ہاہم مفرد ، چوں :
کوسوں و منزلوں ۔

مرکبات :

باز : ہاں کہ " باز " بمعنی فاعلِ آید ، چوں : ہتھک باز و شیر باز و
کبوتر باز (و) چوڑ باز (و) لوندے باز و رنڈی باز وغیرہ ۔
بردار : چنور بردار و کنول بردار و انگلیشی بردار و حقہ بردار وغیرہ ۔
دار : بحالہ دار و چوکی دار و جوڑی دار و مکان دار وغیرہ ۔
دان : پان دان ، آٹھال دان ، بمعنی سفلی دان ، ناس دان ، سرودان ،

۱۔ " میناؤں " کی بھی وہی صورت ہے جو " دعائیں " کی تھی ، کہ یہاں بھی صرف و تہ نہیں ،
بلکہ " وں " (و ۔ وں) کا اضافہ ہوا ہے ۔ البتہ " مردوں " اور " رنڈیوں " کی مثال
ٹھیک ہے ، کہ ان میں " دن " کا اضافہ ہوا ہے ۔

۲۔ بعض ضرورت سے زیادہ محتاط حضرات " سمجھدار " اور " ہاسہ دانی " جیسے الفاظ کو
اب بھی غیر مناسب سمجھتے ہیں ۔ ایسے حضرات کو لکھنؤ کے ایک مسلم المشیرت استاد
اور زبان دان کی اپنی مثالوں کو خدا توفیق کے ساتھ پڑھنا چاہیے ۔

- ناگردان ، پر تعلیم عجیاں ، چوں : قلم دان و جزودان ۔
- اپا : بمعنی ہنگام ، چوں : بڑھاپا و رنڈاپا ۔ و بمعنی طرز و شیوہ ، چوں : بہنایا و سنگمڑاپا و گھلپا و مٹاپا و دہلپا ۔
- ہن : یہاں معنی : لڑکپن و دیوانہ پن و مسخرہ پن و بانکپن و بھولاپن ۔
- واں : بمعنی مثل و مانند ، چوں : سوراں و بڑواں و ڈھلواں و گیہونواں بے رنگ گندم ۔ و در فارسی نیز بہا ہن معنی ، چوں : پلواں ، اے مثل پل ۔ و در شمار اعداد بمعنی میم دوم و سوم ، چوں : پانچواں و ساتواں و آٹھواں و نواں و دسواں و گیارھواں و بارھواں و مثل آں ۔ و گھاکے بہا مالہ الف ، چوں : پانچویں دن و ساتویں مہینے و آٹھویں برس ۔ و برای سوخت ، یا کسی مسروٹ ، چوں : پانچویں تاریخ و ساتویں شب و آٹھویں ساعت ۔
- یل : بمعنی فاعل ، چوں : مرل و بھیل و اڑیل ۔ و بمعنی مفعول بہم چوں : گھایلٹ و سڑیل و کڑیل بمعنی جوان سخت ، و پایل

ملے ملے مخلوط میں اس کا املا ”کہونواں“ ہے ۔

یہ لفظ سائل اور مائل وغیرہ کا ہم قافیہ بھی رہتا ہے اور بادل اور چھاگل وغیرہ کے ساتھ بھی آیا ہے ۔ شوقی ۔ حوی نے رسالہ اصلاح میں اس بحث کو لکھا ہے ۔ اس بحث سے قلیٰ نظر کرتے ہوئے ، یہاں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب ماقبل لام مفتوح ہوگا تو اس کو ”پائل“ لکھا جائے گا اور جب ماقبل لام مکسور ہوگا تو یہی کی جگہ پر ”ہزہ“ آئے گا ، یعنی ”پائل“ لکھا جائے گا ۔ یہ آرد و کا قاعدہ ہے کہ اس قماش کے الفاظ میں مفتوح ہونے کی صورت میں ہی آتی ہے ، جیسے : نرائیں ، پائیں ، ناہنگ وغیرہ ، اور اگر ان میں ماقبل حرف آف کو مکسور مانا جائے گا تو پھر ہزہ کے ساتھ ان کو لکھا جائے گا ، یعنی : نرائیں ، پائیں ، ناہنگ وغیرہ ۔

- بمعنی چالاک ۔ وگا ہے بسکون یا و حرف ماقبل آں مفتوح ،
 چوں : ہڑھیل و کھیرل و تکیل یعنی مہار وکیل یعنی تہاؤدکلا و تکیل
 ہند : بفتح ، در آخر اسم بمعنی بوباس می آید ، چوں : سڑا ہند
 و کپا ہند و ہسا ہند و ہرا ہند و کھرا ہند [ہونی بول]
 و گکرا ہند بمعنی بوی سگ [و چرا ہند]
 ہند : چوں : بھج بند یعنی بازو بند و بھج بند و بھج بند
 و بھچر ہند و ہستیار ہند و چیرا ہند ۔
 ہرا : بسکون اول و حرف ماقبلش کسور ، برای نسبت ، چوں :
 ممیرا [ماموزاد برادر] و غلیرا [خالہ زاد برادر] و
 بہتیرا و سورا و دریں داو ، الف امالہ است از
 " سوا " ، و کیرا ۔
 ہرا : بسکون ، ماقبل مفتوح ، برای نسبت ، چوں : سنہرا و کھنہرا
 چنہرا و اکہرا و ڈہرا (و) تہرا و چوہرا و پھوہرا ۔
 یلا : برای نسبت و صاحب ، چوں : رسیلا و کیلا و رنگیلا و
 رگیلا و پھنسیلا و گنشیلا و ہشیلا و ٹکیلا و ٹنڈیلا و نشیلا ۔
 وگا ہے بیای بھول ، چوں : ادھیلا و سوتیلا و ٹولیلا و آکیلا ۔
 آن : بفتح ، بمعنی نفی ، یعنی نہیں ، چوں : آن میل و آن گھر و
 آن مول و آن کہی [ناگفتہ] و آن ذات و آن بھج
 و آن پڑھ

یا : ہر صنف امر کے آخر اور حرف علت باشد، ضمیر ماضی واقع می شود،
چون : لایا، کھایا، رویا، سویا۔ پیا، سیا، یک حرف یا
از کثرت استعمال ساقط شده۔

و در آخر اسم بمعنی فاعل آید، چون : باڑھیا، دُھنیا، رنگ، بھریا،
فریہا، بھیریا، پیندیا، بھپ ہالیا۔ و گاہے برای نسبت، چون :
پہاڑیا و رام پوریا و تیلیا و بھوریا و جوگیا و طاریا و مونگیا۔
و گاہے برای تصغیر موش، چون : بڑھیا، چلیہا، ٹھلیا، ڈبیا، منڈھیا۔

فی : بیای معروف، علامت تانیث، چون : ڈومنی و چاندنی و
ستھنی و ادڑھنی (و) ستھنی و ہندنی و چونہ پڑنی و ٹنگنی و
ٹنگنی و ٹھنگنی۔

یت : بسکون و حرف ماقبل مفتوح، بمعنی فاعل، چون : برہمیت و
بنگیت و کرکیت و ڈکیت و بیت و پھندیت و پھیت۔
ڑا : بمعنی اضافی، چون : سٹیکڑا و چڑا و ڈکڑا و پھلڑا
و پلڑا و لکڑا و کبڑا و جیوڑا۔

و جملہ مصادر عربی کہ از باب تفعیل اند، در محاورہ ہندیاں تانیث الاستعمال
آمده اند، الا : تعوید، چون : تصویر، تاثیر، تحریر، تعمیر، تقریب،
تہنیر، تمشیت، تشیت، توریث، تلویث، تدریج، تزویج،
توضیح، تفریح، تاریح، توہیح، تمہید، تبرید، تلمیز، تشمیز،

۱۔ تلفظ میں اس کا املا "پھونکنی" ہے۔

۲۔ تلفظ میں اسی طرح، مگر صیح املا "سیکڑا" ہے بغیر ٹوں۔

تجويز ، تبريز ، تاسيس ، تنيس ، تشویش ، تفتیش ، تنیس ، ترغیب ،
تغویض ، تحریس ، تخلیط ، تقریب ، تریح ، تویح ، تفریح ، تبلیغ ،
تعریف ، توصیف ، توفیق ، تحریک ، تشکیک ، تبدل ، تبیل ، ترمیم ،
تحلیم ، تدوین ، تنہین ، توجہ ، تنبیہ ۔

و ہر کلمہ کہ آخر تائی قرشت دارد ، تانیث الاستعمال است ، چوں : مصلحت
و مرحمت ۔ و اگر تائی منفذ است ، تذکیر الاستعمال ، چوں : معاملہ و
معاملہ ۔ و خلعت و شربت شاذ است ۔

وئی : ہم جای نسبت ، چوں : سگنوں و چمنوں و ہتوں و کھلوں
و کسوئی و بنجوں و لنگوں و چنگوں ۔

مصادر باب فیعلن ، وزن عروضی ، و حرف مخلوط محسوب نیست ۔

فصل الف عین کلمہ

الثانی : بمعنی آمدن ۔

۱۔ مخلوط میں اسی طرح لکھا ہوا ہے اور یہ فارسی لغات کی تقلید ہے ۔ مستند پہلوی مطبوعہ اور
فعلی کتابوں میں الف ممدودہ کو دو الف کے ساتھ لکھا گیا ہے مطبوعہ لغات خلف بہار علیچ
اور بہار طابع کے نول کشوری اڈیشنوں میں [سال طبع بالترتیب : ۱۸۶۹ء ، ۱۸۸۹ء]
الف ممدودہ کو "ا" لکھا گیا ہے ۔ صاحب فرہنگ جہانگیری نے مقدمہ فرہنگ میں اس کی مرآت
یہی کی ہے : "چوں علای فارسی الف ممدودہ ما دو الف اعتباری کنند ، دو فصل الف ، از باب
الف ، ہر لفظ کہ دواول او الف ممدودہ بود ، فوتم و دو الف رقم کردم" ۔ اردو میں اب اس
کارواج نہیں ۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اور مقالہ الف پر الف ممدودہ کو ج مد لکھا گیا ہے مثلاً آخر میں
ہوئی محاورات ہر یک الف پر مد لکھا ہے ۔ یہاں اس غیر متعارف الح کو محض مطابقت اصل کے خیال
سے محفوظ رکھا گیا ہے ۔

تانا : گرم کردن روغن گاو، تا خالص شود۔

جانا : بمعنی رقتن ۔

بھانا : بمعنی پسند آمدن ۔

پانا : بمعنی یافتن ۔

لانا : آوردن ۔

کھانا : خوردن ۔

گانا : بکافتن فارسی ۔ سراییدن ۔

ڈھانا : با دالِ ثقیل و باہمی مخلوط، بمعنی انہدام ۔

چھانا : بجیم فارسی و ہای مخلوط، مکان را ثقف کردن از چوبہا یا از گاہ۔

فصل باہر دو

پھبنا : ہبای فارسی و ہای مخلوط، در استعمال آوردن چیزے کہ زیب دہد۔

دبنا : بفتح، زیر بار گراں شدن کہ باعث ہلاکت باشد، و مجازاً از

زہر دست در گذر کردن۔

چھپنا : بجیم فارسی کسور و ہای مخلوط، نہاں شدن از چشم ناظرین۔ و

بضم، رختن خود یا کلاں بند شدن از گل در مکان، چھوں

سوراخ موش یا دیوار شکستہ را۔

۱۔ ”بھانا“ کو بعض اساتذہ متاخرین نے، جن میں اقیرمیتائی کا نام قابلِ ذکر

ہے، متروک قرار دیا تھا، مگر اکثریت نے اس قول کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اس

انداز کے مسلم ہو گا کہ علامہ تاج (اور کم سے کم بکر) اس کو متروک نہیں مانتے تھے۔

- چپنا : بفتح جیم و بای فارسی ، خواندن چیزے را از قسم و خائف
پکرات -
- لپنا : لام کسور بای فارسی ، در مکان کہل شدن -
- تپنا : تا مفتوح بای فارسی ، گرم شدن زمین و مکان از
تابش آفتاب -
- ثچپنا : بتای ثقیل و بای فارسی ، بمعنی ارتسام و طبع ، چوں
شہر پر کاغذ -
- چچپنا : بفتح جیم فارسی و ہای مخلوط و بای فارسی ، مطبع شدن ، چوں
کتابہا و پارچہ ہا کہ مطبع می شوند -
- کچپنا : بفتح کاف و ہای غلط ، گرم شدن چیزے بطور تحلیل ، یا چیزے
را در چیزے صرف شدن -
- نپنا : بفتح نون و بای فارسی ، پیمایش شدن -

فصل التنا

- کتنا : بفتح کاف ، پندہ صرف شدن در رشتن -
- جتنا : بضم جیم ، اسپ و گاو وغیرہ را در ارارہ گو بند نہادن تا
بکشد ، و مجازاً : در کارے مصروف شدن -
- ستنا : بضم و نون متنونہ ، رشتہ و رن باریک را از چیزے
صاف شدن ، تا ریشہ و رگ ہموار شود ، و مجازاً : تغیرے
در چہرہ کسے دیدن -

فصل بتای ثقیل

- ا ثنا : بفتح و تایی ثقیل ، از گرد آلوده شدن .
- ب ثنا : بفتح ، تابیدن رشته و تقسیم شدن خوردنی و چیزهای دیگر .
- پ ثنا : بای فارسی مفتوح بتای ثقیل ، بای عمیق مثل چاه و خندق و غیره
- په ثنا : از خاک و خاکدوبه هموار و برابر شدن ، و هم چنین مستعمل مکان .
- په ثنا : بای فارسی مفتوح و های غلط ، چاک شدن هر چیز از خود یا از ضرب .
- په ثنا : جیم فارسی بضم و های غلط ، چیزه از چیزه جدا شدن ، و از آدمی آدمی .
- په ثنا : جیم فارسی مفتوح و نون مفتوح و تایی ثقیل ، شانهای درخت قلم شدن ، و چیزه از چیزه منتخب شدن .
- و ثنا : دال ، تا هر دو ثقیل ، بر دوانگی مقابل شدن ، خصوص در میدان جنگ .
- ر ثنا : بفتح راء مهمل بتای ثقیل ، یک کلمه را علی الا اتصال گفتن .
- ک ثنا : بفتح کاف بتای ثقیل ، بریده شدن - و مجازاً : شرمسار شدن .
- گه ثنا : بضم کاف فارسی و با و نون مخلوط ، دم خفا شدن و دغان پانویه شدن .
- ل ثنا : بضم لام بتای ثقیل ، مال و اسباب غارت شدن .
- پ ثنا : بضم ، جدا شدن .

- بجنا : بفتح ، نواختن ۔
- سبنا : بفتح سین مہملہ بحیم ، آراستہ شدن از لباس یا از سلاح یا از زیور و غیرہ ۔
- بچنا : بای مفتوحہ با بحیم فارسی ، از خدمات و از بلیات یا از شبہ ناگزیر محفوظ ماندن ۔
- پچنا : بفتح با و جیم ہر دو فارسی ، ہضم شدن در مہدہ ۔
- منبنا : بفتح میم و نون غنہ و جیم ، ظرف و غیرہ از خاکستر بزور سختی گردیدن و شستن است ۔
- چچنا : بفتح جیم بحیم فارسی و میان نون غنہ ، چیزے خوب قدر و قیمت آں ذہن نشین شدن ۔
- رچنا : بضم ، بحیم فارسی ، رغبت شدن چیزے ۔ و بفتح ، خوب شدن رنگبہ خا در دست و پا ، و مہیا شدن سرو سامان شادی ، بخانہ ۔
- سچنا : بکسر سین مہملہ و نون غنہ بحیم فارسی ، صرف شدن آب در زراعت و بارغ و سبزہ زار و کشیدگی آب از چاہ و تالاب ۔
- بچیننا : بکسر یای لہجہ و با و نون ہر دو مخلوط ، تنگاتنگ آمدہ شدن ۔
- کچیننا : بکسر کاف و با و نون مخلوط بحیم فارسی ، کشیدہ شدن ۔
- چینا : بفتح میم بحیم فارسی ، شور و غوغا شدن ۔ چوں : شور و غوغا مچا ہے ۔
- چیننا : بضم نون بحیم فارسی ، بمعنی بال و پر برکنده شدن ۔
- کچنا : بضم کاف و با ی خلط برال ، کنیدہ شدن ۔

- چرنا : بضم جیم فارسی ، گهایده شدن -
 چهندنا : بکسر جیم فارسی و های غلط ، سوراخ رسیده شدن از آنه نوکدار -
 بدنا : بفتح موته ، شرط کردن -
 لدنا : بفتح لام ، بار شدن بر بار بردار
 هندننا : بفتح و تون غته ، رسوا شدن بکوچ و بازار -

فصل الرّا

- بهرنا : بفتح و های غلط ، پُر کردن ظرف از چیزها - و مجازاً : گذرانیدن
 ایام از مشقت و مصیبت -
 پهرنا : بکسر پای فارسی و های مخلوط ، گردیدن و رسیدن -
 پرنا : بکسر پای فارسی - و بعض بجای را ، لام خوانند - روغن کهنه
 و شیرۀ نیشکر بکشند -
 ترنا : بکسر تای قرشت ، بر آب شناور شدن - و هر چه میز را
 گویند که بر آب باشد و غرق نشود -
 چرنا : بکسر جیم فارسی ، شگافه شدن چوب باشد یا کرپاس - و بفتح ،
 چریدن چوپایه -
 جهرنا : بضم جیم و های مخلوط ، پژمرده شدن ، پژمورگی
 و گیاه -
 کرنا : بفتح کاف ، کردن - و بکسر ، تیغ دندان شدن بهم -
 گرنا : بکسر کاف فارسی ، افتادن -
 درنا : بفتح دال ثقیل ، ترسیدن -

- گھڑنا : بکسر کاف فارسی ، احاطہ شدن - و میان دشمنان راہ گریز نہ یافتن -
- مرنا : بفتح میم ، مردن -
- ہرنا : بفتح ، بازی از دست دادن -
- اڑنا : بفتح الٹ ، قائم شدن بجای استوار ، انسان یا چیزے -
- اوڑنا : بضم و واو مشومہ ، پریدن -
- بھڑنا : بکسر با و ہای مخلوط ، باکس ہم پہلو نشستن - و باکے مقابل شدن -
- پڑنا : بفتح ، افتادن -
- ترنا : بفتح تہای قرشت ، وزن شدن در ترازویا در پلہ چشم -
- جڑنا : بفتح جیم ، چیزے در چیزے نشانیدن مثل نگیس -
- جڑنا : بضم جیم ، میسر شدن - و چیزے نہ چیزے چسپیدہ شدن -
- و مجازاً : جماع -
- چھڑنا : بفتح جیم فارسی ، برنج وغیرہ را در جوغن کلاں از کوہ مقرر کردن
- و صاف نمودن -
- جھڑنا : بفتح جیم ، ریختہ شدن - و منزل شدن بجماع -
- سڑنا : بفتح ، متعلق شدن -
- گڑنا : بفتح کاف فارسی ، دفن شدن - بضم ، بمعنی شیار زمین زراعت -
- گھڑنا : بفتح کاف فارسی بہای مخلوط ، ساختن ظرف از مس و از سیم و زر -
- لڑنا : بفتح ، جنگیدن بزبان ، یا بزبان تیغ و سناں -
- مڑنا : بضم میم ، از یک جانب بجانہ دیگر رو آوردن - و بازگشت -

فصل سین مہملہ :

- بشنا : بفتح بای ابجد ، بود و باش کردن بجایے ۔
 پشنا : بکسر بای فارسی ، ساییدہ شدن ۔ و یکے میل کردن نہایت ۔
 پھشنا : بفتح بای فارسی و ہ و نون مخلوط ، پام گرفتار شدن ۔ و مجازاً :
 بدام مبتدہ کسے گرفتار شدن ۔
 ٹھشنا : بفتح تہائی ثقیل و ہ و نون مخلوط ، چیزے بمنقذہ تنگ دخول
 شدن کہ گنجایش آن نداشتہ باشد ۔
 دھشنا : بفتح دہائی و ہ و نون مخلوط ، پابگل شدن در زمین نناک ۔
 ڈشنا : بفتح دال ثقیل ، گزیدن مار ۔
 رشنا : بکسر را ، آب چکیدن قطرہ قطرہ از ظرف ناقص و از جرات ہم ۔
 کشنا : بفتح کاف ، چیزے را محکم بستن برسنے ۔
 گھشنا : بکسر کاہ فارسی و ہائی مخلوط ، چیزے را برسنگ یا بر چیزے
 دگر ساییدن ۔ و بضم ، دخول شدن بجای تنگ ۔
 ہشنا : بفتح و نون غثہ ، خندیدن ۔

فصل کاف

- بکنا : بکسر ، بیخ شدن ۔ و بفتح ، بسیار سخن گفتن ۔
 پکنا : بفتح بای فارسی ، پختن ۔
 پھشنا : بضم و ہ و نون مخلوط ، سوختن ۔
 ٹھشنا : بضم تہائی ثقیل و ہ و نون مخلوط ، نفوذ شدن میخ در چیزے
 (و) سرکوفتہ شدن چیزے تا اندرون چیزے رود ۔

بہاں وزن ، لوکہ کدام چیز در بدن پیوستن ۔	ہسکننا :
بفتح ، بگریستن ۔	ہسکنا :
بفتح تہاں ثقیل و نون غتہ ، آورختہ شدن ۔	ہسکننا :
بضم و ہاں مخلوط ، خمیدہ شدن ۔	ہسکننا :
بضم جیم فارسی ، از صرف شدن چیزے نماد ۔	چکنا :
بفتح جیم فارسی و ہاں مخلوط ، سیر شدن از خوردن و آشامیدن ۔	چکنا :
بفتح دال ثقیل و ہا و نون مخلوط ، چیزے را از چیزے پوشیدن ۔	ڈھکننا :
و سر پوش را نیز گویند ۔	
بضم را ، از روانی باز ماندن ۔ و از کسے بسبب غش دم بخود ماندن ۔	رکنا :
بکسر سین ہبلہ ، چیزے از آتش گرم شدن ۔	سکننا :
بضم ، رویدہ شدن ۔	اگنا :
بفتح تہاں ثقیل و ہاں مخلوط بکاف فارسی ، چیزے از کسے بفریب گرفتن ۔	ٹھکننا :
بفتح ، رسیدن ۔	گہنا :
بفتح ، کاملہ شدن از مسافت ۔	تھکننا :
بفتح تہاں ثقیل و نون غتہ ، دوختہ مثل بندہ قبا وغیرہ ۔	ٹھکننا :
بفتح کاف فارسی ، چیزے پہ چیزے وصل شدن ۔	لگنا :

فصل لام

بفتح بای فارسی ، پرورش یافتن ۔ و بکسر ، حملہ آور شدن ۔	پلنا :
بفتح بای فارسی و ہاں مخلوط ، بارور شدن ۔ و مجازاً : بشور بر آوردن از کسے علت ۔	پھلنا :

- تلنا : بفتح تا ، چیزے بروغن بریاں کردن - بضم ، وزن شدن بمیزان -
 و تاسی ثقیل مفتوح ، چیزے را (کذا) از جای خود دور
 شدن ، و از محاذ له بهانه دور شدن -
 جلنا : بفتح ، سوزتن -
 جھلنا : بفتح و ہای مخلوط ، با ذرن جنباں شدن - و آب بشوره سرد
 شدن - و ظرف و زیور شکسته پیوند شدن -
 چلنا : بفتح جیم فارسی ، خرامیدن -
 چھلنا : بفتح جیم فارسی و ہای مخلوط ، جن زدہ شدن - بکسر ، پوست
 مال شدن و پوست کندن ، یعنی مقشر شدن -
 دلنا : بفتح دال ، دانه را آسیا کردن برای اسپاں -
 ڈھلنا : بفتح دال ثقیل و ہای مخلوط ، چیزے نقرہ و مسی و برنجی در
 قالب ، ہندی : سانچا ، درست شدن - و تنزل وقت شدن -
 و بضم ، چیزے مدور غلطیدہ شدن -
 رلنا : بضم ، دانه ہای خوب از انبار غلہ رفته و برآوردہ شدن -
 گلنا : بفتح کاف فارسی ، گداخته شدن گوشت از آتش ، و چیزے
 بسبب رطوبت خویش و بزیور ماندن گداخته شود -
 گھلنا : بضم کاف فارسی و ہای مخلوط ، در آب آب شدن شکل تند و سکو وغیرہ -
 کھلنا : بکسر کاف و ہای خلط ، شکستن ریامین - و بضم ، وا شدن -
 ملنا : بفتح میم ، الیدن - و بکسر ، معانقہ کردن - و چیزے گم شدہ را دست یابیدن -
 ہلنا : بکسر ہا ، جنبیدن - و رام شدن جانور -

فصلِ میم :

- تھمنا : بفتح تا و ہای مخلوط ، گرفتہ شدن و از کار ساقط شدن چوں بارش و باد تشند ۔
- جمنا : بفتح جیم ، بستہ شدن برف و جفرات و نمش و غیرہ ۔
- دمنّا : بفتح دال ، خمیدہ شدن و راست شدن تیغ بوقتِ آزمائشِ کمالت ۔

فصلِ نون :

- بنّا : بفتح بای ابجد ، تیار شدن چیزے از ساختن ۔ و بکسر ، بافتن ۔
- بھنّا : بضم و ہای مخلوط ، بریاں شدنِ غلّہ در گھلنن و کباب بر آتش ۔
- تنّا : بفتح تا ، تنیدن ، و بر خود پیچیدن ۔
- جنّا : بفتح جیم ، نرادن ۔
- دھنّا : بضم دال و ہای مخلوط ، تدانی ۔
- چھنّا : بفتح جیم فارسی و ہای مخلوط ، بیختہ شدن ۔ و بکسر ، از بردستی چیزے ربودہ شدن ۔
- چنّا : بضم ، چیدن ۔
- سنّا : بضم سین مہملہ ، شنیدن ۔ و بفتح ، آلودہ شدن ۔
- گنّا : بکسر کاف فارسی ، شردن ۔
- گھنّا : بضم کاف فارسی و ہای مخلوط ، گرم خوردہ شدن بسببِ کھنگی ۔
- منّا : بفتح میم ، بہ لجاجت طلاق شدن کے آزرده خاطر ۔

فصل واو :

- بونا : بضم بای اُبھد ، درخت نشانیدن و تخم پاشی کردن -
 چونا : بضم جیم فارسی ، ریزش آب از سقف شکستہ -
 چھونا : بضم جیم فارسی و ہای مخلوط ، ملاقی شدن دست پیمیزے -
 دھونا : بضم دال و ہای مخلوط و واو مجہول ، شستن - و بدال ثقیل ،
 چیزے را بدوش و سر بار کردن و بجایے رسانیدن -
 رونا : بضم را بواو مجہول ، گریستن -
 سونا : بضم واو مجہول ، خفتن - و اہم زر -
 کھونا : بر وزن دھونا ہاگم کردن چیزے -
 ہونا : بضم ہا بواو مجہول ، کارے واقع شدن -

فصل ہای ، توز :

- اٹھنا : بضم و تہای ثقیل و ہای مخلوط ، برخاستن -
 بہنا : بفتح و ہای مخلوط ، جاری شدن آب -
 بدھنا : بکسر و ہای مخلوط ، سوراخ شدن گوہر و چیزے - (و) بتلاقی
 شدن - و ایں معنی اہل تنہیم میدانند از روی علم خویش -
 برھنا : بفتح و رای ثقیل و ہای مخلوط ، ترقی کردن -
 پرھنا : بفتح بای فارسی و رای ثقیل و ہای خلط ، خواندن -
 چرھنا : بفتح جیم فارسی و رای ثقیل و ہای خلط ، سوار شدن - و
 بکسر ، از نام کسے چیز آزموہ شدن -
 کرھنا : بضم کاف و رای ثقیل و ہای مخلوط ، مغموم شدن -

- گر گھنا : بفتح کاف فارسی و رای ثقیل ، چیزے ساختن و سنداں ۔
- گندھنا : بغضم کاف فارسی و نون غنہ ، منسک شدن لالی و زیور بتا رہشتم ۔
- دوہنا : بغضم و واو مخلوط ، دوشیدن ۔
- چکھنا : بفتح کاف ، مزہ دریافتن چیزے از زبان و خوردن ہم ۔
- رہنا : بفتح را ، بہاے استقامت نمودن ۔
- سہنا : بفتح ، گوارا کردن چیزے ناگوار ۔
- کہنا : بفتح کاف ، گفتن ۔
- دکھنا : بغضم دال ، درد رسیدن بہ اعضا ۔
- نہنا : بکسر و بای ابجد و ہای غلط ، کارے را بہ انجام رسانیدن ۔
- چہہنا : بغضم جیم فارسی و بای ابجد ، خار و مثل خار پیوستن بہ بدن ۔
- مستھنا : خمیر بر آوردن چیزے را ۔
- پتھنا : بفتح بای فارسی و تا و ہای مخلوط (کذا) ۔
- سدرھنا : بفتح سین مہمل و دال و ہای مخلوط ، تعلیم یافتن جانور تا حکم بردار شود ۔
- بکھنا : بغضم و جیم و ہای مخلوط ، سرد شدن آتش و شعلہ ۔ و دریافتن چیتاں ۔
- پینا : بکسر بای فارسی و یای معروف ، آشامیدن ۔
- جینا : زینتن ۔
- سینا : بکسر سین بای معروف ، دوختن ۔
- دینا : بکسر بای مجہول ، دادن ۔
- لینا : بکسر بای مجہول ، ستادن ۔
- ڈھینا : بفتح و ہای مخلوط ، از پا درآمدن در دیوار وغیرہ ۔

بابِ فاعلن

مع البای فارسی :

- ڈوبنا : بضم بواو معروف ، در آب غرق شدن -
 ٹاپنا : جویای مطلب جا بجا گشتن -
 بھانپنا : بفتح و ہا و نوں مخلوط ، گمان بردن بر کسے بحسب مقصود خویش -
 تاپنا : گرم کردن دست و پا بر آتش -
 کاپنا : لرزیدن -
 ہاپنا : دم سوختہ شدن -
 تھوپنا : بواو مجهول ، الزام بر مرد بے قصور نہادن -
 سونپنا : بفتح ، واو (و) نوں مخلوط ، سپردن -
 جھینپنا : بکسر ، بہای مخلوط ، بیای مجهول ، از کلام طنز آمیز خفیت شدن -
 گھینپنا : بکسر کاف فارسی بہا و نوں مخلوط ، بیای مجهول ، چیزے را در ظرف از انگشت یا از کف دست خوب مالش دادن تا خمیر بر آورد -
 موتنا : یوزن ڈوبنا ، شاشیدن -
 سینتنا : بیا و نوں مخلوط ، چیزے را با احتیاط نگاہداشتن تا وقت دیگر بکار آید -

فصلِ جیم ہردو:

- سوچنا: بواؤ معروف ، درم شدن -
 سوچنا: بواؤ مجہول (و) نوں غتہ ، خیال کردن و بیاد آوردن
 چیزے را -
 گوچنا: بواؤ معروف (و) نوں غتہ ، مستی کردن بکوتر آواز - ویدیای
 فرضی دشت و جبل -
 پینا: بیای مجہول ، فروختن -
 چیننا: بیای معروف ، آواز بلند کردن -
 ناچنا: رقصیدن -
 کوچنا: بواؤ مجہول (و) نوں غتہ ، قاش انہ وغیرہ را برای آچار و
 مرتبا ریش کردن بعقد چند سوزن -

فصلِ ہردو:

- پارنا: لوہ گرفتن از شعلہ چراغ - تصدق کردن - (کذا) -
 دھارنا: ہای مخلوط ، نطول کردن -
 گھیرنا: بکسر کاف فارسی (و) ہای مخلوط (و) یای مجہول ،
 چرخ زنی کردن -
 ٹھیرنا: بفتح ، ہ و یا مخلوط ، از روانی باز ماندن -

۱۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "پارنا" اور "دارنا" دو مصدر ہوں گی جبکہ ایک مصدر
 رہ گیا اور دونوں کے معانی اسی ایک مصدر کے ذیل میں آ گئے۔ غالباً یہ سوکھتا ہے۔

- گهورنا : بضم ، های مخلوط بواو مجهول (کذا) بتطریز نگریستن -
 تیرنا و پیرنا : بفتح ، ششانداری کردن -
 چھیڑنا : بکسر و با و یای مجهول مخلوط ، بنوعی رنجانیدن خواه بزمزاج خواه
 بلمعن و طنز -
 چھوڑنا : بواو مجهول ، رها نیدن -
 توڑنا : بواو مجهول ، شکستن -
 دوڑنا : بفتح دال ، دویدن -
 پھوڑنا : سر را شکستن و سیو و غم را شکستن -
 پھاڑنا : چاک کردن -

فصلِ سینِ سَعَفَص :

- تاسنا : رعب نشانیدن بر طفل -
 ہونسا : بواو معروف و نون غنہ ، بدگوئی کردن بر شک و حسد -
 کوسنا : بواو مجهول ، بددعا کردن -
 ٹینسا : بیای معروف ، درد شدن جراحت یا بریاح -
 بنشنا : کرم و عفو کردن -

فصلِ ہر دو کاف :

- پھانکنا : بفتح ، با و نون مخلوط ، سفوف خوردن -
 پھونکنا : بواو معروف (و) با و نون مخلوط ، نفخ بمنقار - و پف
 کردن دعا - و سوزانیدن -

فصل تہائی ثقیل :

- چاٹنا : از زبان چشیدن -
 ڈانٹنا : بنویں غٹہ ، کسے را باواڑ تہند وغینہ آمیز نہیب دادن -
 اونٹنا : بفتح ، واو (و) نون مخلوط ، روغن و شیر وغیرہ
 را جو شیدن -
 ٹوٹنا : بضم ، ہوا و معروف ، شکستہ شدن -
 پھوٹنا : نو کردن دانہ ہا در کشت و کولہا - و منفر شدن دہل - و
 ریش شدن جسم از مرض - و بمعنی شکستہ شدن نیز -
 گھونٹنا : ہا و واو مجہول و نون غٹہ ، حل کردن - و ہوا و معروف ،
 گلو فتردن -
 پیشنا : بیای معروف ، سینہ (و) سر کو فتن در غم - و کسے را بتقصیر زدن -
 بکٹنا : بفتح و شای ٹٹند ، با کسے مباحثہ کردن -

فصل دال :

- پادنا : گوزیدن -
 پھاندنا : ہا و نون مخلوط ، از یک جانب بجانب دیگر مت کردن -
 کوندنا : بفتح ، واو و نون مخلوط ، رنجیدن برق -
 سوندنا : بفتح ، برو زدن کوندنا ، آرد و خاک را گل کردن بدست و پا -
 روندنا : بہاں وزن ، پایمال کردن -
 اینڈنا : بفتح ، بر خود پیچیدن -

- چو کنا : بواو معروف ، سہو کردن ۔
- تھو کنا : ہای مخلوط بواو معروف ، انداختن لعاب دہن ۔
- ٹو کنا : بواو مجہول ، درکار کسے دخل نمودن ۔
- او کنا : بواو مجہول ، قے کردن ۔
- ڈا کنا : بہاں معنی ۔
- چو کنا : بفتح ، واو (و) نون مخلوط ، یکایک بیدار شدن ۔
- بھو کنا : بفتح ہا و واو و نون مخلوط ، غریب بن سگ ۔ و بضم ، بواو مجہول ، دخول کردن کار در شکم ۔ و ایں مصدر متعدی کردہ است باز دیادہ
- واو ، و از باب فعلن در باب فاعلن آوردہ ۔
- جھو کنا : بواو مجہول (و) ہا و نون مخلوط ، خس و خاشاک در گلخن سوزانیدن ۔
- پھینکنا : بکسر و ہا بیای مجہول مخلوط و نون غمتہ ، انداختن و رایگان ۔
- کردن چیز ہا ۔
- کو کنا : بواو معروف ، سوزن ساعت را از کلید گردش دادن ۔ و
- سانہ ارغن را ہم نواختن ۔
- دھو کنا : بفتح ، واو واو و نون مخلوط ، آتش را مشتعل گردانیدن ۔
- پاگنا : تخم خربزہ و تربزہ را بریاں کردن بروغن و شکر ۔
- مانگنا : نون غتہ ، سوال کردن ۔
- بھاگنا : بہای مخلوط ، گرختن ۔
- ٹوگنا : بواو معروف و نون ، چیزے خوردن اندک اندک ۔
- جاگنا : بیدار شدن ۔

فصل لام :

- جھیلنا : یای مہول و ہای مخلوط ، گزرائیدن مصیبت و سختی ۔
- پیلنا : بیای مہول ، ورزش کردن ۔ و روغن کھنڈ و غیرہ در روغن چوبی
- کلاں با دعا و جادو ز کشیدن ۔ بعض بایں معنی بجای لام ، حرف راس قرشت استعمال کنند ۔
- سانا : ہر چہار پایہ را سوراخ کردن موافق چہار چوب پلنگ ۔
- کھیلنا : ہای مخلوط بیای مہول ، مشغول شدن بلہو و لعب و بازیہا مثل گنبد و چوڑ و غیرہ ۔
- پھولنا : ہای مخلوط یوا و معروف ، شگفتن و عمل آوردن درخت ۔ و فرہ شدن ۔ و بیای ابجد ، سہو کردن ۔
- بولنا : یوا و مہول ، گویا شدن ۔
- ڈالنا : انداختن ۔
- ہولنا : یوا و معروف ، پیل راندن ۔
- جھولنا : ہای مخلوط یوا و معروف ، درمہد و غیرہ آرام گرفتن اطفال ۔

فصل میم :

- چومنا : یوا و معروف ، بوسیدن ۔
- جھومنا : ہای مخلوط یوا و معروف ، سر ہنبایدن فیل و لہ ریدن بعالم مستی ۔
- تومنا : یوا و معروف ، پنہ را ریشہ ریشہ کردن با گشتہا ۔
- گھومنا : ہای مخلوط یوا و معروف ، چرخ زدن بگرد خویش و گشت کردن ۔

سہنا : بفتح ہای مخلوط ، خائف شدن اطفال ۔
 ماننا : سخن پذیرا کردن ۔
 جاننا : دانستن ۔

فصل ہا :

دیکھنا : بیای مجہول و ہای مخلوط ، دیدن ۔
 دوکھنا : ہوا و مجہول و ہای مخلوط ، رد و قدح کردن ۔
 سونگھنا : ہوا و معروف و نون غنہ ، بوییدن ۔
 اوگھنا : ہر وزن سونگھنا ، سرنگوں شدن ہنودگی ۔
 سوکھنا : ہوا و معروف ، خشک شدن ۔
 سیکھنا : بیای معروف ، آموختن ۔
 اینٹھنا : بفتح یا و نون و تہای ثقیل ہمہ مخلوط ، اعضا شکنی ۔
 پاچھنا : از کوکنار افیون برآوردن ۔
 سوچھنا : بچیزے بینا شد ۔
 چھیڑنا : بیای مجہول و رای ثقیل ، اولاً چرم یا پوش را بہ اوزار تراش
 خراش کردن ۔
 اوندھنا : بفتح ، واو و نون و دال مخلوط ، بررو افتادن ۔
 کونٹھنا : ہوا و معروف ، نون و تہا مخلوط ، بوقت رسیدن قوت کردن
 تا براز برآید ۔
 کانکھنا : نون مغنہ ، بہاں معنی ۔
 بیٹھنا : بفتح ، بیای و تہای ثقیل ، نشستن ۔

بابِ فعولن

بھانا :	بضم و ہای مخلوط ، راقب کردن بسوی خویش -
بلانا :	بضم ، کسے را طلب کردن -
کھانا :	بضم ، خریدن -
ستانا :	بفتح ، رنجیدہ کردن -
بتانا :	بفتح ، آموزیدن -
اگھانا :	بکاف فارسی ، قرض دادہ شدہ را ستانیدن -
کھانا :	بکسر و ہای مخلوط ، ناراض کردن بکلام غیرت انگیز -

بھڑپنا :	با کسے تند کلام کردن بزمِ جنگ -
کلپنا :	جامہ آہار کردن - و دعای بد کردن -

اچنا :	حرب از ضرب جستن و کارگر نشدن -
اگنا :	کلام مخاطب را کمر بزبان آوردن - و بزرگانِ مخاطب را بتوہین بذکر آوردن -
النا :	بفتح از جاسی برگشتن -
جھپٹنا :	بفتح ، بہای مخلوط ، بزودی دویدن -
رپٹنا :	بفتحتین ، لغزیدن پا -
ڈپٹنا :	بفتحتین ، تند راندن اسب -
چمٹنا :	بفتحتین ، چپیدن -

چہکتا : بفتقتین ، آوازِ جانورانِ خوش آواز (بہنگام) خوش ، یعنی ،
نغمہ سرائی ۔

گنوانا : بفتح ، نوں مخلوط ، رایگاں کردن ۔

کھوندلنا : ہا ، واو ، و فون ہر سہ مخلوط — (کذا) ۔

چکشنا : یکسر چیم فارسی ، بفتح کاف ، کثیف شدن لباس و موی سر
بسبب روغن ۔

سمشنا : یکسر و میم مفتوح ، فتنہ شدن چیز پریشان و جمع شدن ۔

لیشنا : یکسر لام و بفتح بای فارسی ، چسپیدن ، چون بیار (مار) بد رخت ۔

گمشنا : بفتح کاف فارسی و ہای مخلوط و سین مہلہ مکسور ، کشیدہ شدن
چیزے بزور ۔

فصل ہر دو نیم :

گر جتا : بفتقتین ، غزیدن سحاب ۔

اوپہنا : بضم ، واو مخلوط ، بای فارسی مفتوح ، بزبان ہساکا بمعنی

روییدن ۔ و بزبان اردو بمعنی نغمہ نو پیدا کردن در غنا ۔

کھرچتا : بضم ، بہای مخلوط ، بفتح را ، چیزے از چیزے برکندن بطور رندا ۔

اپہنا : بر وزن آپہنا ، آب کشیدن از چاہ یا از چقر تمام ۔

خرچتا : زہ صرف کردن ۔

امنڈنا : { ہر دو بمعنی گرد آمدن ابر ۔
گھنڈنا :

فصلِ رائے قرشت :

اترنا : بضم ، از فوق بہ تحت آمدن ، یا بغارے یا چاہے فرو رفتن ۔
 و کم شدن موی سر ۔ و لا فر شدن چہرہ و بدن ۔ و استعمال
 آن بعنوانہا ۔

ابھرنا : بضم ، بر آمدن چیزے ، چھو پستان و حباب ۔
 اچھرنا : بفتحتین ، نفخ شکم شدن ۔
 بکھرنا : بکسر و ہای مخلوط ، بمحور پریشاں شدن ۔
 دھراتا : بکسر و ہای مخلوط ، از کلام طسند آیز با کے
 غرور کردن ۔

سنورنا : بفتح و نون غنہ ، آراستہ شدن ۔
 گزرننا : بضم ، بجایے رفتن و از کارے درگذشتن ۔
 مکرنا : بضم ، مکر شدن از کردہ خویش ۔
 نکھرنا : از کثافت نفیس شدن ۔
 ٹکھڑنا : بکسر و ہر دو ہای مخلوط ، از نموباز ماندن ۔ و سرد شدن جسم از
 شدت سرما ۔

پسزنا : مسرور شدن باندک چیزے بسبب طبع ۔
 کترنا : بفتحتین ، مقراض کردن ۔
 بگھرنا : بفتحتین ، آیینہ شدن طعام بر وخن داغ کردہ ۔
 لرزنا : بفتحتین ، لغزیدن ۔

فصل سین :

اکٹا : بضم ، افزوده شدن فقید از لب چراغ ، تاروشنی زیادہ شود۔ و قدرے آمادہ شدن بر کارے ۔

بھٹنا : { ہر دو بضم ، بہای مخلوط ، کم کم سوختہ شدن ۔
 بھٹنا : بضم ، طعام شب مانده متعفن شدن بسبب گرمی ۔
 برٹنا : بفتحتین ، باریدن ابر ۔
 ترٹنا : بفتحتین ، بسیار متعفن ماندن پھیزے ۔

فصل کاف :

اکٹنا : پیچیدہ شدن دامن از خار یا پھیز دیگر ۔
 مکٹنا : بفتح ، حرکات رقاصاں کردن بسوزگی ۔
 جھکٹنا : بفتح ، بہای مخلوط ، دامن افشانیدن ۔
 چکٹنا : شگفتن غیمہ ۔ وجستن دانہ اسپند وغیرہ بر آتش ۔
 لکٹنا : بفتح ، آوخته شدن ۔
 بھکٹنا : بفتح ، بہای مخلوط ، راہ گم کردن ۔
 شھکٹنا : بکسر و ہر دو ہا مخلوط (کٹنا) ۔
 پھکٹنا : بفتح و ہای مخلوط ، غلہ را پاک کردن بغدقشاں ۔ و گذر کردن بہایے ، لیکن بشرکیب صیغہ امر ، چوں : آند پھکتے ، و جانہ پھکتے ۔
 کھکٹنا : بفتح ، بہای مخلوط ، غلیدن ذرہ بکشم ، و دغندہ چیزے بدل ۔

- پچکنا : بفتح ، سرکوبیدن پروردگار -
- چمکنا : بکسر جیم فارسی بہای مخلوط ، روشن شدن شبہ ماہ -
- سکنا : بفتح ، بے اطلاع بہایے رفتن -
- مسکنا : بفتح ، دنداس ناشکستن لبوس -
- چمکنا : بکسر اول ، پس و پیش کردن از عجاب - و دفعۃً خائف شدن -
- پہکنا : بفتحتین ، بے محل سخن گفتن از روی سہو -
- ہکنا : بفتحتین ؛ بویا شدن -
- لچکنا : بفتحتین ، لغزیدن چیز بسبب نزاکت -
- پچکنا : بکسر ، از حریف در گذر کردن - و تاہموار شدن ظہر بسبب عدم -
- اچکنا : جستن مثل نوک -
- چمکنا : بفتحتین ، نذر کردن مرغاں -
- بلکنا : بکسر ، نالاں شدن بہ بیقراری -
- چمکنا - چمکنا : دکننا : ہر سہ بفتحتین ، بمعنی رخسیدن -
- گمکنا : بفتحتین ، گزہ تحریر سراییدن -
- پچکنا : بکسر ، آمادہ شدن بکارے بانہریش -
- کھسکنا : بکسر ، بہای مخلوط ، جنبش کردن از جلیے - و گرہ بختن بے اطلاع -
- دکنا : بفتحتین ، مشتعل شدن آتش -
- گہکنا : بفتحتین ، کاف فارسی ، گفتگو کردن بخروش -

- ہمکننا : بضم ، حمل و ر شدن طفل شیرخوار باغوش کسے ۔
- تھکننا : بفتحتین ، تا و لام بہای مخلوط ، جنبیدن تودہ گل ۔
- چھکننا : بکسر ، بہای مخلوط ، بینی پاک کردن از غلم ۔ و بفتح ، آواز کردن روغن داغ در طعام ۔
- جھکننا : بفتح ، بہای مخلوط ، آواز کردن غلغلا وغیرہ ۔
- لیکننا : بفتحتین لام و بای فارسی ، زود رسیدن ۔
- بھبھکننا : بفتحتین ہر دو بای ابجد و مخلوط ہر دو بای ہوز ، بدبو رسیدن بدماغ یکایک ۔
- مہکننا : بفتحتین ، بودادن اشیا خوشبو ، پھو ریامین و لٹخہ ۔ و معطر شدن مکان و لباس از آن اشیا خوشبو ۔
- لہکننا : جنبیدن سبزہ و گلہا بتازگی ۔
- پھپھکننا : بفتح ہر دو بای فارسی و مخلوط ہر دو بای ہوز ، بالیدہ شدن اشجار و فرہ شدن انسان ۔
- تھکننا : تہا ی کسور بہای مخلوط ، جنبانیدن اعضا ۔
- سککننا : بکسر سین اول ، دم سوختن از فرط گرہیہ ۔ و دم شماری بعالم نزع ۔
- سچکننا : بضم سین ، آمادہ شدن بکارے بعد اندیشہ ۔
- چرکننا : بکسر جیم فارسی ، رسیدن طفل ۔ و بضم ، ریڑ کردن جانور قفس ۔
- گھرکننا : کسور کاف فارسی بہای مخلوط ، طفل را با آواز ہیب میخ کردن شونی ما ۔
- سرکننا : بفتحتین سین و ما ، از جای حرکت کردن ۔
- ڈھکننا : دال ثقیل و لام مفتوح بہای مخلوط ، اٹک جاری شدن قطره قطره ۔

چشم زدن - و بمقابلہ کئے در گذر کردن -	جھکنا :
بای مفتوح بہای مخلوط ، وحشت کردن جانور -	بھڑکنا :
بہاں قیاس ، حرکت کردن بے تابانہ ، بھوسل -	پھڑکنا :
بہاں قیاس ، آواز دادن اورا قی خشکیدہ -	کھڑکنا :
جیم کسور بہای مخلوط ، بازداشتن طفل را از شوخی باواز تند -	بھڑکنا :
جیم فارسی کسور بہای مخلوط ، افشاندن و پاشیدن -	چھڑکنا :
اختلاج قلب -	دھڑکنا :
ہردورای ثقیل ، اول کسور ، فقاں کردن طفل برای چیزے -	ڑڑکنا :
بغیم سین مہلہ ، از سوراخ بینی چیزے بکار بردن	سڑکنا :
چیزے کا شدن از صدمہ -	مڑکنا :
بای مضوم ، شیون کردن طفل -	ہڑکنا :
بلغ ، شورش برق و چوبہای سقف کہ از بار گراں آواز	کڑکنا :
خسکن دہر -	

فصل لام :

بغیم ، روشن شدن آتش از فروزینہ -	ہلکنا :
بغیم ، بیرون آمدن شیر و خوراہ از جوشیدن محل بر آتش -	ابلنا :
بغیم ، چیزے از دہن بیرون آوردن - و بیرون آمدن تینا از نیام -	اگلنا :
بای فارسی کسور وہای مخلوط ، پای لغزیدن از گل یا از چیزے دیگر -	پھسلنا :
بازماندن از صدمہ افتادن ، و ہم از کارہ زشت -	سنبلنا :
بغیم ، تجستن -	اچلنا :

- کچلنا : چیزے مار کوفتن ۔
 مچلنا : ضد کردن طفل چیزے ۔
 کچلنا : بکسر ہای فارسی و بفتح کات فارسی و ہای مخلوط ، گداخته شدن بشل قلمی و سرب بر آتش ۔
 نکلتنا : بکسر ، بیرون شدن ۔
 بدنا : بفتحتین ، چیزے را بچیزے بدل کردن ۔
 کسلنا : کسور ہای مخلوط ، افتادن از بلندی بسری ۔ و حرکت کردن بشل بسری بزمین ۔
 بہلنا : بفتحتین ، ساکت شدن طفل گریاں بشل دیگر ۔
 اونڈلنا : بضم ، داد و نون مخلوط ، انداخته شدن چیز بر حق بظرف دیگر ۔

فصل ہای ہوز :

- اولجنا : بضم ، داد و شمر و لام مفتوح و یم و ہا مخلوط ، معقد شدن تار ہا و مو ہا کہ شاد کشیدن دشوار شود ۔ و مباحثہ کردن با کسے از جہالت ۔ و گرفتار شدن بکار ۔
 ساجھنا : بہاں قیاس ، یعنی آراستہ شدن آن معقد ہای تار ہا ۔
 سبھنا : بفتحتین ، فہیدن ۔
 برکھنا : بفتحتین ، شتافتن اشرف و روہیہ ۔
 دکھنا : بضم ، توجھن کردن ۔
 پرونا : بکسر ہای فارسی و داد و مجهول ، داد ہا مار بشتہ کشیدن ، و یم سوزن را ۔
 سمونا : بفتح سین ، و یم ہوا و مجهول ، گرم و سرد را معتدل گردانیدن ، بفتح سین ، پرکھنا ۔
 سکرنا : بفتحتین ، پرکھنا ۔

باب مفاعیلن

- الاپنا : سراییدین اسول فتا -
- دبوچنا : چیزے رایا کے را بقوت گرفتن در آغوش یا در مشت -
- کھسوٹنا : بفتح کاف، وہای مخلوط و ہوا و بھول ، موی سر کنند بعالی
غیظ و غصہ -
- پکارنا : بغم ، آواز دادن کے را -
- بچارنا : پوچی خواندن بر ہمتاں -
- بسورنا : بکسر، نیم گریہ -
- بہارنا : جاروب کشیدن -
- بسورنا : چہرہ گریہ ناک ساختن -
- پخورنا : چہرا صاف نمودن با انگشتہا -
- اشیرنا : برہمیدن رشتہ ہا بر استاج -
- مشکارنا : بفتح میم ، میخ آہدار را کند نمودن -
- سدھارنا : بکسر، رخصت شدن -
- مڑوڑنا : بفتح، و بغم رای ثقیل ہوا و بھول ، دست کے را بقوت تاب دادن -
- یا خیزے را تاب دادہ افشردن -
- جھنجھوڑنا : بفتح ، نون و ہا مخلوط ، و بغم ہای ثانی و ہا مخلوط ہوا و
بھول ، گزیدن سگ -
- جھنجھوڑنا : بکسر ، بقیاس ماقبل ، گزیدن سگ بھکان
دادن شکار -

شہو کن : بفتح تہای ثقیل و بغیم ہا بواو مجہول ، کے را ہوشیار کردن
بغیر دست یا بغیر انگشت ۔

فصل لام :

مٹولنا : بفتح تہای ثقیل اول ، بغیم تہای ثقیل ثانی بواو مجہول ، دریا نتن
چیز بستہ را با انگشت ہا ۔

گھنگھولنا : بفتح کاف فارسی اول ، ہا و نون مخلوط ، و بغیم کاف فارسی
دویم ، ہا مخلوط بواو مجہول ؛ دست جنبیدن در آب ظرف ۔

گنجولنا : بکسر کاف فارسی و نون مخلوط و بغیم جیم بواو مجہول ، دستمال
کردن طعام تا دیگر را کراہت آید ۔

کھنگکانا : بفتح ، ہا و نون ہر دو مخلوط — (کذا) ۔

اوکیلنا : بغیم ، بواو مجہول ، و بکسر کاف بیای مجہول ؛ راست کردن
رہن تا بیدہ را ۔

آجالنا : جلا کردن زیر طلا و نقرہ ۔

ڈھکیلنا : بفتح دال ثقیل بہای مخلوط و کاف بکسر بیای مجہول ، کے را بقوت

کعب دست زدن تا او بر زمین بر رواقتد یا در چاہ یا
از بلندی ۔

نباہنا : بکسر ، کارے را با خنجام رسانیدن ۔

کراہنا : بفتح کاف ، آہستہ آہستہ ہای وای کردن از شدت درد ۔

باب مفعولن

- اترانا : بکسر ، نازیدن ، پیچزے -
 اٹھلانا : بفتح ، بتای ثقیل و ہای مخلوط ، سخن گفتن طفلانہ -
 گھبرانا : بفتح کاف فارسی و ہای مخلوط ، برخواست خاطر شدن باندازہ -
 ستولانا : بفتح سین و نون مخلوط مع واو ، تبدیل شدن رنگ بر صار بسیاری
 از تابلش آفتاب -
 بولانا : بفتح ، حرکات کردن بمنوانہ -
 ستانا : بضم و بفتح ہم ، باز ماندن از مسافت تاستی و ماندگی
 زائل شود -
 شرمانا : بمجوب شدن -
 دوہرانا : بضم دال ، و واو و ہا ہر دو مخلوط ، پیچزے را دوتا کردن - و
 سخن کمر گفتن -
 چوڑانا : بفتح و رای ثقیل ، پیچزے را پہن کردن بمرض -
 مرجھانا : بضم ، ہڑ مرده شدن ریاضین و سہزہ -
 کھٹلانا : بضم کاف و میم و ہا مخلوط ، بمعنی مرجھانا -
 چکھلانا : بفتح ، بمعنی چوڑانا -
 برانا : بفتح و رای مشدد ، شخص خوابیدہ را گویا شدن -
 تھڑانا : بفتح تا بہای مخلوط و رای مشدد ، نلزدن بسبب شدت سرما
 یا بخوف -
 پھڑانا : بفتح ہای فارسی و ہای مخلوط و رای مشدد ، جست کردن و بالای
 بلندی رسیدن -

- ثَرَاتَا : بفتح تـای ثقیل و رای مشدّد، گفتگو (ی) بیپرده کردن -
- چَرَاتَا : بفتح و رای مشدّد، درد آمدن جراحت خشک بسبب حرکات و جنبش -
- غَرَاتَا : بضم و رای مشدّد، غریب شدن -
- چَکَرَاتَا : بفتح جیم فارسی، گردگشتن دماغ بسبب دوادوش -
- تَیوَرَاتَا : بکسر، یاد واد هر دو مخلوط، بمعنی چکرات -
- فَرَمَاتَا : فرمودن -
- اَکْثَاتَا : برخاسته خاطر شدن از کار -
- مَکَرَاتَا : بفتح تـای ثقیل، سرزدن بدرد و دیوار -
- تَسْلَاتَا : بضم تـا، سخن گفتن طفل بخام زبانی -
- سَهْلَاتَا : بفتح، کف دست ساییدن با، مسکلی بهر عضو بدن تا راحت رسد -
- تَهْکَرَاتَا : بضم تـای ثقیل و های مخلوط، چیزے را پا زدن -
- دَهْمَکَاتَا : بفتح دال ثقیل بهای مخلوط، کسے را بکلام زشت تحقّیر کردن -
- دِهْکَاتَا : بفتح دال ثقیل بهای مخلوط، کسے را چیزے بطور صلاح دادن و ندادن -
- جَهْنَمَکَاتَا : بضم جیم بهای و نون مخلوط و جیم دیگر و های دیگر، هم مخلوط، منقّص شدن -
- دَحْکِیَاتَا : بفتح دال بهای مخلوط، کسے را بازو و شانزدن -
- جَهْلَاتَا : بفتح جیم و های مخلوط و لام مشدّد، بغیظ آمدن از سخن طعنه آمیز -
- چَندَرَاتَا : بفتح و نون مخلوط، با کسے تجاہل عارفانه کردن -

باب مستفعلن

لکارنا : بفتح ، کسے را آواز تند و تیز ہیبت دادن ۔

چمکارنا : بفتح ، بہای مخلوط ، نذر سرایدن جانوراں آواز بلند ۔

چمکارنا : بضم جیم فارسی ، اسپ و گاو وغیرہ را آواز بوسیدن نزد

خود طلبیدن ۔

چمچمکارنا : بضم جیم فارسی بہا ، و جیم فارسی دیگر و ہای دیگر ، ہمہ مخلوط ،

دوانیدن اسپ باواز راندن ۔

چمکارنا : بفتح جیم فارسی و ہا و نون مخلوط ، غسانیدن ادویہ ۔ و

روغن دار کردن ۔

ہلکارنا : بضم ہا ، سگ را سوی حکار اشارہ کردن بہ نہیب ۔

تختکارنا : بضم تا ، و ہا و ہای دیگر ہمہ مخلوط ، تخت تفت کردن

پیمزے منحوس ۔

دھکارنا : بفتح دال ، ہا و تا مخلوط ، راندن کسے را بہ تذلیل ۔

چنگھاڑنا : بکسر جیم فارسی و نون و کاف و ہا و رای ثقیل ،

غزیدن قیل ۔

سکارنا : بضم سین اول ، طفل را برای رسیدن ز فیصل

دادن آہستہ ۔

پہپاننا : بفتح ، شناسن ۔

گرداننا : بفتح ، دامن در کمر چمیدن ۔

باب فاعلاتن

- اثر انا : بفتح ، آواز افتادن مکان و دیوار و غیره .
- بش انا : بضم هردو های اجد با هردو رای ثقیل ، چیزی خواندن زیر لب . و بفتح ، کلام ناقبول کردن .
- گرد انا : بضم هردو کاف فارسی با هردو رای ثقیل (کذا) . و بکسر هردو کاف فارسی ، به حاجت کلام کردن .
- هش انا : با و با مفتوح ، به حواس شدن .
- لش انا : لام و کاف مفتوح ، لغزیدن هردو یا بسبب سکر و ناتوانی .
- جهر انا : بفتح هردو جیم و هردو های مخلوط ، شاخ درخت میوه دار را بنور جنبانیدن تا میوه های بیفتد .
- پهر انا : بفتح هردو های فارسی و هردو های مخلوط و هردو رای ثقیل ، سپیدن مثل بسل .
- چر انا : هردو جیم فارسی برای ثقیل کسور ، هر سخن رخس آمیز گفتن .
- کر انا : بضم هردو کاف ، و هردو را (ی) ثقیل ، نالیدن مایان و غروس . و بفتح ، شوریدن سحاب .
- بر انا : بضم ، چیزی خشک پاشیدن بر چیزی ، مثل نمک و شکر .
- بهر انا : بفتح ، بهای مخلوط ، قدری آماس شدن چهره .
- بنب انا : بفتح هردو با و ضین منقوط ، مستی کردن بکوتر آواز .

- کمر کمرانا : بفتح هر دو کاف و هر دو های مخلوط ، زنجیر
در جنبانیدن -
- دبذبانا : هر دو دال ثقیل مفتوح ، پُر آب شدن چشم -
- پهر پهرانا : بضم هر دو بای فارسی ، تمپیدن پیش در موی سر
و درلبوس -
- چرچرانا : بفتح جیم فارسی ، بمعنی اثر اژدہا -
- پشپشانا : کسبر بای فارسی و هر دو تهای ثقیل ، بکارے دست و
پا زدن و ازاں کار مایوس ماندن -
- کشکشانا : هر دو کاف کسور و هر دو تهای ثقیل ، دندان بهم بودن
تا آواز برآید -
- کشکشانا : بفتح هر دو کاف و هر دو های مخلوط و هر دو تهای ثقیل ،
چیزے را کوفتن کہ آواز برآید -
- مشمشانا : هر دو میم کسور و هر دو تهای ثقیل ، برهم زدن
چشم بفتودگی -
- بجببانا : هر دو با مکسور ، گندیده شدن چیزے کہ غیر آرد و
قابل خورش نماند -
- چمچچانا : بفتح هر دو میم و هر دو جیم فارسی ، راغب شدن بر خوب و
آنقدر کہ انزال شود -
- چمچچانا : هر دو بای فارسی مکسور و هر دو جیم فارسی ،
متعفن شدن و لزج شدن چیزے کہ از دیدن او
کراهت آید -

کچکچا پانا : بکسر ہر دو کاف و ہر دو جیم فارسی ، برقت قوت کردن
 کسے پہ پنہ و ساعد ، یا ہر دو اشتن بار بگراں بکس دم
 و دندان ۔

فصل لام بجای ہر دو الف فاعلاتن :

بلبلانا : ہر دو ہای ابجد کسور ، بے قرار شدن و اضطراب بہای دای ۔
 و بفتح ہر دو با ، غریب بن شتر ۔
 بوکلانا : بفتح و ہا مخلوط بکاف ، افضال بے تابانہ کردن ۔
 پلپلانا : بغیم ہر دو ہای فارسی ، گردانیدن چیزے در دہن ۔
 جھلجھلانا : ہر دو جیم مفتوح ، ہر دو ہای مخلوط ، سوزش کردن کہت
 دست بسبب تپنہ زدن ۔
 چلچلانا : ہر دو جیم فارسی معنوم ، عکس پیدا شدن در جراحت ۔
 سسلانا : ہر دو سین ، محسوس شدن شے رواں شل کرم بر جسم یا
 در گوش یا در جراحت ۔
 کلکلانا : ہر دو کاف کسور ، ہر وقت گفتگو (ی) جاہلانہ کردن ۔
 و بغیم ، خارشت خفیف پیدا شدن در بطن دندان ۔
 دحلدحلانا : ہر دو دال مفتوح و ہر دو ہا مخلوط ، رواں شدن آب
 از دہن زخم و سبویا از سوراخ حوض ۔
 گھگھلانا : ہر دو کاف فارسی کسور نان گرم تر کردن بسیار بر وزن گاؤ ۔
 ہلہلانا : بفتح ہر دو ہا ، میان تب مضطرب شدن ۔
 مٹمٹانا : بفتح ہر دو جیم ، تاشفت کتاں ماندن ۔

فصل دال بجای ہر دو الف فاعلاتن :

- گدگدانا : بغیم کاف فارسی ہر دو ، غلطی کروں ۔
 پھد پھدانا : ہر دو بای فارسی مفتوح و ہر دو با غلوط ، گندہ شدن
 چیزے کہ کل غیر شود و حباب پیدا کند ۔

فصل میم بجای ہر دو الف فاعلاتن :

- تستمانا : بفتح ہر دو تا ، سرخی مائل شدن رخسار از تابش آفتاب ۔
 ڈھڈھانا : بکسر ہر دو دال ثقیل ، نواختن دھ کوچک ۔

فصل نون بجای ہر دو الف فاعلاتن :

- جھنجھانا : بکسر ہر دو با و ہر دو با غلوط ، پریدن گساں بر چیزے ۔
 جھنجھانا : ہر دو جیم مفتوح و ہر دو با غلوط ، در عضو صدمہ ضرب
 ماندن چون صدای خوف از ضرب ۔
 دندنانا : عیش بہ تبختر کردن ۔
 سنسانا : تحریک بریاح شدن در دست و پا و در گوش ۔
 گنگنانا : ہر دو کاف فارسی مخموم ، سرایدن در دماغ بغیر کشادن دہن ۔
 سککنا : بغیم ہر دو کاف ، نیم گرم کردن آب ۔
 ہنہننا : غزین اسپ ۔
 منمننا : ہر دو میم مکسور ، سخن گفتن بشرکت دماغ ۔
 کھکھنا : ہر دو کاف مکسور و ہر دو با غلوط ، بد مزاج شدن
 طفل بسبب کھلمندی ۔

فصل لام بجای هردو الف فاعلاتن :

تسلانا :	بفتح لام و میم ، اضطراب کردن -
حملانا :	بکسر جیم و میم و های مخلوط ، قریب خاموش شدن چراغ و قریب غروب شدن نجوم -
کسانا :	بفتح کاف و میم ، اراده جنبش کردن -
ژگگنا :	بفتح دال ثقیل و میم ، و هردو کاف فارسی ، جنبیدن سراپا -
کنننا :	بفتح کاف و میم ، سخن پهلوداشنیدن و ازاں متوقش شدن -
جگگنا :	بفتح جیم و میم ، و هردو کاف فارسی ، رخسیدن -

این مصادر هفت بابی که بقلم آورده ام ، همه اصلی اند بوضوح واضح ؛ در این پنج حرف زائد نیست - و طریق حرف زائد آوردن در مصدر اصلی این است مثلاً مصدر لازم را متعدی ساخت بیک حرف زائد ، چون "اشعنا" که لازم است ، "اشعانا" متعدی کرد بالف زائد - و "مژنا" که لازم است ، "مژنا" متعدی کرد بواو زائد - و "گهرنا" که لازم است ، "گیرنا" متعدی کرد بیای زائد - و "سونا" که لازم است ، "سلانا" متعدی کرد بلام زائد - و واو بسبب ثقلات ساقط شود -

و اگر متعدی بدو مفعول کنند ، دو حرف زائد آرند ، چون از "اشعنا" ، "اشعوانا" ، و از "سونا" ، "سلوانا" - علی هذا القیاس - و چهار حرف مخصوص اند برای متعدی ساختن ؛ یکے الف ، دوم واو ، سوم یا ، چهارم لام ؛ چنانچه مجموعش "والی" رقم کردم -

کنایات

آنکھوں پر دیوار اٹھانا - آنکھوں میں گھر کرنا : ہردو، امر دیدہ و دانستہ را بانکار محو کردن -

آنکھیں نکالنا - آنکھیں نیلی نیلی کرنا : ہردو، بنیظ آمدن و غصہ کردن و خشگیں شدن -

آنکھ ٹیڑھی کرنا - آنکھ بدلنا : ہردو، بے مروتی کردن و برخلاف شدن -
آنکھ ڈالنا : بر حسین نگاہ بد کردن -

آنکھ چرانا : از کار پہلو تہی کردن -

آنکھ پھیر لینا - آنکھ موڑنا : بے وفائی کردن -

آنکھیں بند ہونا : بخواب مرگ رفتن -

آنکھیں پھوڑنا : دیدہ ریزی کردن بکار باریک -

آنکھ کا پانی ڈھلنا : بے حیا و بے شرم شدن -

آنکھ نیچی کرنا : شرگیں شدن و مجاب کردن -

آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا : ہوشیاری کردن -

آنکھیں سفید ہونا : کور شدن -

آنکھ دکھانا : چشم نہانی کردن -

آنکھیں آنا - آنکھیں اٹھنا : ہردو، آشوب کردن چشم -

- آنکھ لگنا : خوابیدن -
- آنکھ لگانا : عاشقی کردن باکے -
- آنکھیں مانگنا : طالب بصارت شدن -
- آنکھیں جانا : کور شدن -
- آنکھیں چڑھنا : لاحق شدن تب یعنی بخار -
- آنکھیں سینکنا : نگرستن روی محبوب -
- آنکھیں بیٹھنا : نہایت ناتواں شدن بسبب صدمات -
- آنکھیں دکھنا : رمہ آلودہ شدن چشم -
- آنکھیں گھاڑنا : نہایت غور و خوض کردن در چیزے -
- آنکھیں پتھرانا : بیخس شدن مردمک ہنگام نزاع -
- آنکھیں ڈبڈبانا : چشم پر آب شدن -
- آنکھوں میں چربی چھانا - آنکھوں پر پردے پڑنا : ہردو، مفرد شدن و اغماض کردن -
- آنکھوں پر پٹی باندھنا : ندیدن حال پریشان کسے -
- آنکھوں میں پینا : بغور نظارہ کردن -
- آنکھوں میں چھیننا : خوش آمدن شے -
- آنکھوں میں کھٹکنا : ناگوار شدن چیزے باکے -
- آنکھوں سے گرنا : تالائق شدن پیش مردماں -
- آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا : بغور و بحیرت دیدن -
- آنکھیں نہ بھگانا : نہایت خاطر داری کردن -
- آنکھوں میں سمانا : مقبول خاطر شدن -

- آنکھوں میں سرسوں پھولنا : ظاہر شدن نشأ -
 آنکھوں میں رکھنا : نہایت عزیز داشتن -
 آگ لگانا : آتش افروزی کردن در میان دو کس -
 آگ لینے آنا : آمدن و زود رفتن -
 آگ برستا : سخت گرمی شدن از حدت آفتاب -
 آگ بگولا ہونا : نہایت غشماک شدن -
 آگ میں آگ لگانا : برا فروختہ کردن کے برا فروختہ کرنا -
 آگ ہونا : نہایت درغیظ آمدن -
 زبان دینا — زبان ہارنا : ہردو، اقرار کردن -
 زبان بدلنا : از قول بازگشتن -
 زبان میں کانٹے پڑنا : نہایت تشدد شدن کہ کام و زباں
 خشک شود -
 زبان کھولنا — زبان نکالنا : ہردو، زبان درازی کردن -
 بغلیں بھانا : شادماں شدن -
 بیڑا اٹھانا : مستعد شدن بر کارے -
 پاؤں اٹھانا : شتاب رفتن -
 پھٹے میں پاؤں دینا : دخل نمودن در معاملہ کے -
 بے نقط سنانا : دشنام دادن -
 بو پھوٹنا : شائع شدن خبر اندک -
 بیڑا پار ہونا : آسان شدن کار دشوار -
 بیڑا پار لگانا : مشکل کشائی کردن -

- پاؤں پھیلاتا : ضد کردن و بر صلاح مردمان راضی نشدن :-
 پاؤں توڑ کر بیٹھنا : باز ماندن از سعی و کوشش در کار خویش :-
 پاؤں بخاری ہونا : حاملہ شدن -
 پاؤں نکالتا : ہرزہ گرد شدن -
 غولی بچا جانا : روپوش کردن بوقت جانبازی -
 گلے کا ہار ہونا : اصرار کردن -
 گلے ڈالتا - گلے منڈھنا - گلے پڑنا : ہر سہ ، لزوم شے
 بہ ناگواری :-
 گلا کاٹنا : بحبت کے جان خود را دریغ نکردن -
 کھویا جانا : بیہواس شدن -
 گور میں پاؤں لٹکانا : قریب مرگ شدن -
 گور جھانکنا : جہاں معنی -
 کچے گھڑوں پانی بھرنا : اطاعتی کردن کہ غیر ممکن باشد -
 گانڑ کے تلے گنگا بہنا : دولت مند شدن -
 کانوں پر ہاتھ رکھنا : انکار کردن -
 کان پکڑنا : حذر کردن -
 کان کھڑے کرنا : ہشیار شدن بتوقش - دسر حساب
 ماندن از خبر -
 کانوں کان خبر نہ ہونا : قطع سماعت کردن از خبر نیک و بد -
 کانوں میں تیل ڈال کر بیٹھنا : غافل شدن از خبر نیک و بد -
 کانٹوں پر کھینچنا : آنقدر مدارات کردن کہ مخالف محبوب گردد -

کانوں پر جوں نہ ریگنا : حال شنیدن و غافل ماندن (ن) و
خبر گیر نشدن -

طرح دینا : در گذر کردن -

دانتوں پسینا آنا : سر انجام کار بہ شواری کردن -

دانت رکھنا : پیچھے خواہش کردن -

دانت کھٹے (ہونا) : عاجز شدن -

دانت پینا : یکے خصومت کردن -

ہاتھ دھونا : چیزے را از دست دادن و ہر آں صبر کردن -

ہاتھ اٹھانا : از شے دست برداشتن - و ہم بمعنی زد و کوب

بر غلام و کنیز، یا بر اطفال برای تادیب -

ہاتھ پکڑنا : دستگیری کردن -

ہاتھ پر ہاتھ مارنا : شرط کردن -

ہاتھ سر پر رکھنا : سلام کردن -

ہاتھ سر پر پھیرنا : شفقت نمودن -

ہاتھ سے کھوتا : از دست دادن -

ہاتھ ملانا : زور آزمایی کردن یکے -

ہاتھ ملنا : تاسف کردن -

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی چند مطبوعات

اسانیات کیا ہے



مصنف: ڈاکٹر عیسیٰ

صفحات: 160

قیمت: -/42 روپے

اردو اسانیات



مصنف: علی رفیع چشتی

صفحات: 274

قیمت: -/98 روپے

درسِ بلاغت



صفحات: 208

قیمت: -/55 روپے

نئی اردو قواعد



مصنف: محبت چاویہ

صفحات: 324

قیمت: -/85 روپے

اسانی مطالعے



مصنف: گیان چند

صفحات: 233

قیمت: -/65 روپے

لفظ سازی



مصنف: علی رفیع چشتی

صفحات: 122

قیمت: -/59 روپے

₹ 166/-

ISBN 978-81-7587-377-3



राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, PC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025